قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر2014، قیمت -/15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

کرشن چندر: فکروفن

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

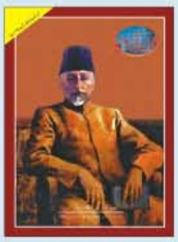

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:11، نومبر2014

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
ترقی پسند ادب ہی سے
میری شاعری کا خمیر اٹھا: احمد وصی — اشتیاق سعید 8

کور اسٹوری
کرشن چندر کا فکشن — محی الدین زور کشمیری 12
کرشن چندر کی اشتراکی بصیرت
'جب کھیت جاگے' کے تناظر میں — علی احمد فاطمی 16
کرشن چندر:
اردو کا مقبول ترین افسانہ نگار — سید احمد قادری 21
کرشن چندر: عورت اور تانیثیت — رفیعہ شبنم عابدی 24
کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم کا المیہ — اسلم جمشید پوری 28
کرشن چندر کے افسانے اور ترقی پسندی — محمد صابر حسین 31
کرشن چندر: قلم کا جادوگر — عظیم اقبال 34
انسانی قدروں کا مرقع نگار: کرشن چندر — صغیر اشرف 37
کرشن چندر کی ڈرامہ نگاری — تاثیر نواز میر 41
کرشن چندر اور ادب اطفال — ستار فیضی 43
کرشن چندر کا طنز و مزاح:
مشاہیر ادب کی نظر میں — خان حفیظ 45
ایک گدھے کی سرگذشت — کرشن چندر 48

زبان و تعلیم
ابوالکلام آزاد کے تعلیمی خیالات — احمد امتیاز 53

ادبی مباحث
گنج غرائب ایک مخطوطہ — ظہیر علی صدیقی 56

شخصیت
اردو کے خادم قرآن ابومحمد مصلح سہسرامی — پرویز اشرفی 58

شعری تجزیہ
صدیق مجیبی کی شاعری میں
استعارات کربلا — حسن مثنیٰ 60

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 64

عالمی اردو نامہ
اردو کا رسم الخط مکمل اور بہت
خوبصورت ہے: خلیل طوق آر — کامران غنی 72

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 75

ہماری بات

زمین ہو یا آسمان ہندوستان کی فتوحات کا سلسلہ لگاتار جاری ہے۔ وطنِ عزیز کی سرزمین کو آئندہ پانچ سال میں گندگی، غلاظت اور کوڑے کچرے سے نجات دلانے کا وزیر اعظم جناب نریندر مودی کا حالیہ اعلان ہو یا آسمان کی بلندیوں میں سیارۂ مریخ تک بھیجا گیا خلائی جہاز 'منگل یان' اور زمین کے مدار میں بھیجے جانے والے ہمارے مصنوعی سیارے ہوں، ہندوستان کی موجودگی، اہمیت اور عزّت ہر طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ سب بلاشبہ ہماری شاندار جمہوریت کا ہی کرشمہ ہے۔

آبادی اور عوامی قوت کے لحاظ سے ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں اور یہ وہ طرزِ حیات ہے جسے ہم نے حصول آزادی کے بعد باقاعدہ آئین مرتب کر کے اپنایا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اور جمہوری مزاج ہندوستان کے خمیر اور ضمیر میں بہت قدیم زمانے سے شامل ہے۔ 'وسودھیو کٹمب کم' کے سنسکرت سوتر کے ذریعے ہم نے ہزاروں سال پہلے پوری دنیا میں پہلی مرتبہ ایک خاندان تصور کرنے کا نظریہ سامنے رکھا تھا۔ ہم دنیا کی سب سے پرانی تہذیبوں میں گنے جاتے ہیں اور اس میں ہماری خاص انفرادیت یہ ہے کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں ہم کسی ملک یا خطے پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ باہر سے آریہ آئے تو انھیں بھی قبولیت ملی۔ مسلمان آئے تو وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پارسی آئے تو انھیں بھی یہیں پناہ حاصل ہوئی۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معیشت کا کچھ ایسا رنگ ان قوموں پر چڑھا کہ سب نے مل کر اس ملک کو سجانے سنوارنے میں حصہ لیا اور اسے آگے لے جانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ہمارے مذاہب الگ تھے، ہماری زبانیں جدا تھیں، ہماری بولیاں مختلف تھیں لیکن تمام اختلاف کے باوجود ہم ہندوستانی تھے اور ہیں اور رہیں گے۔ یہ وصف وہ ہے جو دنیا کے کسی اور جغرافیائی خطے میں نہیں پایا جاتا۔ اتنے مذاہب اتنی زبانیں ہمارے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ اس کے باوجود نہ صرف ہمارا نام ونشاں باقی ہے بلکہ بحیثیتِ قوم ہماری قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آئینی جمہوریت بن جانے کے بعد بھی کثرت میں وحدت کا ہمارا یہ وصف تمام تر سیاسی اختلافات، تنازعات اور بہت سی تلخیوں کے باوجود قائم رہا ہے۔ سیاسی قائدین اور ان کی جماعتوں کے درمیان طرح طرح کے نظریاتی اور دیگر نوعیتوں کے اختلاف پیدا ہوئے، ایک دوسرے کی نکتہ چینیوں کا سلسلہ جاری رہا، آپس کے اختلافات سڑکوں پر آئے، لیکن جمہوریت پر کسی کا یقین کمزور نہیں ہوا۔ قومی مفادات کو بالعموم تمام اختلافات سے اوپر رکھا گیا۔ اقلیتوں کی حق تلفی کے معاملے بھی سامنے آئے تو ان کی حمایت و مدافعت میں اکثریت کے لوگ سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور یوں ہمارا ملک دنیا میں سیکولر جمہوریت کا سب سے بڑا نمونہ بن کر ابھر سکا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے 67 برسوں میں ہندوستان کی تقریباً سبھی اہم سیاسی جماعتیں مرکز میں واحد جماعت یا مختلف جماعتوں کی حکومتوں کے ذریعے برسر اقتدار رہ چکی ہیں، سبھی نے ملک کی ترقی میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے اور ان سبھی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی ملی جلی کوششوں کا صلہ ہے کہ، ہر معاملے میں دوسروں کی مدد کا محتاج رہنے والا کل کا غریب اور کمزور ہندوستان آج دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی قوت بننے کے راستے پر تیزی سے گامزن ہو پایا ہے۔ اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنانے کی آواز اٹھ رہی ہے۔ ہندوستانی وزیر اعظم پچھلے دنوں اقوام متحدہ سے اپنے خطاب میں صاف لفظوں میں کہہ آئے ہیں کہ اقوام متحدہ اور اس کی سلامتی کونسل کے ڈھانچوں میں اصلاح کا وقت آچکا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہندوستان میں تبدیلیوں کی رفتار کو تیز کرنے کا بھی وقت آگیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں 20 سے 35 سال تک کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد، دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ آج کا ہندوستان بجا طور پر خود کو 'ینگ انڈیا' کہہ سکتا ہے۔ ان سبھی کروڑوں ہندوستانی نوجوانوں کو اگر ہم باصلاحیت بنا سکیں، اور جو پہلے سے ہی باصلاحیت ہیں ان سب کو موزوں و مناسب مواقع فراہم کر سکیں تو عوامی ترقی اور خوش حالی کا کوئی خواب ایسا نہیں جسے ہندوستان پورا نہ کر سکے۔ آیئے ہم سبھی نئے اور نوجوان ہندوستان کی تشکیل کے اس عمل کا حصہ بنیں اور پوری طرح اپنے ملک کی ترقی اور تعمیرِ نو کے کارواں میں شامل ہو جائیں۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

خالد ندیم

سرگودھا، پاکستان

چند دن پہلے ہی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے مطلع کر دیا تھا کہ اردو دنیا کے شمارے اکتوبر 2014 میں نابغہ روزگار علامہ شبلی نعمانی سے متعلق کئی ایک مقالات شائع ہوئے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ ناچیز کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ پرچہ موصول ہوا تو جی خوش ہوگیا۔ آپ نے واقعی علامہ شبلی سے متعلق متنوع موضوعات پر ایک گوشہ مرتب کیا ہے۔

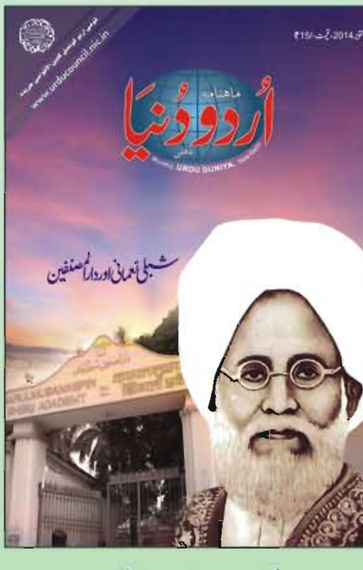

خان حسنین عاقب

علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، مومن پورہ، واشم روڈ، پوسد۔ مہاراشٹرا

اردو دنیا اکتوبر 2014 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کے صدر دروازے کی تصویر نے طبیعت خوش کر دی۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم آج بھی میر، غالب اور اقبال کے سحر سے آزاد نہیں ہو پائے ہیں۔ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کا مسئلہ شاعری نہیں، بلکہ تعلیم ہے اور تعلیم کے لیے جن اکابرین نے کوششیں کی ہیں، ملت کو ان کے نام تک کا علم نہیں ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال پر جتنا ماتم کیا جائے، کم ہے۔ سرسید اور شبلی بھی تو غنیمت ہیں کہ ان پر گاہے بگاہے سہی، بات تو ہوتی رہتی ہے لیکن ان مخلص ارواح کا کیا جنھوں نے حتی الامکان کوششیں تعلیم کی تبلیغ کے لیے صرف کیں لیکن ان کو آج ہماری نسل نہیں جانتی؟ علامہ شبلی پر تحریر کردہ تمام مضامین نہایت کارآمد اور مفید ہیں نیز شبلی کی شخصیت اور ان کی خدمات کا تشفی بخش احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ شبلی نعمانی اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ وہ شاعر تھے لیکن 'شعر العجم' کی تصنیف سے ان کی تنقیدی بصیرت اور اردو ادب پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ داں کی حیثیت سے 'الفاروق' اور 'سیرت النعمان' 'قسطنطنیہ' و دیگر کتابیں ان کے اعلیٰ ذوق کی بہترین مثالیں ہیں۔

گاندھی پر بی آر نندا کا تحریر کردہ اور علی جواد زیدی کا ترجمہ کردہ مضمون یقیناً ایک بے حد متوازن تحریر کہا جاسکتی ہے۔ یہ مضمون گاندھی کو ایک لگے بندھے سانچے میں دیکھنے والوں کے لیے چشم کشا تحریر ہوسکتی ہے۔ گاندھی جی کی خود نوشت My experiments with truth ایک بے حد سلجھی ہوئی، سیدھی اور صاف تحریر ہے جس میں گاندھی نے اکثر و بیشتر معروضیت سے کام لیا ہے۔ گاندھی ہی کے تعلق سے مشہور ہالی ووڈ شخصیت رچرڈ ایٹن برا، پر جو مضمون محمد عبدالرحمٰن ارشد نے لکھا ہے، اس کو 'گاندھی مابعدِ گاندھی' کے سلسلے کی اہم کڑی کہا جاسکتا ہے۔ باقی تمام تحریروں کی بھی اپنی افادیت اور اہمیت مسلم ہے جن میں ایبولا کا قہر، اردو دنیا کی خبریں، عالمی اردو نامہ اور کتابوں کی دنیا شامل ہیں۔ فنِ تعلیم و تعلم پر اگر خصوصی شمارے یا گوشے شائع کیے جائیں تو ایک اضافی اہمیت کا کام ہوجائے گا۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

(سابق ممبر راجیہ سبھا)

C-501، روز ووڈس اپارٹمنٹس، میوروہار فیز I، دہلی 91

عین عالم انتظار میں 'اردو دنیا' کا ستمبر 2014 کا شمارہ اپنی سابقہ خصوصیتوں، حسن طباعت و کتابت کے ساتھ محققانہ اور بصیرت افروز مضامین اور مشمولات کے ساتھ موصول ہوا۔ مشرق کے دو آفتاب عالم تاب یعنی علامہ اقبال اور ٹیگور پر گوشہ اقبال و ٹیگور کے تحت مندرجہ ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے ٹیگور اور اقبال فکری و شخصی موازنہ، ٹیگور اور اقبال کا مشترکہ المیہ، ٹیگور کی زندگی اور تخلیقی عناصر، اقبال اور ٹیگور ایک مختصر جائزہ، ٹیگور اور اقبال کا شخصی و نظریاتی مطالعہ، اقبال کا تصورِ تعلیم اور ان کے علاوہ 20 ستمبر — 1857 حالات، واقعات واثرات، اردو درس وتدریس میں لغات کا کردار، زبان کے مختلف معیار اور کتابوں کی دنیا، خمار بارہ بنکوی کے کلام پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر میں کتابت کی ایک غلطی نظر آئی۔

کرشن بھاوک

201-A، گورو نانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ

ٹیگور و علامہ اقبال جیسی مشاہیر ہستیوں کی شاندار و خوبصورت تصاویر سے مزین سرورق کے ساتھ جاذب نظر و دیدہ زیب ستمبر ماہ کا شمارہ ہمدست ہوا۔ اعزازی مدیر نصرت ظہیر صاحب نے لفظ 'مواصلت' (ص 11، دوسری سطر) کا جو تصرف کیا ہے، (میری دانست میں وہ متنازعہ ہے، کیونکہ اس کے لغتی معنی ہم بستری و ملاقات ہی بیشتر مروجہ رہے ہیں)، تاہم انھوں نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ اقبال صاحب نے ''مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' یہ متنازعہ مصرعہ کہا تھا (صفحہ 11)۔ اعجاز کے مقالے میں بھی یہی مصرعہ صفحہ 34 پر درج ہے۔ جناب پنڈت میلا رام وفا (یا شاید تلوک چند محروم) نے جواباً یہ کہا تھا ''اقبال نے جو چھوڑی راہِ وطن پرستی، یہ کہہ کر کہ ''مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا/ ہم نے بھی ایک فقرے میں بات ختم کر دی/ ''سارا جہاں تمہارا، ہندوستاں ہمارا!''۔ مفہوم یہ ہے کہ میزان کے ایک پاٹ میں سارا جہاں رکھ لینے پر بھی دوسرے میں ہندوستاں کا انتخاب اس سے کہیں بہتر ثابت ہوگا!

ایک خاص تاریخی حقیقت ہے کہ یہ از حد بلند پایہ مایہ ناز و مختلف الصفات ٹیگور ہی تھے۔ جنھوں نے گاندھی جی کو 'مہاتما' کا جو لقب عطا کیا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے شہرۂ آفاق ثابت ہوا ہے۔

اس شمارے میں اردو لسانیات سے متعلق غضنفر کا تمام طلبہ و اساتذہ کے لیے از حد کارآمد مفید و بامصرف مضمون شائع کیا گیا ہے۔ تاہم اس کے ضمن میں مجھے چند باتیں دست بستہ ہوکر کہنی ہیں۔ متعدد لغات میں لفظ 'لغت' کی جمع لغات، ہی درج کی گئی ہے، لیکن یہ لفظ جمع کی صورت میں مذکر ہوتا ہے، مونث ہرگز نہیں۔ (دیکھیں: 1 اردو ہندی ڈکشنری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ص 499) 2 محمد مصطفیٰ خاں مداح کی مرتب شدہ موقر لغت 'اردو ہندی شبد کوش'، ص 621) جبکہ بلاشک عالم فاضل و ماہرِ لسانیات جناب غضنفر صاحب نے اپنے مضمون میں اس خاکسار کی دانست میں اس لفظ کا غلط تصرف سرعت میں ہی مونث کے صیغہ میں کر دیا ہے۔ مثلاً 1. ''لغات یہ بھی بتاتی ہیں۔'' (صفحہ 59) 2. ''لغات الفاظ کا.....ہوتی ہیں۔'' (صفحہ 59) 3. ''اردو کی لغات...'' (صفحہ 61) 4. ''لغات ...... معلومات فراہم کرتی ہیں۔'' (صفحہ 61)۔

اسی طرح اسی صفحے پر 'قدم' لفظ کی جمع جب ایک بار 'اقدام' بن، گئی تو پھر دوبارہ جمع لفظ 'اقدامات'، جیسے اردو کے کئی ادبا بنا کر، تصرف کر کے سہوِ تصرف کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، ویسے ہی غضنفر صاحب نے بھی نادانستہ ہی لفظ کا غلط تصرف کر دیا ہے (صفحہ 61)۔ ٹی وی سیریلوں میں اسی طرح دوہرے جمع شدہ 'حالاتوں' اور 'جذباتوں' کی مانند غلط جمع الفاظ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ یہ غلطی تو غلط العوام کے زمرے میں آتی ہیں، لیکن غلط العام کی غلطی ماہرِ لسانیات سے ہونا اور بات ہے!

اسی مقالے میں صفحہ 59 پر ڈِبی کے اندر 'آئی جان' کی بجائے الفاظ 'کئی جان' (ص 58) درکار تھے اور 'اپنی جان' الفاظ کے بعد لفظ 'وہ' بھی جوڑا جانا درکار تھا۔ جیسا کہ ص 58 پر شعر میں درج ہے۔ صفحہ 61 پر ''سارے قواعدی' الفاظ کی جگہ 'تمام یا سب (All)' لفظ درکار ہے۔ مجموعی طور پر 'سارے' (Whole) لفظ کا تصرف کرنا ہی بموجبِ قواعد ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ''سارے جہاں سے اچھا...''، لیکن کسی چیز کی تعداد کا شمار کرنا مقصود ہونے پر تمام یا سب (All) جیسے لفظ کا استعمال کرنا بموجبِ قواعد اور فصیح ہوا کرتا ہے۔ مثلاً اقبال کے ترانے کی پیروڈی بناتے وقت اس خاکسار کو بھی اپنی نظم کا عنوان رکھنا پڑا تھا۔ ''سب ('سارے' نہیں) کالجوں سے اچھا ڈی اے وی ہمارا!''

معصوم عزیز کاظمی صاحب کا بلند پایہ مقالہ ''20 ستمبر...'' نہایت معلوماتی ہے اور موصوف کے عمیق تاریخی مطالعے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس میں صفحہ 66 پر سراج الدولہ کی قربانی 23 جون سنہ 1857 کو بتانا اشاعتی شیطان (Printer's Devil)

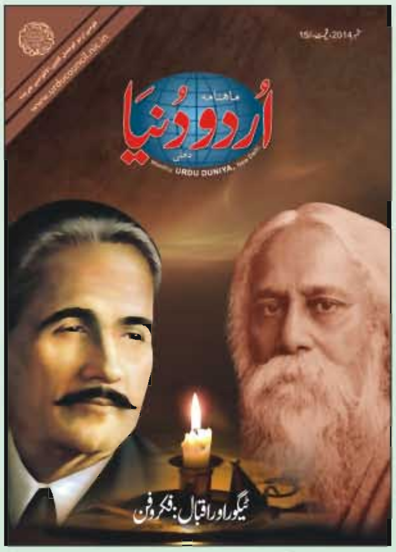

کے ہی موجب لگتا ہے، سنہ 1757 ہونا چاہیے۔ اسی صفحے پر ''انگریزوں کے بڑھتے ہوئے' الفاظ کے بعد 'قدم' کی جگہ 'قدموں' یا 'اقدام' جمع لفظ درکار تھا۔

ٹیگور کی سوانحی عمری سے وابستہ ایک خاص بات!
ہندی زبان کے میرے نامور و شہرۂ آفاق استاد آچاریہ ہزاری پرساد جی دویدی نے شانتی نکیتن میں ٹیگور کے ساتھ برسوں کام کیا تھا اور انھوں نے نصف صدی قبل یہ بے بہا معلومات ایم اے جماعت کے ہم طلبہ کو فراہم کی تھیں کہ گورودیو ٹیگور 'گیتانجلی' کی تخلیق کرتے ہوئے انؐ دنوں اکثر ایک کمرے میں بجائے خود بند رہ کر حال کی سی دیوانہ وار حالت میں اپنا سر گھماتے ہوئے اس مشہور نظم کی ایک ایک سطر کی نوک پلک درست کیا کرتے تھے۔ ان کے کھانے کی تھالی بھی دروازے میں بنائے گئے سوراخ کے ذریعے ہی روز اندر بھجوائی جاتی تھی۔ 'گیتانجلی' کے انگریزی ترجمے میں بھی جو کہا گیا ہے، اپنی شکستہ یادداشت کی بنا پر یہ خاکسار راقم الحروف چند سطور درج کر رہا ہے:

"Stop this counting & telling of beeds/ Whom dost thou worship in this dark little corner of a temple with doors all shut/Open thine eyes & see thy God is not before thee."

محمد عارف صاحب کے معیاری مقالے 'اقبال اور ٹیگور...'' میں بھی انھیں سطور کے مفہوم کو اردو زبان میں یوں کہا گیا ہے 'بند دروازے والے مندر کے کونے میں کوئی بیٹھا / تاریکی میں چھپ کر اپنے دل سے / کس کی تُو پوجا کرتا ہے پوشیدہ جذبات کے ساتھ / آنکھیں کھول، دھیان سے دیکھ تو، دیوتا گھر میں نہیں ہے (28)۔ اجتماعی طور پر یہ شمارہ جو تاثرات پیدا کرتا ہے، ان کے سبب میری طرح دیگر قارئین کے منہ سے بھی بے ساختہ 'واہ' نکل سکتی ہے۔

مصطفی ندیم خاں غوری

زرینہ منزل، ورنداون کالونی قدیم جالنہ، ضلع جالنہ (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' ستمبر 2014 ہمدست ہوا۔ صفحہ 7 پر ہے کہ لفظ 'پرواہ' کا صحیح اِملا 'پروا' ہے۔ فرہنگ آصفیہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی کے صفحہ 525 سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے مگر عام چلن تو 'پرواہ' لکھنے پڑھنے اور بولنے کا ہی ہے۔ اگر صحیح لفظ 'پروا' ہے تو لفظ 'لاپرواہی' کو 'لاپروائی' کہنا پڑے گا کیا خیال ہے؟ سرورق پر دی گئی عبارت 'ٹیگور اور اقبال: فکر وفن' کا خیال انوکھا اور اچھوتا ہے۔ اِس کے ذیل میں گوشۂ ٹیگور اور اقبال میں دیے گئے تمام تر مضامین اپنے آپ میں دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں انصاف پسندی اور توازن سے کام لیا گیا ہے۔ مہرشی ٹیگور اور ڈاکٹر سر محمد اقبال دونوں کے لیے ہر ہندوستانی کا سر عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ پروفیسر صفی الدین صدیقی، صدر شعبۂ نفسیات و فلسفہ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد (مہاراشٹر) کا خیال تھا کہ عربی و فارسی پر کامل عبور کے بنا کلامِ اقبال کی تفہیم ممکن ہی نہیں۔

مابقی تمام تر مشمولات قابلِ قدر ہیں۔ خصوصاً زبان کے مختلف معیار از نصیر احمد خاں اور دوسرے 'اردو درس و دریس میں لغت کا کردار' از غضنفر، بہت خوب ہیں۔

علی شاھد

سینئر فیکلٹی کم سپروائزر، این سی پی یو ایل کمپیوٹر سنٹر، کانکی نارہ

ماہ ستمبر 2014 کا 'اردو دنیا' معلومات کا خزینہ ہے۔ اس کے خصوصی گوشے کے تحت برصغیر کی دو قد آور اور اہم ادبی شخصیات 'ٹیگور و اقبال' کے فکر وفن کا ایک معروضی جائزہ بالکل اچھوتے انداز میں لیا گیا ہے۔ گوشہ معیاری اور دلچسپ ہے۔ شمارے کا نصف حصہ تخصیصی مطالعے پر مشتمل ہونے کے باعث اپنی انفرادیت کو بیان کرتا ہے۔ شمارے کے متعدد مشمولات میں علمیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی ہے۔ مضمون 'ٹیگور اور اقبال کا شخصی و نظریاتی مطالعہ' قابلِ ستائش ہے۔ لسانیات، زبان و تعلیم، ادبی مباحث، پہلی جنگ آزادی، صحت، کتابوں کی دنیا اور عالمی اردو خبرنامہ کے تمام صفحات کی ترتیب و پیشکش نہایت عمدہ ہے۔

شمس الھدیٰ انصاری (علیگ)

چھوٹے حاجی صاحب، نشاط نگر، واسع پور، دھنباد

'اردو دنیا' ماہ ستمبر 2014 بروقت دستیاب ہوا۔ علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور کا گوشہ شائع فرما کر آپ نے دونوں عظیم شخصیتوں کے لیے بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یوں تو 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ دستاویزی حیثیت کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ شمارہ تمام شماروں پر سبقت لے گیا۔ دونوں عظیم شخصیتیں قوم پرست تھیں۔ شمارے سے

پتہ چلا ٹیگور اور اقبال کے سیاسی نظریے کے بعض حصے ایک دوسرے سے بڑی مطابقت رکھتے ہیں۔ نیز ٹیگور اور اقبال کے فلسفے میں بعض چیزوں کی مماثلت حد درجہ تک پائی جاتی ہے۔ دونوں نے اپنے فلسفوں کی بنیاد روحانیت پر رکھی ہے۔ اس وجہ سے دونوں عظیم شخصیتوں کو عرفان حاصل ہوا۔

میرا یقین ہے کہ اگر ٹیگور نے قرآن اور قرآن کی تفسیر پڑھی ہوتی تو یقیناً اسلامی افکار پر بھی اشعار کہتے۔ دونوں ہی مرنے کے بعد روح کے باقی رہنے کو تسلیم کرتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ علامہ اقبال نے فلسفے کی بنیاد قرآن کو بنایا جبکہ ٹیگور فلسفے کی بنیاد پر روح کے باقی رہنے کو تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں عظیم شخصیتوں کی پرورش الگ الگ ماحول میں ہوئی۔ مگر حیرت انگیز طور پر دونوں کے بعض افکار اور نظریات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مضمون سجاد ظہیر خطوط کے آئینے میں، مولانا آزاد کی غبار خاطر کی یاد تازہ کر دی۔ موصوف کے خطوط ادبی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کا انٹرویو پڑھ کر ان کے نظریات و افکار سے واقفیت ملی۔ آپ ہر ماہ ایسے ہی نابغۂ روزگار شخصیت کا انٹرویو شائع کر رہے ہیں جو لائقِ تحسین ہیں۔

پرویز اشرفی

D-321، دعوت نگر، اے ایف انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

اگست کا اردو دنیا باصرہ نواز ہوا۔ انیس الحسن صدیقی نے اپنے مضمون میں بجا فرمایا ہے کہ ”جدو جہد آزادی ابھی جاری ہے“۔ محمد انوار الحق تبسم نے پیر علی شہید پر جامع اور معلوماتی مضمون پیش کیا ہے۔

عبداللہ خالد کا مضمون مجاہد آزادی نجو خاں بہت پسند آیا۔ آج رامپور میں اُس مجاہد آزادی کے نام پر ایک وسیع و عریض محلّہ ہے۔ ’گھیر نجّوں خاں‘ ظفر سعیدی کو دلی مبارک باد کہ اُنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے حامی دو انگریز شاعروں کے متعلق قارئین کو معلومات فراہم کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ہمارے علما نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ چند مورخوں کے مطابق تقریباً 50 ہزار سے زائد علمائے دین نے آزادی کی جدوجہد میں اپنی جان کی قربانی دی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ آج اُن کی قربانیوں کو بھلا دیا گیا ہے۔ محمد تنویر خان قادری کا ذاتی طور پر مشکور ہوں کہ اُنھوں نے مولانا فیض احمد بدایونی پر ایک نادر مضمون قارئین کے لیے پیش کیا۔ اردو زبان سے متعلق مضامین ’تحریک آزادی اور اردو‘ اور ’اردو زبان کے فروغ میں ریشمی رومال کی تحریک کا کردار‘ بہت پسند آئے۔

’افسانے میں کردار نگاری کی اہمیت‘ بشیر مالیر کوٹلوی کا یہ مضمون نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ فن افسانہ نگاری کے متعلق باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے آپ نے نہایت موزوں اور جامع مضمون پیش کیا ہے۔ مشاہیر ادب کے کالم میں محمد جسیم الدین کا مضمون ’نجیب محفوظ کی روشن عبارتیں‘ پسند آیا۔ حسین الحق کا مضمون ’پاکستانی افسانے پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات‘ پسند آیا۔ حسین الحق بھائی کی تصویر دیکھ کر میں پہنچان نہ سکا، کیونکہ جس حسین الحق کو میں سہسرام کی ادبی نشست میں دیکھا کرتا تھا وقت نے اُنھیں بلند مقام عطا کر دیا ہے۔ میں بچپن کے زمانے سے اُن کے افسانے، مضامین اور شاعری کا مداح رہا ہوں۔

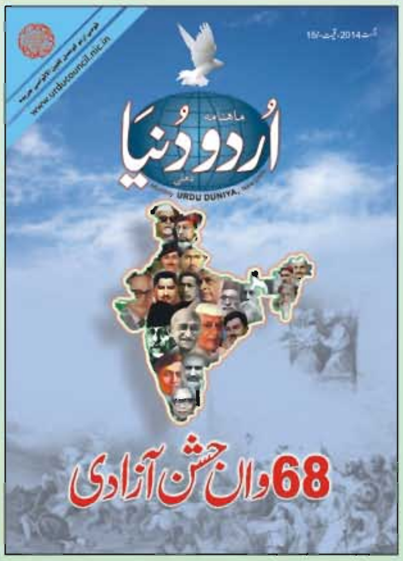

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

اگست 2014 کا اردو دنیا وقت پر ملا۔ سرورق پر 68 واں جشن آزادی کے تحت ہمارے قائدین و عمائدین کی تصویریں دیکھنے کو ملیں ان میں گاندھی جی نمایاں ہیں۔ یقیناً ان آزادی کے متوالوں نے ہمیں اور ملک و قوم کو آزادی دلائی انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ نذر کر دیا۔ کور اسٹوری کے تحت جو مضامین ہیں وہ ندرت و جدت لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ گوشہ گمنامی میں موجودہ مجاہد آزادی کو آشکار کیا گیا اور کئی نئے نام مجاہد آزادی کے سامنے آئے۔ تحریک آزادی میں اردو زبان و ادب کے رول و کردار کا ذکر کیا گیا۔ دیگر مضامین بھی معلومات سے پر ہیں۔ رسالے کے تعلق سے صرف اتنا کہوں گا کہ یہ ہر اردو کی خاندان کی عصری ضرورت ہے اور عصری شعور و آگہی کے لیے ہر اردو والے کے لیے خریدنا لازمی ہے۔ میں اردو دنیا کے مدیران کے رفقائے کار و این سی پی یو ایل کے تمام عملہ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں کہ ایسا رسالہ شب و روز محنت یعنی محنت شاقہ کے بعد ہی نکلتا ہے۔

ڈاکٹر ایاز احمد قریشی

(مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال (مدھیہ پردیش)

آپ کا ماہنامہ ’اردو دنیا‘ پابندی سے اکادمی سے مل رہا ہے۔ آپ کا جدید شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ کا ماہنامہ معیاری تاثرات اور تخلیقات سے مملو ہے۔ آج قوم اور ملت کو ایسے ہی پر خلوص اور ذی ہوش اداروں کی ضرورت ہے جو اردو زبان و ادب کے تحفظ اور بقا کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اتر پردیش

جولائی 2014 کا ’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ ملا۔ محترمہ درخشاں تاجور کا مضمون ’تحریک آزادی اور اردو‘ اور جناب ابرار احمد کا مضمون ’اردو زبان کے فروغ میں ریشمی رومال تحریک کا کردار‘ اور جناب انیس الحسن صدیقی کا مضمون ’جدو جہد آزادی ابھی جاری ہے‘ بے حد پسند آئے۔ صحت سے متعلق بھی پھلوں اور سبزیوں کے رنگ سے متعلق بھی معلومات میں اضافہ کے لیے مفید ہے۔ ■

اعتذار

’اردو دنیا‘ اکتوبر 2014 کے اداریے میں علامہ شبلی نعمانی کی علمیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شہرہ آفاق تصنیف ’شعر العجم‘ کو فارسی کی بجائے عربی زبان کے ادب سے متعلق تصنیف لکھ دیا گیا جب کہ کتاب کے نام سے ہی واضح تھا کہ اس کا تعلق ’عرب‘ سے نہیں بلکہ ’عجم‘ سے ہے۔ اداریے میں ایسی فاش غلطیاں عموماً نہیں ہوتیں۔ دوسرے اداروں کی طرح قومی اردو کونسل میں بھی اداریے کا متن اور دیگر اشاعت پذیر متون کئی مرحلوں پر اہل علم کارکنان کی نظروں سے گزرتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی کا دھیان اس سہو کی طرف نہیں گیا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ تاہم اس بات کی تسلی بھی ہے کہ ہمارے ذہین قارئین کی نظر فوراً اس سہو کی طرف گئی اور انھوں نے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے ہمیں اس طرف متوجہ گیا۔ ہم ان سبھی کے شکر گزار ہیں۔ یہ امر اس حقیقت کا شاہد ہے کہ ’اردو دنیا‘ کے دیگر مضامین کی طرح اس کے اداریے بھی کس قدر ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ نہ صرف قومی اردو کونسل کی مطبوعات میں در آنے والی غلطیوں پر اسی طرح نظر رکھیں بلکہ انھیں اور بہتر بنانے کے لیے اپنے بیش قیمت مشوروں سے بھی نوازیں۔ ادارہ

انٹرویو

اشتیاق سعید

ترقی پسند ادب ہی سے میری شاعری کا خمیر اٹھا: احمد وصی

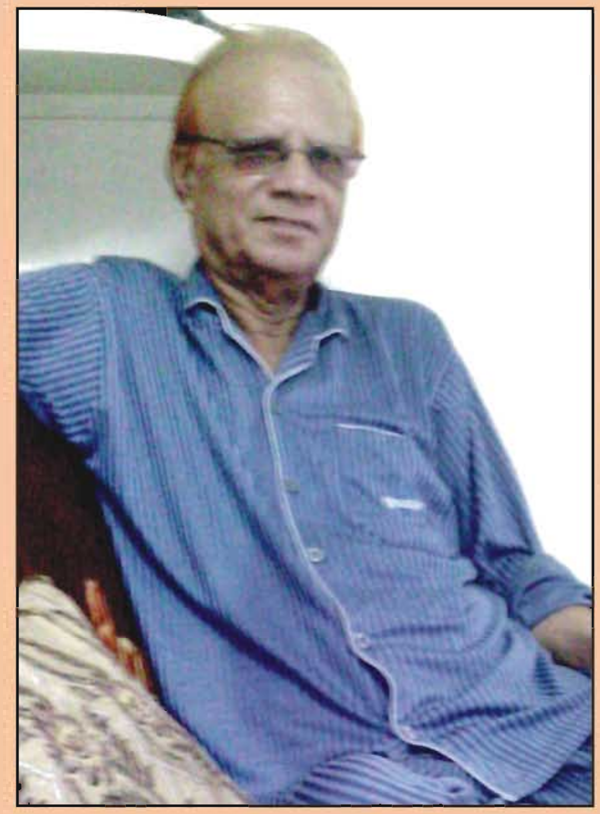

سیّد احمد وصی رضوی کی پیدائش 8اکتوبر 1943 کو سیتا پور، اُتر پر دیش میں ہوئی۔ والدِ محترم سیّد محمد اطہر المعروف زائر سیتا پوری خوش فکر شاعر تھے۔ چونکہ گھریلو ماحول کٹّر مذہبی تھا اس لیے اوائل عمری ہی سے مذہبی رنگ میں رنگ گئے۔ یہی سبب ہے جو انھوں نے شروعاتی دور میں غزل کی جانب توجہ نہ کی اور مذہبی نیز مسلکی شاعری پر طبع آزمائی کرتے رہے بالخصوص مراثی اور کربلا کے موضوع پر خوب نظمیں کہی ہیں۔ مراثی اور نظموں کے مجموعے بعنوان 'کربلا' اور 'نغماتِ معادت' منظرِ عام پر آکر داد و تحسین سے نوازے جاچُکے ہیں۔ اس لحاظ سے احمد وصی کو ادبی ماحول اور شاعرانہ مزاج ورثے میں ملا ہے۔ لڑکپن ہی میں کہانیاں اور نظمیں کہنے لگے تھے اور ایک قلمی رسالہ 'پھول' کے نام سے نکالنے لگے جس میں اپنی تخلیقات گھر کے افراد اور دوستوں کے نام سے شامِل کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی پہلی نظم بعنوان 'تلاش' 1962 میں ماہنامہ 'کھلونا' میں شائع ہوئی۔ پھر ماہنامہ 'ٹافی' ماہنامہ 'بھائی جان' کراچی، 'نقوش'، تحریک، افکار (کراچی)، شمع اور بیسویں صدی میں تخلیقات تواتر سے شائع ہونے لگی تھیں۔

احمد وصی نے ابتدائی و ثانوی تعلیم سیتاپور سے بعد ازاں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ والدِ محترم کی خواہش تھی کہ وہ وکالت کے پیشے سے منسلک ہوں، لیکن انھیں اس پیشے سے قطعی دلچسپی نہیں تھی، تاہم پانچ چھ ماہ ایک نامی وکیل کے ساتھ بطور معاون کام کیا۔ لیکن اس کام میں ان کا جی نہیں لگ سکا نتیجتاً انھوں نے بمبئی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا اور عروس البلاد کہی جانے والی بمبئی کی چکاچوندھ کا حصّہ بن گئے۔ یہ 1967 کا زمانہ تھا۔ تہی داماں، آنکھوں میں ڈھیر سارے سپنے، جھولی میں بی۔اے اور ایل ایل بی کی ڈگریوں کے علاوہ رسائل اور جرائد میں شائع شدہ تخلیقات کے تراشوں کا پلندہ، یہی کُل اثاثہ تھا۔ بھر کیف! پانچ چھ ماہ کی کڑی مشقت اور تگ و دَو کے بعد آکاش وانی کے وودھ بھارتی ریڈیو پر بطور اناؤنسر ملازمت مِل گئی۔ رفتہ رفتہ خوشحالی نے دامن پھیلایا۔ لکھنے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، کشاں کشاں مشاعروں میں بھی مدعو کیے جانے لگے۔ فلمی دنیا کی کشش نے بھی اپنا کام کیا اور آپ اس دنیا کی صحرا نوردی کرنے لگے جہاں نخلستان تو برائے نام ہے مگر تاحدِ نظر سراب ہی سراب ہے۔ پیش خدمت ہے۔ اردو دنیا کے لیے احمد وصی سے اشتیاق سعید کی گفتگو کے اقتباسات:

اشتیاق سعید: وصی صاحب، وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد، علاقے کے ہی ایک نامی وکیل کے پاس بطور معاون کام کرنے لگے تھے، پانچ چھ ماہ کام بھی کیا، لیکن اس کام کی جانب آپ کا رجحان نہیں بن پایا اور آپ نے کام چھوڑ دیا، کام چھوڑنے کے بعد آپ بمبئی کیوں آئے، لکھنؤ، کانپور یا دلّی، کیوں نہیں گئے؟

احمد وصی: اُن دنوں گھر کے حالات انتہائی ابتر تھے، لکھنؤ، کانپور، دلّی کے علاوہ اطراف کے دوسرے شہروں میں بھی ملازمت کا فقدان تھا، دلّی کا تو وثوق سے نہیں کہہ سکتا البتہ لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس کے لوگ جوق در جوق بمبئی جارہے تھے، اس کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ اُن دنوں بمبئی میں روزگار کے بے شمار مواقع تھے۔ یہاں بندرگاہ ہونے کی وجہ سے ملیں بڑی تعداد میں تھیں، بامبے الیکٹرک سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کا محکمہ تھا جسے بی ای ایس ٹی کہتے ہیں، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف، ٹیلیفون، بامبے پورٹ ٹرسٹ، بامبے میونسپل کارپوریشن کے اسکول، ریڈیو اور دوسری بہت سی پرائیویٹ کمپنیاں تھیں، جہاں تعلیم اور لیاقت کی بنیاد پر ملازمتیں مِل جایا کرتی تھیں۔ میرے بمبئی آنے کی ایک وجہ یہ تھی، دوسری وجہ فلمی دنیا کی چکاچوندھ تھی۔

اس: یعنی کہ سیتاپور ہی سے آپ کے سر میں فلمی دنیا کا سودا سمایا ہوا تھا؟

احمد وصی: فلمی دنیا میرے لیے سر کا سودا نہیں بلکہ ایک قسم کا چیلنج تھا، جسے میں نے قبول کرلیا تھا۔

اس: مطلب؟

احمد وصی: مطلب یہ کہ اپنے گریجویشن کے زمانے میں ایک دفعہ اپنے دوستوں کے ہمراہ فلم 'نیا دور' دیکھنے سینما ہال گیا۔ جب فلم کا ٹائٹل کارڈ چل رہا تھا تو ہم سب انتہائی

انہماک سے نام پڑھ رہے تھے۔ جب گیت کا کارڈ آیا تو اچانک میری زبان سے پھسل گیا کہ ’’دیکھنا ایک دن یہاں اسی طرح میرا بھی نام ہوگا۔‘‘ دوستوں نے کہا یہ ناممکن ہے، میں نے کہا، ناممکن کو ممکن کر کے دکھاؤں گا۔ ایک دوست نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ عمل رسائل اور جرائد میں چھپنے جیسا آسان نہیں ہے، فلمی دنیا میں جانے کے لیے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ بات چیلنج تک آن پہنچی اور میں نے نہ صرف اُن کا چیلنج قبول کیا بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ اس فلم کے موسیقار او۔ پی نیر ہیں، او۔ پی نیر ہی کے ساتھ میرا نام پردے پر آئے گا۔

اس: آگے کیا ہوا؟

احمد وصی: ہونا کیا تھا، ہفتہ دس دن میں بات آئی گئی ہوگئی، لیکن میرے ذہن کے نہاں خانے میں وہ چیلنج نقش ہوگیا تھا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد میں ایک طرح کے ذہنی اضطراب میں مبتلا رہنے لگا۔ کسی کام میں دِل نہ لگتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ میں کسی طرح بمبئی پہنچ جاؤں۔ پھر اللہ نے مجھے یہ موقع بھی نصیب فرمادیا۔ میں بمبئی پہنچ آیا، پانچ چھ ماہ کی تگ و دَو کے بعد وِودھ بھارتی ریڈیو پر بحیثیت اناؤنسر ملازمت مِل گئی۔ جب حالات کچھ خاطر خواہ ہوئے تو موسیقار او۔ پی نیر تک رسائی کے ذرائع تلاش کرنے لگا۔

اس: پھر یہ موقع کب میسر آیا؟

احمد وصی: چار سال کی جہدِ مسلسل کے بعد 1971 میں او۔ پی نیر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں اپنے کلام سنائے، اُنھوں نے پسند بھی کیے۔ پھر انھوں نے مجھے سچویشن سمجھائی اور ایک دُھن سنائی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ گیت کا آغاز ’آ‘ سے ہونا چاہیے تاکہ گلوکار کا مُنہ پہلے ہی لفظ پر کھلے۔ میں نے اس طرح کے 96 مکھڑے لکھے۔ وہ دیکھ کر چونک پڑے اور تمام مکھڑے پڑھنے کے بعد خوش ہوتے ہوئے بولے، سارے کے سارے مکھڑے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں چنانچہ اِن میں سے انتخاب کرنا میرے لیے دشوار ہوگیا ہے، آپ ایسا کریں فلم کے رائٹر ڈائریکٹر علی رضا صاحب کو دِکھالیں، وہ جو کہہ دیں گے اُس مکھڑے پر ہم کام کریں گے۔ علی رضا صاحب نے یوں ہی سرسری نگاہوں سے دیکھا اور ایک مکھڑے پر نشان لگا دیا وہ مکھڑا یہ تھا۔ ’’آ کہ درد جواں ہے‘‘ اور یہ گیت ہفتہ بھر ہی میں آشا بھونسلے کی آواز میں ریکارڈ کرلیا گیا۔ یہ گیت فلم ’پران جائے پروچن نہ جائے‘‘ کے لیے تھا۔ اسی دوران دوسرا گیت بھی آشا بھونسلے کی آواز میں ریکارڈ ہوا جس کا مکھڑا تھا:

’’بالم ہرجائی جا میں تو آنکھ مِلا پچھتائی‘‘ یہ گیت فلم ’’ٹیکسی ڈرائیور کے لیے تھا۔

اس: ’پران جائے پروچن نہ جائے‘ اور ’ٹیکسی ڈرائیور‘ دونوں میں سے پہلے کون سی فلم ریلیز ہوئی؟

احمد وصی: پہلے ’ٹیکسی ڈرائیور‘ ریلیز ہوئی تھی۔

اس: فلم ریلیز ہونے کے بعد آپ کے اُن دوستوں کا کیا ردّ عمل تھا جنھوں نے آپ کو چیلنج کیا تھا؟

احمد وصی: وہ سب کے سب میری اس کامیابی پر بجائے حسد کرنے یا اپنی شکست پر رنجیدہ اور ملول ہونے کے بے حد خوش تھے اور وہ سب اپنی شکست کی پاداش میں مجھے ساتھ لے کر ایک بار پھر فلم ’نیا دور‘ دیکھنے گئے اور ہم نے ماضی کی یادوں کو تازہ کیا۔

چار سال کی جہد مسلسل کے بعد 1971 میں او۔ پی نیّر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں اپنے کلام سنائے، انھوں نے پسند بھی کیے۔ پھر انھوں نے مجھے سچویشن سمجھائی اور ایک دُھن سنائی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ گیت کا آغاز آ سے ہونا چاہیے تاکہ گلوکار کا مُنہ پہلے ہی لفظ پر کھلے۔ میں نے اس طرح کے 96 مکھڑے لکھے۔ وہ دیکھ کر چونک پڑے اور تمام مکھڑے پڑھنے کے بعد خوش ہوتے ہوئے بولے، سارے کے سارے مکھڑے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں چنانچہ ان میں سے انتخاب کرنا میرے لیے دشوار ہوگیا ہے، آپ ایسا کریں فلم کے رائٹر ڈائریکٹر علی رضا صاحب کو دکھالیں، وہ جو کہہ دیں گے اُس مکھڑے پر ہم کام کریں گے۔

اس: او۔ پی۔ نیر کے علاوہ آپ نے کن موسیقاروں کے ساتھ کام کیا؟

احمد وصی: چتر گُپت، سی۔ ارجن، خیام اور بپّی لہری کے ساتھ کام کیا ہے۔ اِن میں بپّی لہری کو چھوڑ دیجیے تو بقیہ تینوں موسیقار اُردو کے شیدائی رہے ہیں۔

اس: ان موسیقار کے ساتھ آپ کی کون کون سی فلمیں ہیں؟

احمد وصی: ہیرا موتی، قانون اور مجرم، ولی اعظم، آوارہ زندگی، بابا کار اور یاترا دی جرنی، کے لیے میں نے ان موسیقاروں کے لیے نغمے لکھے۔ آپ کو یہ بتادوں کہ فلم ولی اعظم میں میرا لکھا ایک نغمہ جو دوگانا تھا، جسے طلعت محمود اور ہیم لتا نے آوازیں دی تھیں۔ یہ نغمہ طلعت محمود کی زندگی کا آخری نغمہ تھا، موسیقی چتر گپت کی تھی۔ بول تھے۔

’’میرے شریکِ سفر اب تیرا خدا حافظ‘‘

اشتیاق صاحب، اسی طرح فلم ’قانون اور مجرم‘ کا میرا ایک نغمہ ہے جو انتہائی مشہور ہے، لیکن لوگ نہیں جانتے کہ وہ میرا لکھا ہے۔ اُس کے بول ہیں:

شام رنگین ہوئی ہے تیرے آنچل کی طرح
سرمئی رنگ سجا ہے تیرے کاجل کی طرح

اس: میرے پسندیدہ نغمات میں سے ایک یہ نغمہ بھی ہے۔ فی زمانہ اس قبیل کے نغموں کا جیسے کال ہے۔ اس کا سبب کیا ہے، کیا اس طرح کے نغمے لکھنے والے شاعر نہیں ہیں یا ایسی دُھنیں بنانے والے موسیقار نہیں رہے؟

احمد وصی: شاعر بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں کوئی کمپوزر نہیں ہے۔ ماضی کے موسیقار خود کمپوزر ہوا کرتے تھے، دوسری بڑی بات یہ کہ وہ شاعری کی سمجھ رکھتے تھے، اُردو کی لفظیات کو سمجھتے تھے، اُنھیں برتنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ اب تو کچھ موسیقار ایسے بھی ہیں جو کوئی ساز بجانا بھی نہیں جانتے۔ یہی سبب ہے جو بے تکے گانے بازار میں آرہے ہیں، جن کی زندگی محض ماہ دو ماہ ہوتی ہے۔

اس: آج جس قماش کے گانے چل رہے ہیں، آپ نے بھی لکھے ہیں؟

احمد وصی: نہیں ... میرا مزاج اس قبیل کا نہیں ہے۔ میں ایسے گانے نہیں لکھتا جس میں کوئی بات نہ ہو۔

اس: پھر تو آپ ان دنوں کوئی کام نہیں کررہے ہوں گے؟

احمد وصی: ایسی بات نہیں ہے، میرے مزاج کے مطابق کام آتا ہے تو کرتا بھی ہوں۔ ضروری نہیں کہ فلموں ہی میں گانے ریکارڈ ہوں۔ میری غزلوں کے بھی کئی البم ریلیز ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ٹی وی سیریلوں کے لیے بھی نغمے لکھے ہیں۔

اس: غزلیں، کن کن گلوکاروں نے گائی ہیں؟

احمد وصی: بھوپندر، راج کمار رضوی، دلراج کور، پریتی ساگر، انیتا سنگھوی، شبیر کمار اور آشا بھونسلے نے میری کئی غزلیں گائی ہیں۔

اس: کن کن ٹی وی سیریلوں کے لیے نغمے لکھے ہیں؟

احمد وصی: میں نے محض دوردرشن اور ڈی ڈی اُردو کے سیریلوں کے لیے نغمے لکھے ہیں، یوں تو کئی ہیں لیکن ان میں قابل ذکر ’’ناخدا، بکھری آس نکھری پریت اور جب اپنے ہوئے پرائے ہیں۔

اس: حال میں کس فلم کے لیے نغمے لکھے ہیں؟

احمد وصی: ’بازارِ حُسن‘ یہ فلم منشی پریم چند کے مشہور ناول ’بازارِ حُسن‘ پر بنائی گئی ہے۔ اس کے موسیقار خیام ہیں۔

اس: واہ! پھر تو یہ ادبی فلم ہوگی، ’اُمراؤ جان‘ کی طرح؟

احمد وصی: بالکل! اُمراؤ جان کی طرح اُسی دور کی عکاسی کی گئی ہے جس دور کی کہانی ہے۔ اسی لحاظ سے مکالمے اور نغمے بھی ہیں۔ گزشتہ 18 جولائی کو یہ فلم پورے ہندوستان

میں ریلیز ہو چکی ہے۔

اس: یہ بتائیں کہ آپ فلموں، سیریلوں اور غزل سنگروں کے دام میں ہی اُلجھے رہے یا ادب کی جانب بھی کچھ توجہ رہی؟

احمد وصی: بالکل ! ادب کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، ادب ہی کی بدولت تو فلمیں، سیریلیں اور غزل سنگرز ملے، گاہے گاہے ہی سہی میرے کلام ہمیشہ ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ میرا پہلا مجموعہ 'بہتا پانی' 1993 میں منظرِ عام پر آیا، دوسرا مجموعہ 'جگنو میرے ساتھ ساتھ' 2004 میں منظر عام پر آیا پھر بچّوں کی نظموں کا مجموعہ 'تتلیاں' کے عنوان سے 2007 میں شائع ہوا، تینوں مجموعوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی، انھیں مہاراشٹر اور اُتر پردیش کی اُردو اکادمیوں سے انعامات بھی ملے۔ علاوہ ازیں 1997 میں 'بادلوں کے شہر میں' کے عنوان سے ایک مجموعہ ہندی میں بھی شائع ہوا تھا، جو غالباً اُن غزل سنگرز اور فلمی موسیقاروں کے لیے تھا جو اُردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔

اس: آپ نے ابتدائی دور میں نظمیں خوب کہیں پھر غزلیں کہنے کا رجحان کیسے بنا؟

احمد وصی: جب تک لکھنؤ میں رہا نظمیں کہتا رہا کیونکہ نظموں میں ترتیب ہوتی ہے اور یہ کام وقت طلب بھی ہے۔ بمبئی آنے کے بعد ملازمت کے ساتھ ساتھ بھاگ دوڑ کی زندگی نے غزل کہنے پر اُکسایا۔ میری پہلی غزل کا شعر ہے:

سنگ باری کی خبر سُن کے یقین آتا ہے
کوئی شیشے کا بدن شہر میں آیا ہوگا

اس: آپ نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ نثر میں بھی کچھ لکھا ہے؟

احمد وصی: جی بالکل لکھا ہے، چونکہ میں ریڈیو پر تھا اس لیے کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ریڈیو پر نشر ہوتے رہے۔

اس: آپ وِودھ بھارتی پر اناؤنسر تھے، آپ کے پیش کردہ کون کون سے پروگرام مشہور تھے؟

احمد وصی: چھایا گیت، رجنی گندھا اور گلدستہ یہ تینوں پروگرام لوگ بڑے شوق سے سُنا کرتے تھے، چھایا گیت اور رجنی گندھا فلمی گیتوں پر منحصر ہوتا تھا جبکہ گلدستہ میں صرف غزلیں پیش کی جاتی تھیں۔

اس: ادب میں کئی نظریات ہیں جیسے ترقی پسند، رجعت پسند، اسلامی ادب اور جدیدیت، آپ ان میں سے کس نظریے سے وابستہ ہیں؟

احمد وصی: سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادب ہی سے میری شاعری کا خمیر اُٹھا، ترقی پسندوں کی انسانی قدریں مجھے بے حد پسند ہیں، اسی سبب اُن کے نظریات کسی حد تک میرا ذہن قبول کرتا ہے، حالانکہ میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا رُکن رہا نہ ہی اُس کی تبلیغ کی۔

اس: قارئین کی گھٹتی تعداد کے تعلق سے آپ کیا سوچتے ہیں اور اس کاسدِ باب کیسے ممکن ہو سکے گا؟

احمد وصی: اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ ہے کہ ہم نے نئی نسل کو اُردو پڑھایا ہی نہیں، دوسری وجہ کھلونا، شمع اور بیسویں صدی جیسے عوامی رسالے نہیں رہے جنھیں گھر گھر بڑے ذوق و شوق سے لوگ پڑھا کرتے تھے، یوں بھی عوامی ادب کی بہ نسبت خالص ادب کے قارئین ہر دور میں کم ہی رہے ہیں۔

اس: وصی بھائی، آپ کا کہنا درست ہے کہ ہم نے نئی نسل کو اُردو نہیں پڑھایا، یہ بات دوسرے اردو داں حضرات بھی کہتے ہیں، لیکن اس کے پسِ پُشت کیا ذہنیت کارفرما تھی، اس پر روشنی ڈالیے؟

احمد وصی: اُس زمانے میں زیادہ تر شعرا، اُدبا، دانشور اور مفکرین تھے، سبھی کا یہ رجحان بن چکا تھا کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے، اُردو زبان بھی فارسی کی طرح محدود ہو کر رہ جائے گی، اور اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والا کسی کام کا نہ رہے گا۔ اس لیے لوگوں نے بالخصوص اشرافیہ طبقات نے کلّی طور پر اُردو سے مُنہ موڑ لیا اور اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں داخل کروانے لگے۔

اس: کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ انگریزی زبان روزی رساں ہے؟

احمد وصی: نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ایک زبان جاننے والے کو کبھی ملازمت نہیں مل سکتی۔ ملازمت کے حصول کی خاطر گاندھی جی کے سہ لسانی فارمولے پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ پہلے اپنی قومی زبان ہندی دوسرے مادری زبان، تیسرے عالمی زبان انگریزی، اِن تینوں زبانوں کو جاننے والا ہی سرکاری ملازمت کا اہل گردانا جا سکتا ہے۔ رہی بات اردو کی تو ایسے بہت سے شعبے ہیں جہاں اردو کے بغیر بات نہیں بنتی۔

اس: فی زمانہ مشاعرے ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کرتے جارہے ہیں، اردو شاعروں کے لیے یہ خوش آئند امر ہے کہ شاعری آمدنی کا ذریعہ بن رہی ہے۔

احمد وصی: یہ سچ ہے کہ مشاعرے پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہونے لگے ہیں، شاعروں کو اعزازیہ بھی دس ہزار سے پچاس ہزار تک ملنے لگا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان مشاعروں میں ایسے ایسے شعرا آگئے ہیں جنھیں ٹھیک سے شعر پڑھنا بھی نہیں آتا۔ اسی قبیل کی شاعرات بھی ہیں جو ہر مشاعرے میں محض اسٹیج کی ڈیکوریشن کے لیے ہوتی ہیں۔ ایسے ہی شعراء اور شاعرات اعزازیہ کے نام پر موٹی موٹی رقم وصول کرتے ہیں۔ جبکہ سنجیدہ اور معیاری شاعری کرنے والوں کو اوّل تو پوچھا نہیں جاتا، اگر کبھی پوچھ لیا تو اعزازیہ محض دو سے پانچ ہزار کے درمیان ہی دیتے ہیں۔ اب تو یہ بدعت اردو اکادمیوں اور سرکاری مشاعروں میں بھی در آئی ہے۔

اس: ان دنوں سیاسی پارٹیاں خوب مشاعرے منعقد کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

احمد وصی: یہ دکھانے کے لیے کہ وہ بھی اردو والے ہیں اور اردو کی ترقی اور فلاح چاہتے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر واقعی انھیں اردو سے محبت ہوتی تو ان کی محبت صرف مشاعروں تک محدود نہ رہتی، یہ اردو کے دوسرے شعبوں میں بھی کام کرتے، اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلوانے میں پیش پیش رہتے۔

اس: آپ کو اردو کی خدمت کے لیے اب تک کتنے انعامات ملے ہیں؟

احمد وصی: محض اتر پردیش اور مہاراشٹر کی اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان انعامات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مجھ پر ایک کتاب 'احمد وصی شخصیت اور شاعری' مرتب کی، منیشا پٹوردھن نے میری نظموں کو مراٹھی کے قالب میں ڈھالا اور ممبئی کے ایک اردو اسکالر محمد معراج نے ایم فل کا مقالہ 'احمد وصی: حیات وخدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' پروفیسر صاحب علی کی نگرانی میں تحریر کیا اور ممبئی یونیورسٹی سے ایم۔ فل کی سند حاصل کی۔ میں سمجھتا ہوں یہ انعامات میرے لیے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اس: وصی صاحب، آخر میں اردو دنیا کے قارئین کے لیے اپنے کچھ پسندیدہ اشعار سنائیں:

احمد وصی: جی بالکل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

ہچکیاں آ رہی ہیں رہ رہ کے
کوئی دُشمن نہ یاد کرتا ہو

ڈوبی ہیں میری انگلیاں اپنے ہی لہو میں
یہ کانچ کے ٹکڑوں کو اُٹھانے کا صِلہ ہے

اک تمدن ہم کو ان اُڑتے پرندوں نے دیا
شام ہوتے ہی گھروں کو لوٹ آنا چاہیے

میں اپنے گھر سلامت لوٹ آیا
یہی تو آج کی تازہ خبر ہے

■

Ishtiyaque Saeed, 177/1A, Ayesha Manzil, Pipe Road, Kurla, Mumbai - 400 070.
Ahmad Wasi, K-304, Hanjar Nagar, Pump house, Andheri, Mumbai - 400 093.

URDU DUNIYA Monthly, November-2014, Vol.16, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/10/2014
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

کرشن چندر کی دنیا

ہم جیسوں سے کوئی پوچھے کہ انھوں نے اردو ادب میں سب سے پہلے کسے پڑھا تو اکثر کا جواب ہوگا: کرشن چندر۔

منشی پریم چند کے بعد اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب وہی تھے۔ لکھا بھی انھوں نے بہت۔ بچّوں کے لیے تو انھوں نے ایک پوری 'الف لیلہ' لکھ ڈالی تھی۔ 'کھلونا' بک ڈپو نے بچوں کے لیے کہانیوں کی جو چھوٹی چھوٹی رنگین اور کم قیمت کتابیں چھاپی تھیں ان میں بہت سی کرشن چندر کی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک ناول بھی تھا 'الٹا درخت'! ان تحریروں کو پڑھ کر ہم بڑے ہوئے تو کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں میں ایک الگ ہی دنیا سانس لیتی ہوئی ملی۔

اس دنیا میں ظلم تھا، بے بسی تھی، غربت و افلاس کے گھناؤنے منظر تھے، ناانصافیوں سے تڑپتی ہوئی انسانی روح کی سسکیاں تھیں۔ لالچ، نفرت، مذہبی تفریق، رنگ نسل اور ذات پات کا تعصب تھا۔ مکروہ سیاست کی شرمناک کارستانیاں تھیں۔ مایوسی ناامیدی اور محرومیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے تھے۔ مگر اسی دنیا میں سرسبز وادیاں بھی تھیں، پھولوں سے لدی شاخیں بھی تھیں، چنار کے درختوں کو چھو کر گزرتے ہوئے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بھی تھے، پہاڑی ڈھلانوں کی آزاد پگڈنڈیوں سے گزرتی حسین دوشیزاؤں کی دبی دبی ہنسی بھی تھی، شکارے میں تیرتے ہوئے جواں دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ان سب کے ساتھ یہ دنیا بنی نوع انساں کی عظمتوں کے ترانوں سے گونجتی تھی، امیدوں کے گیت سناتی تھی، آشاؤں کے دیپ جلاتی تھی، لڑکھڑاتے ہوئے حوصلوں کو سہارا دیتی تھی، اور زندگی کی ناہمواریوں اور اس کے مضحک پہلوؤں پر قہقہے لگا کر صحیح سلامت گزر جانے کی طاقت بھی بخشتی تھی!

کل ملا کر یہی تھا کرشن چندر کا فکشن!

ایک خوبی ان کے فن کی اور بھی تھی۔ وہ اردو کے پہلے باقاعدہ فنطاسی نویس یا تصور نگار تھے۔ قلم پر ایسا قابو شاید ہی کسی کو رہا ہو جیسا کرشن چندر کو حاصل تھا۔ ان کی کہانیوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ گدھا کسی دبے کچلے غریب انسان کی طرح بولنے لگتا تھا۔ مسلا کچلا کرنسی نوٹ اچانک ان صارفین کے قصے سنانے لگتا تھا جن کے ہاتھوں سے وہ گزرا تھا۔ اجنتا ایلورا کے غاروں میں پتھر پر تراشے گئے شوجی مہاراج تنہائی سے اکتا کر ایک دن نئی دنیا کی نئی سڑک پر آجاتے تھے اور پچھتاتے تھے۔ ہائڈروجن بم کی تباہ کاریوں کے بعد دنیا پر جانوروں کی حکومت قائم ہو جاتی تھی جس میں ایک چڑیا گھر ہے اور چڑیا گھر کے پنجروں میں جانور نہیں بلکہ بچے کھچے سیاست داں، افسر، مصور، موسیقار، شاعر اور ادیب نمونے کے طور پر بچا کر رکھے گئے ہیں۔ دور دور سے جانور ان انسانوں کو دیکھنے آتے ہیں اور عبرت حاصل کرتے ہیں۔ ایک لڑکا زمین میں بیج بوتا ہے تو وہ اوپر آسمان کی طرف اگنے کی بجائے نیچے زمین کی گہرائی کی طرف اگنے لگتا ہے اور اس درخت کی ہر شاخ پر ایک الگ طرح کی دنیا آباد ملتی ہے۔ تصور کو تخلیق کرنے کا یہ ہنر شاید الف لیلہ نے دیا تھا جو کرشن چندر نے پوری کی پوری بچپن میں ہی پڑھ ڈالی تھی اور جو تمام عمر اُن کی سوچ کے عمل پر سایہ فگن رہی۔

انھیں پڑھ کر کسی نے کہا کرشن چندر اردو کا سب سے مکمل فکشن نگار ہے۔ کسی نے لکھا، کرشن چندر قلم کا جادوگر ہے۔ کسی نے فرمایا کرشن چندر بہت بڑا طنز نگار ہے۔ کسی نے رائے دی کہ کرشن چندر نثر نہ لکھتا تو اپنے دور کا ایک بڑا شاعر ہوتا، کیونکہ اس کی دل آویز نثر میں شاعری کا تمام تر حسن جلوہ فگن ہے۔ مگر مجموعی طور پر کرشن چندر قلم کا بندہ تھا۔ وہ زندگی بھر لکھتے رہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اردو کے پہلے ادیب تھے جو تاحیات قلم کی کمائی پر زندہ رہے۔ روزی روٹی کا کوئی اور ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ فلمی دنیا سے بھی جڑے تو کہانی کار یا اسکرپٹ رائٹر کے طور پر۔ کچھ اور نہ سوجھا تو گھر چلانے کے لیے آخری دنوں میں جاسوسی ناول بھی لکھے۔

8 مارچ 1973 کو ممبئی میں، لکھنے کی میز پر ہی کرشن چندر کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک طنزیہ مضمون لکھنے بیٹھے تھے جس کا عنوان تھا 'ادب برائے بطخ'۔ عنوان تحریر کرنے کے بعد انھوں نے صرف ایک جملہ لکھا:

"نورانی کو بچپن ہی سے پالتو جانوروں کا شوق تھا۔ کبوتر، بندر، رنگ برنگی چڑیاں۔۔۔"

مگر اس سے پہلے کہ جملہ مکمل کر پاتے، انھیں دل کا زبردست دورہ پڑا اور وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلے گئے۔

آئندہ صفحات میں ہم سب نے مل کر اسی کرشن چندر کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو خود ہی اپنے قلم کی تخلیق تھا اور جو آج ہمارے بیچ ہوتا تو سو برس کا ہوتا!

نصرت ظہیر

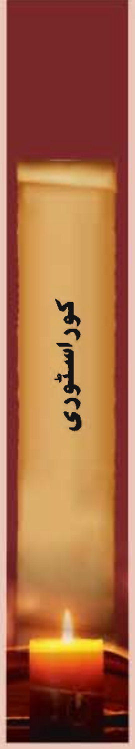

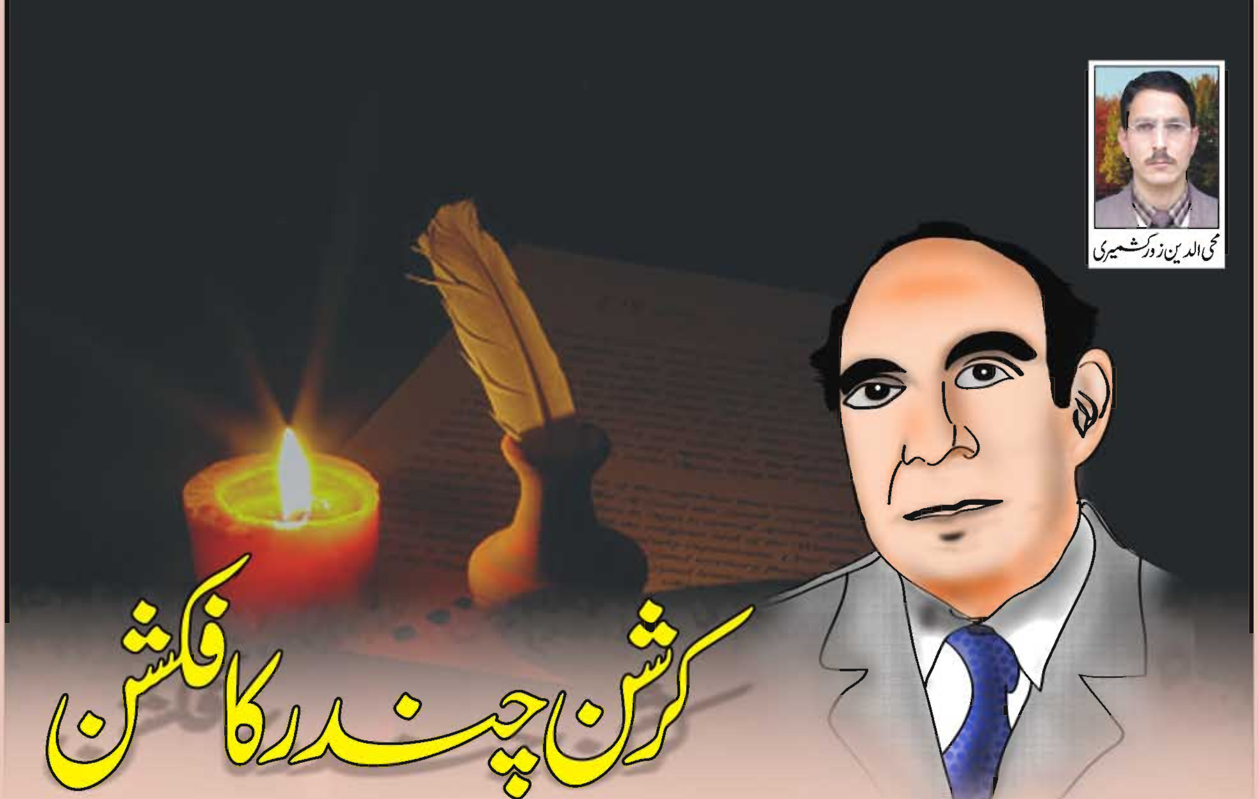

محی الدین زور کشمیری

کرشن چندر کا فکشن

پروفیسر عبدالسلام نے اردو فکشن اور ڈراما کے مشہور و معروف قلم کار کرشن چندر کے بارے میں لکھا ہے:

''کرشن چندر اُردو کے وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے زندگی کے ایک ایک تجربے اور مشاہدے اور مطالعے کی ایک ایک سطر کی قیمت وصول کرلی ہے۔ان کا حال اس چالاک بنیے کا سا ہے جو اپنے گلے سڑے دانے تک بیچ ڈالتا ہے۔ وہ قلم کے سہارے زندگی گزارنے والے چند لوگوں میں سے ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے وہ خاصے کامیاب ہیں۔ بسیار نویسی میں ان کی صف کا کوئی ادیب ان کا مدِ مقابل نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بسیار نویسی کو بھی ایک خوبی سمجھا جاتا ہے اور بسیار نویس بہت جلد شہرت کی بامِ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ بدمذاقی سب سے زیادہ ناول کی دنیا میں پائی جاتی ہے۔'' (ص 15)

پروفیسر موصوف کی یہ رائے یا ان کا پورا کتابچہ (بہ عنوان کرشن چندر اور اشتراکیت) نہ ہمیں ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے اور نہ کرشن چندر کو کم سے کم درسی ڈھنگ سے سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے اور نہ اپنے موضوع (یعنی اشتراکیت) کے ساتھ کوئی انصاف کرتا ہے، البتہ ایک قاری کو کئی مغالطوں کا شکار ضرور کرسکتا ہے۔

قلم کو روزی روٹی کا ذریعہ بنانا یا اس کے ذریعے بُلندیوں کو چھونا کوئی عیب یا چوری نہیں ہے۔ شیکسپیئر نے معمولی تھیٹر اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنے کریئر کی شروعات کرکے کامیابی کے زینے طے کرتے ہوئے آکسفورڈ میں سب سے قیمتی مکان خرید لیا تھا۔

بسیار نویسی اردو میں صرف کرشن چندر میں ہی نہیں تھی۔ یورپ میں کتنے بسیار نویس رائٹر ہیں۔ ٹالسٹائی بسیار نویس ہی تھے۔ اسی طرح اردو میں ایک طرف میر کے چھ دیوان، مصحفی کا کلیات دیکھیے اور نثر میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند اور منٹو۔ آج کل مشرف عالم ذوقی جس برق رفتاری سے لکھ رہے ہیں وہ ضرور سینچری سے آگے جائے گا۔ دوسری طرف ہیری پورٹر سیزر کی خالق اور ہمارے ابن صفی اپنی جگہ (پالولر لٹریچر) میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ بسیار نویسی والے معاملے میں آپ انتخاب سے کام لے کر اپنی من پسند چیز کو ہی پڑھیے۔ کسی کی تخلیقی بصیرت میں کیڑے نکالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اسی لیے آج کرشن چندر کو نئے سرے سے سمجھنا ازحد ضروری ہے۔

کرشن چندر 23 نومبر 1913 کو بھرت پور راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑا وہاں میڈیکل آفیسر تھے۔ اصل میں وہ وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ لاہور کے رہنے والے تھے اور ذات کے کھتری تھے۔ کرشن چندر کی والدہ کا نام پرمیشوری دیوی تھا، جو کہ ایک کٹر ہندو عورت تھیں۔ ان کے پانچ بچے (چار بیٹے اور ایک بیٹی سرلا دیوی) تھے۔ کرشن چندر ان میں سب سے بڑے تھے۔ ڈاکٹر گوری شنکر کا تبادلہ راجستھان سے جموں کے ایک علاقے ہینڈھر کو ہوا، جہاں کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ اسکول کے ہی زمانے میں کرشن چندر کا نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ ادبیات میں منشی پریم چند، سرشار اور ٹیگور کا خاص مطالعہ رہا۔ ان دنوں کرشن چندر کو اپنے والد کے ایک دوست سید مظفر حسین شاہ کے بیٹے سید حسن شاہ کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ چونکہ یہ لوگ علم و ادب کے دلدادہ تھے، ان کی برکت سے ہی کرشن چندر کو قرآن، بائبل، الف لیلہ، رگ وید، شکنتلا، ہملیٹ وغیرہ جیسی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ ہائی اسکول میں ہی کرشن چندر کو ڈراموں سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ نہ صرف ڈراما دیکھتے تھے، بلکہ خود بھی ان میں اداکار کے طور پر شریک ہوجاتے تے، اسکول کے ایک ڈرامے 'مہابھارت' میں انھوں نے 'ارجن' کا پارٹ ادا کیا، جو کافی سراہا گیا۔ 1929 میں میٹرک پاس کرنے کے بعد انھیں اعلا تعلیم کے حصول کے لیے لاہور بھیجا گیا، وہاں فارمن کرسچین کالج سے 1931 میں F.S.C پاس کیا، مگر پھر انھیں سائنسی مضامین میں دلچسپی برقرار نہ رہ سکی، تو 1933 میں سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور انگریزی مضامین میں B.A پاس کیا۔ 1935 میں ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اپنے والدین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے 1937 میں L.L.B کا امتحان بھی لاہور سے پاس کیا، مگر وکالت کے پیشے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لیے کنہیالال کپور کی صحبت میں آکر اپنا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرنے لگے۔ اس دوران ان ہی کے توسط سے انھیں ایک ناشر کے ہاں کچھ کام ملا، لیکن اس کام سے وہ جلدی ادب گئے، لاہور میں کافی کوشش کی کہ انھیں 'اقبال بحیثیت شاعر' کے موضوع پر Ph.D کے لیے رجسٹر کیا جائے، مگر ان کا یہ خواب یونیورسٹی والوں نے پورا نہ ہونے دیا تو اس طرح قلم کو ہی اپنے روزگار کا آلہ بنا کر وہ 'کل وقتی ادیب' بن گئے۔

1938 میں جب پہلی بار ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی، تو کرشن چندر نے پنجاب کی صوبائی انجمن کی نمائندگی کی۔ یہیں وہ سجاد ظہیر، پروفیسر احمد علی اور دوسرے نئے اور جوشیلے ادیبوں سے متعارف ہوگئے۔ انھیں

انجمن ترقی پسند مصنّفین پنجاب کا سکریٹری چنا گیا۔ پھر دہلی اور ممبئی کی سکونت کے دوران بھی انھیں مرکزی انجمن ترقی پسند مصنّفین کا سکریٹری بنایا گیا۔

کرشن چندر نومبر 1939 میں آل انڈیا ریڈیو (لاہور میں پروگرام اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ایک سال وہاں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہو گیا اور وہاں ڈراما پروڈیوسر مقرر کیے گئے۔ اس طرح انھوں نے خود کئی اعلا پایے کے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے جو کہ نشر ہونے کے ساتھ ساتھ بعد میں کتابی صورت میں بھی منظرِ عام پر آ گئے۔ دہلی میں انھیں پطرس بخاری کی رفاقت نصیب ہوئی۔ یہاں منٹو سے دوستی ہوئی اور ان ہی کی بدولت وہ بعد میں فلموں میں بھی چلے گئے۔

1942 میں کرشن چندر ریڈیو ملازمت چھوڑ کر ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم کمپنی شالیمار پکچرز (پونا) کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور 1944 میں بامبے ٹاکیز میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی پسند مصنّفین (مرکز) کے سکریٹری بھی رہے۔ 1945 میں اپنی فلم 'سرائے کے باہر' نیشنل تھیٹرز کے اشتراک سے مکمل کر لینے کے بعد انھوں نے اپنی فلم کمپنی ماڈرن تھیٹرز کے نام سے کھول کر فلم 'دل کی آواز' بنائی۔ اپنی کمپنی کی ناکامی کے بعد مختلف کمپنیوں کے لیے لکھنے کا کام تادم مرگ کیا۔ ممبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ 1960 سے 1962 تک وہ کچھ عرصے تک دہلی میں مقیم رہے۔ گھریلو ناسازگاری کی وجہ سے انھیں پھر واپس ممبئی جانا پڑا۔ 7 جولائی 1961 کو انھوں نے اردو کے مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیٹی سلمیٰ صدیقی سے نینی تال میں (دوسری) شادی کر لی۔ آخر کار ممبئی میں ہی 8 مارچ 1977 کو صبح کے چھ بجے چونسٹھ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

کرشن چندر بچپن میں بہت ضدی تھے، انھوں نے اپنے فارسی مضمون کے اُستاد ماسٹر بلاقی رام کے سخت برتاؤ کے خلاف 'پروفیسر بلیکی' کے عنوان سے ایک طنزیہ مضمون لکھ کر اس کا خوب مذاق اڑایا۔ البتہ اپنی ادبی زندگی کا باضابطہ طور پر آغاز کالج کے زمانے سے ہی کیا تھا۔ وہ فارمن کرسچین کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ پھر ایم اے کے دوران بھی ایک رسالے کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد پروفیسر سنت سنگھ کے ساتھ مل کر The Northern Review نکالا۔ پھر فریدہ نامی ایک انگریز خاتون کے اشتراک سے انگریزی رسالہ The Modern Girl شائع کیا۔ 'نیا ادب'، اور 'نئے زاویئے' کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ شروع شروع میں کرشن چندر نے لاہور کے انگریزی روزنامے Tribune میں بھی متعدد موضوعات پر مضامین لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ آگے انگریزی میں لکھتے رہے، تو اس زبان میں بھی وہ اتنے ہی بڑے ادیب ہوتے، جتنے کہ اردو کے ہیں۔ کرشن چندر چونکہ بسیار نویس تھے، اس لیے ان کے ادبی سرمایے میں 32 افسانوی مجموعے، 48 ناول، 18 ڈرامے، 2 رپورتاژ، 11 بچوں کی کتابیں اور 3 مرتبہ کتابیں موجود ہیں، جنھیں مختلف اداروں نے شائع کیا۔

قلم کو روزی روٹی کا ذریعہ بنانا یا اس کے ذریعے بُلندیوں کو چھونا کوئی عیب یا چوری نہیں ہے۔ شیکسپیئر نے معمولی تھیٹر اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنے کریئر کی شروعات کرکے کامیابی کے زینے طے کرتے ہوئے آکسفورڈ میں سب سے قیمتی مکان خرید لیا تھا۔ بسیارنویسی اردو میں صرف کرشن چندر میں ہی نہیں تھی۔ یورپ میں کتنے بسیارنویس رائٹر ہیں۔ ٹالسٹائی بسیار نویس ہی تھے۔ اسی طرح اردو میں ایک طرف میر کے چھ دیوان، مصحفی کا کلیات دیکھیے اور نثر میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند اور منٹو۔

بہت سارے چھوٹے بڑے انعامات اور اعزازات کے علاوہ کرشن چندر کو اکتوبر 1966 میں ہندسوویت لینڈ ایوارڈ اور جنوری 1969 میں پدم بھوشن کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ دنیا کے متعدد ممالک کے دورے بھی انھوں نے کیے جن میں 1947 میں پرتھوی راج کے ساتھ چین، 1971 میں روس، 1947 میں ہنگری وغیرہ قابلِ ذکر ہے۔ دنیا کی بیشتر بڑی زبانوں میں (خاص کر انگریزی، روسی، چینی، فارسی، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ) کرشن چندر کی تخلیقات کا ترجمہ ان کی ہی زندگی میں ہوا جس کی تصدیق خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر گیان چند جین بھی کرتے ہیں۔

کرشن چندر کی کچھ چیزیں یورپی زبانوں اور روسی زبان سے بھی ماخوذ ہیں اور انھوں نے سیموئل بیکٹ کے شاہکار ابسرڈ ڈرامے Wailing for Godot کو اردو میں منتقل کیا، جسے ان کے انتقال کے بہت سال بعد شمس الرحمن فاروقی نے اپنے رسالے 'شب خون' کے ایک خصوصی شمارے میں شائع کیا۔ یہ ڈراما اگر اردو میں الگ تعارفی نوٹ کے ساتھ کتاب صورت میں منظرِ عام پر آئے گا تو واقعی ہمارے ڈراما نگاروں کو ایک گائیڈ لائن کا کام دے سکتا ہے۔

خیر اردو فکشن میں اگر پریم چند کا مشن کسی نے بہت آگے بڑھایا ہے تو وہ کرشن چندر ہی ہیں۔ اردو کے چند معروف فکشن نگاروں میں ان کا نام سرفہرست ہے، حالانکہ ان کے ہمعصر منٹو اور بیدی بھی ادبی اور فنی لحاظ سے کچھ کم رتبہ ثابت نہ ہوئے، البتہ کرشن چندر کو اپنی خداداد فنی صلاحیتوں اور زود نویسی کی وجہ سے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انھیں یہ مقبولیت برصغیر کی دیگر زبانوں کے علاوہ کچھ غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمے کے باعث حاصل ہوئی۔

کرشن چندر کا پہلا افسانہ 'یرقان' کے عنوان سے دسمبر 1936 ادبی دنیا میں چھپا۔ اسی سال یعنی اپریل 1936 میں ہی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منشی پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے روح رواں سجاد ظہیر تھے۔ کانفرنس میں بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ نوجوان کرشن چندر بھی شریک ہوئے۔ کرشن چندر جب افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے، تو ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، ادب لطیف، نیرنگ خیال، عالمگیر وغیرہ جیسے موقر رسالوں نے انھیں چھاپنا شروع کیا۔ اسی دوران 1943 میں ان کا پہلا ناول 'شکست' جب چھپ گیا، تو انھیں زبردست تنقید و تنقیص کا سامنا کرنا پڑا، مگر کرشن چندر کا اس حوصلہ شکنی سے کچھ نہیں بگڑا۔ ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا قول:

''کرشن چندر کا ناول نگاری کے سلسلے میں کارنامہ 'شکست' ہے اور ان کی فن ناول نگاری سے شکست کھانے کی صاف مثال ہے۔'' (اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص 222)

پروفیسر گیان چند کے مطابق کرشن چندر ناول نگار سے زیادہ بہتر افسانہ نگار تھے۔ اس بات کے پیش نظر پہلے یہاں ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہی بات کی جائے گی۔

کرشن چندر کے چند اہم افسانوی مجموعوں میں طلسم خیال، نظارے، زندگی کے موڑ پر، ان داتا، ہم وحشی ہیں، اجنتا سے آگے، کرشن چندر کے افسانے، آدھے گھنٹے کا خدا خاص قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ طبیعت کے لحاظ سے وہ بے حد رومانی تھے، مگر انھیں عام طور پر ترقی پسند افسانے کے دورِ زریں کا ایک روشن ستارہ قرار دیا جا سکتا ہے، جن کی معروضیت گہرے سماجی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کو فروغ دیتے ہوئے سماج اور انسانی مسائل کو موضوعات بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ان کا کردار بظاہر بغاوت نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے قاری پر اس قدر اثر چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے اندر خود بخود سماج کے استحصالی عناصر کے خلاف بغاوت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں پلاٹ، کردار اور فضا کے امتزاج باہمی سے حقیقت کی عمدہ تصویر کشی کی اور

اس ضمن میں آدھ گھنٹے کا خدا، مہالکشمی کا پل، کالو بھنگی اور کچرا بابا جیسے ان کے افسانے پیش کیے جاسکتے ہیں ان افسانوں میں جگہ جگہ عصری حقیقت کا راز فاش ہوجاتا ہے۔

اشتراکی نقطۂ نظر، حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ کرشن چندر پر رومانیت کا بھی کافی گہرا اثر رہا، اسی لیے سنبل نگار کے مطابق رومانیت کے راستے سے گزر کر ہی کرشن چندر حقیقت نگاری کی منزل تک پہنچے تھے۔ کرشن چندر کے فکشن میں یہ بھی خاص بات ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ کشمیر کی حسین وادیوں جھیلوں اور آبشاروں کی منظر کشی کی۔ ان کے بہت سے افسانوں کا محور اور مرکز عورت ہے۔ وہ عورت کو محبوب ترین شے سمجھتے تھے۔

کرشن چندر کے افسانوں کی منفرد خصوصیات مہدی جعفر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کرشن چندر تک پہنچتے پہنچتے ہمیں اس صدی کے چار اسالیب متشکل ہوتے نظر آتے ہیں۔ داستانی اسلوب، ادب لطیف یا عشقیہ اسلوب، پریم چند کا حقیقت پسند اسلوب اور انگارے کا اسلوب۔

کرشن چندر نے داستانی اسلوب سے گریز کیا، مگر پریم چند اور انگارے کی روایات سے متاثر ہوکر اپنی فنی تخلیقات کی نمائندگی کی۔''

کرشن چندر کو اپنی ہی زندگی میں کڑی تنقید سے دو چار ہونا پڑا، جس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن ''ان کے افسانوں میں سچے کرداروں کا وجود ہی نہیں۔''

ممتاز حسین: ''کرشن چندر اپنے کردار کی منفرد شخصیت نہیں بنانا چاہتے۔''

علی سردار جعفری: ''انھوں نے حقیقت کی چھان بین میں تھوڑی بہت غفلت برتی ہے۔''

'ڈاکٹر احسن فاروقی: ''ان کے ہر افسانے کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ زندگی سے نہیں، بلکہ اخباروں سے واقعات لیتے ہیں اور اشتراکیت کی پالیسی کا رنگ دے کر انھیں ہنگامی حالات کے درمیان چھاپ دیتے ہیں۔''

ان تمام ناقدین کی آرا میں صرف جزوی صداقت موجود ہے۔ کرشن چندر کے صرف ایک افسانے کو نہیں بلکہ سارے لٹریچر کو سامنے رکھ کر بات کی جاسکتی ہے کیونکہ کرشن چندر ایک کثیر الابعاد فکشن نگار ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے پورے چاند کی رات، گرجن کی ایک شام، بالکونی، غالیچہ، دسواں پل، تائی ایسری، دو فرلانگ لمبی سڑک، دانی، ایک سرئیلی تصویر اور بند والی جیسے افسانوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔

کرشن چندر نے پچاس کے قریب ناول لکھے ہیں۔ ان میں شکست، جب کھیت جاگے، ایک گدھے کی سرگزشت، سڑک واپس جاتی ہے، میری یادوں کے چنار، گدھے کی واپسی، چاندی کے گھاؤ، ایک گدھا نیفا میں، ایک عورت ہزار دیوانے، ممبئی کی شام، فٹ پاتھ کے فرشتے خاص اہم مانے جاتے ہیں۔ کرشن چندر اپنے افسانوں کے مقابلے میں ناول نویسی کے فن میں کچھ زیادہ شہرت حاصل نہ کرسکے۔ اس بات کو گیان چند جین، ڈاکٹر اختر اور رینوی جیسے نقادوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ البتہ یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اگرچہ ان کے

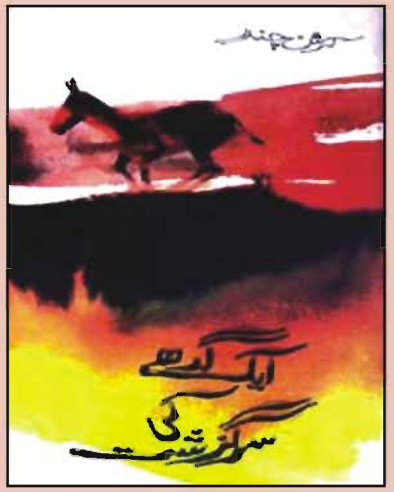

ناول فنی اعتبار سے معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے ہیں پھر بھی فکری اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند ہے، کیونکہ انھوں نے ان میں سماجی نابرابری، استحصال، غربت اور جہالت جیسے عوامی مسائل کو جگہ دے کر ایک احتجاج کی لہر کو تیز کرنے کی کوشش کی تھی، جو ترقی پسندی کے اس دور کی مانگ بھی تھی اور ایسے مسائل ابھی بھی پورے برصغیر میں موجود ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'شکست' کے عنوان سے 1943 میں شائع ہوا۔ یہ ناول عشقیہ داستان پر مبنی ہے، جس میں دو نوجوان دلوں شیام اور ونتی کی محبت سماج کی پیدا کردہ رکاوٹوں سے شکست کھا جاتا ہے اور یہاں فرسودہ روایتوں کی وجہ سے محبت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس ناول کا پس منظر کشمیر ہے۔ یہاں کرشن چندر کے اشتراکی خیالات بھی واضح ہوجاتے ہیں۔ ایک طرف عزیز احمد اس کو اردو کا بہترین ناول قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اس ناول سے ناقدین نے بہت سارے کیڑے بھی نکالے ہیں۔ کرشن چندر کا ایک اہم ناول 'جب کھیت جاگے' 1959 میں شائع ہوا۔ تلنگانہ تحریک سے متاثر ہوکر اس میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ سہیل بخاری کہتے ہیں کہ ''یہ ناول مصنف کے اشتراکی رجحانات کا مکمل طور پر آئینہ دار ہے اور مصنف کا بہترین ناول ہے۔''

اس ناول میں ہیرو (یعنی راگھوراؤ) کو اس جرم میں پھانسی دی جاتی ہے کیونکہ وہ کسانوں پر ہو رہے ظلم کے خلاف بغاوت کرتا ہے اس کی پھانسی سے تحریک اور زیادہ زور پکڑتی ہے۔ بغاوت یا احتجاج اس دور کے دیگر ناول نگاروں جیسے منشی پریم چند کے یہاں بھی موجود ہے۔

1954 میں چھپا کرشن چندر کا ناول 'طوفان کی کلیاں' ایک نیم تاریخی ناول ہے۔ اس کا موضوع بھی طبقاتی کشمکش ہے۔ 'باون پتے' کا موضوع فلم انڈسٹری کی ابتری ہے۔ یعنی وہاں جن حالات سے مصنف کو گزرنا پڑا، ان ہی کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔ کرشن چندر نے 'گدھے' کے عنوان سے اپنے ناولوں کا ایک سیریز ہی طبع کیا۔ مثلاً ایک گدھے کی سرگذشت، گدھے کی واپسی اور ایک گدھا نیفا میں۔ ان تمثیلی ناولوں کا مرکزی کردار ایک گدھا ہوتا ہے، جس کے ذریعے ہمارے سماج کے بہت سارے مسائل کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ گدھے کو یہاں ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

'غدار' تقسیم ہند کے موضوع پر کرشن چندر نے 1960 میں ایک ناول لکھا ہے اور 'ایک عورت ہزار دیوانے' بھی اسی موضوع پر ان کا ایک اور اہم ناول ہے۔ یہاں ہیروئن یعنی لالچی مردوں (یعنی سماج) سے لڑ کر بھی خود مریم رہتی ہے۔ 'فلمی قاعدہ' کرشن چندر کی ایک چھوٹی سی، مگر بڑی دلچسپ اور اردو میں منفرد تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اردو حروفِ تہجی پر مضامین کا ایک سلسلہ تیار کیا ہے جن میں وہ بڑے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں فلمی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر اپنے خیالات اور تجربات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی یہ مختلف انشائیہ نما تحریریں فلمی زبان میں ہماری زندگی کے بہت سارے مسائل کی بھی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ مثلاً:

ذ سے ذلت

''کوٹھے پر ناچنے والی ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ فلم میں ناچنے والی ذلیل نہیں سمجھی جاتی۔ کوٹھے پر گانے والی بری سمجھی جاتی ہے۔ فلم میں گانے والی عزت پاتی ہے، پرائیویٹ محفلوں میں جنس کا مظاہرہ کرنے والی اوباش مانی جاتی ہے۔ فلم میں جنس کا عریاں اظہار کرنے والی اداکارہ کہلاتی ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں میرے یا آپ ایسا انسان کئی بار ذلت محسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی مجھے گالیاں دے تو ذلت کا احساس ہوگا۔ میں کس سے وعدہ کرکے مکر جاؤں تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے!.... مگر فلمی دنیا میں یہ سب کچھ شب و روز ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی کوئی ذلیل نہیں ہوتا....

اس لیے اگر ذلت سے بچنا چاہتے ہو تو، ہر طرح کی ذلت کے لیے تیار رہو اور کھوذ سے ذلت۔'' (ص 57-56)

فلمی زندگی کا اثر کرشن چندر کے بہت سے ناولوں پر بھی رہا۔ اس کے بارے میں وہ ظ انصاری سے ایک بات چیت میں کہتے ہیں:

"میں کیا کروں؟ بیس برس سے اسی انڈسٹری میں ہوں، اِس کو اچھی طرح جانتا ہوں اور بے اختیار اس کا کھوکھلا پن قلم پر آتا ہے۔ آدمی جہاں جس ماحول میں رہے گا، اسی پر تو ہنسے گا۔"

کرشن چندر کے ناولوں میں کہیں کہیں خلاف قیاس باتیں ہمیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ شکست، زرگاؤں کی رانی، میری یادوں کے چنار، جب کھیت جاگے، ان کے شاہکار ناول تو سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان ناولوں میں بھی وہ قرین قیاس باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں اور حقیقت سے کبھی دُور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً زرگاؤں کی ایک باوقار رانی گاؤں میں آئے ہوئے نئے ڈاکٹر کو اپنے معاشقے کی کہانی سناتی ہے۔ یہاں مصنف نے رقابت کا نیا ہی تصور پیش کیا ہے، جو کہ فرائڈ سے بھی آگے ہے کہ ایک ماں اپنی ہی بچی کا قتل کرتی ہے، کیونکہ اس کی شکل وصورت رانی کی بہن ارملا (جس کا قتل بھی رانی نے کیا تھا) سے ملتی ہے جو کہ اس کے عاشق (کنور راج) کی نظروں میں بستی تھی؟

متذکرہ بالا ناولوں کے علاوہ کرشن چندر نے اور بھی ناول لکھے ہیں، جن میں کچھ سائنسی، جاسوسی اور بچوں کے ناول بھی خاص شامل ہیں۔

ناقدین کے ساتھ کرشن چندر کو اس بات کا احساس خود بھی تھا کہ وہ کوئی بڑا ناول نہیں لکھ پائے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے مرنے سے پہلے اپنے دوستوں رام لعل اور ظ انصاری کو اپنے خطوط میں کیا تھا۔ اس لیے جگدیش چندر ودھاون نے بھی کیا خوب لکھا ہے:

"صد حیف کہ کرشن چندر جنھوں نے اپنی زندگی میں کہانیوں اور ناولوں کے لکھ لکھ کر انبار لگا دیے۔ اپنے تصور کا ایک بڑا ناول نہ لکھ پائے، جو ان کے فن کی عظمت کی مناسبت سے اور ان کی دلی خواہش کے مطابق ٹالسٹائی کے ناول وار اینڈ پیس کا ہم پلہ ہوتا۔"

کرشن چندر اور کشمیر ناقدین کے لیے ایک بڑا موضوع ہے، لیکن اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر نے کشمیر کی خوبصورتی میں خیالی رومانس کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ کشمیر کی صحیح ترجمانی کی ہے نہ عکاسی۔ یہ بات ان کے افسانوں اور ناولوں دونوں کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے اور اس کی کئی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ مثلاً افسانہ 'پورے چاند کی رات' میں اپریل کے مہینے میں کشمیر میں کہاں جھیل ڈل میں سیر کرنے والے، کہاں وہی لوگ جنگل سے لکڑی چننے والے، مکئی کے بھٹے، خشک خوبانیاں اور جروالو اور بھی کیا کیا نعمتیں کرشن چندر ایک ساتھ کھاتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے:

"یہ (کرشن چندر) کشمیر سے ایک صحافی کی طرح واقف ہیں۔"

کشمیر کے دوسرے خطے جہاں ان کا بچپن گزرا 'پونچھ' کی عکاسی بھی انھوں نے اسی طرح کی ہے۔ کشمیر، پونچھ اور شملہ کو وہ ایک ساتھ ملا کر اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ اور ناول نگاری کے ساتھ ساتھ کرشن

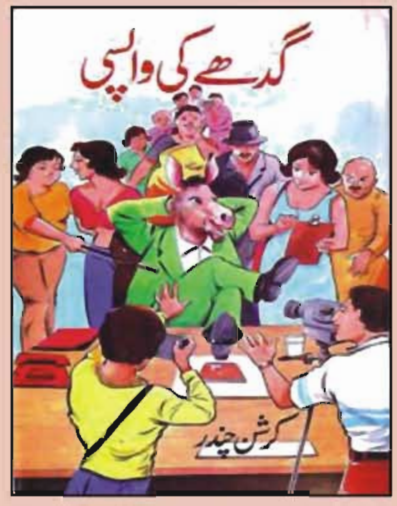

چندر کا تیسرا رخ ان کی ڈراما نگاری کا بھی ہے، جس پر ابھی تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی ڈراما نگاری کا آغاز ریڈیو کی ملازمت کے دوران کیا ہے اور کئی اعلا پایے کے ریڈیائی ڈرامے لکھے، جو کہ وقتاً فوقتاً نشر بھی ہوتے رہے۔ ان کے ڈرامے مختلف رسالوں میں بھی چھپتے رہے اور 1947 سے پہلے محمد حنیف مالک اردو اکادمی لاہور نے انھیں ایک مجموعے کی صورت میں بھی چھاپا تھا۔ اس مجموعے میں دروازہ، قاہرہ کی ایک شام، حجامت و بیکاری اور سرائے کے باہر جیسے عنوانات سے ڈرامے شامل ہیں۔

کرشن چندر کا سب سے بہترین ڈراما 'سرائے کے باہر' ہے۔ یہ ڈراما متعدد بار شائع ہوا اور اسے کافی سراہا گیا۔ انھوں نے اپنی فلم کمپنی ماڈرن تھیٹرز میں اس ڈرامے پر مبنی ایک فلم بھی بنائی جس میں ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ نے ہیرو کا رول اور بیتا دیوی نے ہیروئن کا رول ادا کیا۔ یہ ڈراما بھکاریوں کی زندگی پر مبنی ایک سماجی ڈراما ہے، جس میں ان کے ساتھ ہو رہے استحصال کا پردہ فاش کرنے کی ایک زبردست کوشش کی گئی۔ یہاں بھی بغاوت نہیں ہے، بلکہ اس کی دھیمی آنچ ہمیں محسوس ہو رہی ہے۔

کرشن چندر کا ایک اور اہم ڈراما 'دروازے کھول دو' کے عنوان سے کئی بار چھپ چکا ہے اور اسے انڈر گریجویٹ لیول پر کورس میں بھی شامل نصاب رکھا جاتا ہے۔ دراصل 1952 میں کرشن چندر ممبئی انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے گئے اور وہاں یہ ڈراما پہلی بار کھیلا گیا۔ اس کے بعد بھی اس کو کئی بار بڑے بڑے شہروں میں کھیلا گیا۔ 1963 میں مکتبہ جامعہ نے اسے پہلی بار شائع کیا۔ اس ڈرامے کا اصل موضوع ہماری قومی یکجہتی ہے اور آج بھی اس کی عصری معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈراما اردو کا ایک شاہکار ڈراما ہے۔ اس میں کرداروں کی بھرمار ہے، البتہ یہاں اسٹیج کاری کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں سماجی برتری، چھوت چھات علاقائی اور لسانی تعصب کو تیکھے طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ڈرامے کی ساری دلچسپی کرداروں کے انوکھے پن اور مکالموں کی برجستگی میں شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ یہ ڈراما ہندوستانی تہذیب کثرت میں وحدت کی بھرپور وضاحت کرتا ہے اور مصنف کے سیکولر کردار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

الغرض کرشن چندر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ ایک دلچسپ دنیا میں لے جاتے ہیں، جہاں وہ اس کو رنگ برنگے نظارے دکھاتے ہیں، اسی وجہ سے کرشن چندر کو ہمیشہ ہر طرح کے لوگ پڑھتے ہیں اور آج بھی مختلف اشاعتی ادارے ان کی تصانیف کو تواتر سے چھاپتے رہتے ہیں۔

کتابیات:

1. کرشن چندر شخصیت اور فن: جگدیش چندر ودھان ناشر مصنف دہلی 1993
2. کرشن چندر اور اشتراکیت: پروفیسر عبدالسلام، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1989
3. اردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر: ڈاکٹر حیات افتخار، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، 1988
4. اردو ناول آزادی کے بعد: ڈاکٹر اسلم آزاد، سیمانت پرکاش، نئی دہلی 1990
5. نمائندہ اردو افسانے مرتب پروفیسر قمر رئیس، اردو اکادمی دہلی، 2010
6. نیا افسانہ: وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1996
7. 1947 کے بعد اردو ڈراما: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری دار الادب فراش گنڈ کشمیر 2013
8. میری یادوں کے چنار: کرشن چندر وانی پبلشر ہاؤس، شوپیان کشمیر، 2004
9. فلمی قاعدہ: کرشن چندر، عالمی میڈیا، دہلی 2014
10. دہلیز سہ ماہی اکتوبر دسمبر 2011، شمارہ 1، ڈاکٹر مغل فاروق پرواز، (جموں) پونچھ

Dr. Mohiuddin Zore Kashmiri, Sr. Asstt Prof Urdu Govt Degree College Magan Kashmir 193401 (J&K)

علی احمد فاطمی

کرشن چندر کی اشتراکی بصیرت

'جب کھیت جاگے' کے تناظر میں

'جب کھیت جاگے' شکست کے بعد کرشن چندر کا دوسرا کامیاب ناول ہے جو پہلی بار 1952 میں شائع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی اور اس کے ترقی پسند بلکہ اشتراکی خیالات ادب کے وسیع حلقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ نوجوان کرشن چندر نہ صرف تحریک سے وابستہ تھے بلکہ اشتراکی خیالات سے آراستہ تھے۔ مزدور عام غریب مفلس انسانوں کی کہانیاں اپنے مخصوص اسلوب میں لکھ کر دادو تحسین حاصل کر رہے تھے۔ اپنی غیر معمولی پہچان بنا رہے تھے یا بنا چکے تھے۔ ایک سے ایک جیدّ ترقی پسند ادیبوں و دانشوروں کا ساتھ تھا۔ غیر معمولی ماحول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول ممتاز انقلابی شاعر مخدوم کے نام منسوب ہوتا ہے اور اس پر دیباچہ ایک دوسرے انقلابی شاعر و دانشور علی سردار جعفری لکھتے ہیں۔ یہ اتفاق محض ہم عصر ہونے کی وجہ سے کم، ہم خیال ہونے کی وجہ سے زیادہ ہے۔ جعفری دیباچے کی ابتدا میں ہی بے باکانہ طور پر لکھتے ہیں۔

میں یہاں ایک اور نکتہ اُٹھانا چاہتا ہوں وہ بھی سردار جعفری کے خیال کے ذریعے ایک طرف سردار یہ کہتے ہیں:

''وہ کشمیر کی پھولوں سے لدی اور ظلموں سے بھری ہوئی وادی میں پیدا ہوئی وہ شفق کے چشموں اور چاندنی کے آبشاروں میں نہائی۔ اس نے سیب و بادام کے شگوفوں سے اپنے حُسن کو سجایا اور برفانی طوفانی راتوں اور بہار کی خوبصورت صبحوں کی آغوش میں عشق کیا۔''

تو دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں۔

''اس کی افسانہ نگاری نے ہندوستان میں سامراجی تشدد، جاگیرداری ظلم اور غلامانہ بربریت دیکھی۔ افلاس، جہالت، وہم اور دیوانگی دیکھی۔ کہیں اُس نے آنسو بہائے اور کہیں طنز کے تیر چلائے۔''

اور آخر میں ملاجلا یہ جملہ بھی۔ ''وہ کشمیر کی پھولوں سے لدی اور ظلموں سے بھری ہوئی وادی میں پیدا ہوئی۔''

اس جملے میں پھول اور ظلم دونوں کو متوازی طور پر کھڑا کیا گیا ہے لیکن انسان کی نگاہیں پھول کو دیکھنا پسند کرتی ہیں ببول کو نہیں۔ وہ محبت کو پسند کرتی ہیں نفرت کو نہیں۔ خوبصورت جسم کو دیکھنا پسند کرتی ہیں جسم پر لگے بدصورت تار تار پیرہن کو نہیں۔ کرشن چندر کے ساتھ یہی ہوا کہ اُس کے ظاہری حُسن کو، فطرت کو، محبت کو دیکھا گیا۔ اس کی خوبصورت شاعرانہ زبان کو دیکھا گیا لیکن بقول ملک راج آنند اس کی 'شاعرانہ حقیقت نگاری' کو نہیں دیکھا گیا چہ جائکہ اشتراکی حقیقت نگاری۔ کرشن چندر سے ذرا قبل بیسویں صدی میں ہی بدلے ہوئے دور میں پریم چند نے ہندوستان کے گاؤں دیہات کی پیچیدہ و سفاک حقیقت نگاری پیش کی۔ اردو کے مہذب اور معیار پرست قارئین نے مدتوں ناک بھوں چڑھائیں۔ کرشن چندر اس احساس و عمل سے واقف تھے کہ کھردری اور سپاٹ (Crude Reality) حقیقت نگاری کو اردو کے معصوم قاری آسانی سے ہضم نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے اُس نے شاعرانہ نثر کا سہارا لیا جیسے شاعری میں فیض نے رومانیت کے سہارے حقیقت بلکہ اشترکیت کا سفر طے کیا۔ اسی طرح کرشن چندر نے بھی۔ کرشن چندر کی ایک مجبوری اور تھی وہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ خوبصورت وادیوں میں پلے بڑھے۔ فطرت سے ان کا لگاؤ فطری تھا اور شاید ضروری بھی اس حد تک کہ جب وہ اشتراکیت سے پُر ناول اور افسانے بھی لکھتے تب بھی وہ کشمیر کے حُسن و فطرت کو پیش کیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ یہ عمل شعوری تھا یا غیر شعوری اس بحث میں پڑے بغیر یہ بات غور طلب ہے کہ ان کا پہلا ناول 'شکست' ہے جس میں کشمیر کا عام انسان ہے اور اب دوسرا ناول 'جب کھیت جاگے' جس میں کسان ہے۔

راگھوراؤ۔ بائیس سال کا ایک نوجوان یا نوعمر کسان۔ جو ایک کھیت مزدور ویرپا کا بیٹا ہے۔ نوجوان۔ جوشیلا، عاشق، خواب دیکھنے والا، وقت کے دھارے کو بدلنے والا، لیکن حالات، ماحول نے اُسے سزا دے دی وہ بھی پھانسی کی۔ ناول کی کہانی زندگی کی آخری رات سے شروع ہوتی ہے اور بیتی ہوئی زندگی میں پھیل جاتی ہے اور جب رات گزر جاتی ہے تو ناول ختم ہو جاتا ہے اور راؤ پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سب تلنگانہ میں ہوتا ہے جس کا رزمیہ ہندوستان کی عوامی تحریک کا ایک تاریخی حصہّ ہے اور بقول جعفری۔ ''ہندوستان کی پرانی کسان تحریک کے ارتقا کی آخری شکل ہے۔''

راگھوراؤ کو پھانسی کیوں دی جاتی ہے۔ یہ جاننے کے لیے ناول کے قصّے سے گزرنا پڑے گا اور تلنگانہ تحریک کو سمجھنا ہوگا۔ دکن کے تلنگانہ اور تلنگانہ میں کسان مدتوں سے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے استحصال کا شکار ہوتے آئے ہیں۔ تحریکِ آزادی میں قومی رہنماؤں نے وعدہ لیا کہ ہمارا ساتھ دو تو ہم تمھارے سارے دکھ درد دور کر دیں گے۔ کسانوں اور مزدوروں نے کُھل کر ساتھ دیا۔ قربانیاں دیں لیکن ان کے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوا ان کی حالت ویسی کہ ویسی ہی رہی۔ نظام کی فوج نے مظالم ڈھائے کچھ ملکی سیاست نے بھی بال و پر کھولے اور اشتراکیوں کے خلاف جم کر پروپیگنڈا ہوا۔ بعد آزادی حکومت نے نظام شاہی سے سمجھوتہ کر لیا اور پھر وہی سرمایہ دارانہ و آمرانہ ماحول تلنگانہ میں قائم ہو گیا۔ مزید یہ کہ تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی جاتی رہیں کہ وہ دہشت گرد ہو گئے۔ ظالم اور قاتل ہو گئے لیکن کسان دبے نہیں مرے نہیں اور بقول جعفری۔ ''کسان بیج کی طرح ہے اگر تم اسے دفن کرو گے تو فصل بن کر اُگے گا اور ساری زمین پر چھا جائے گا۔'' ویرپا اگر بوڑھا ہوتا ہے تو راگھوراؤ پیدا ہوتا ہے جس کی ماں اسے تین سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر دُنیا سے چلی جاتی ہے۔ باپ ویرپا

ہی اس کی ماں بھی تھا۔ باپ بھی دوست اور ساتھی بھی، ساتھ ہی اُس کا فخر بھی۔ ان سب خوبیوں کے باوجود وہ غریب تھا اس لیے کہ اس کے پاس زمین نہ تھی بلکہ کسان مزدور تھا۔ نہ دوسری شادی کر سکا اور نہ راگھو راؤ کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکا۔ لیکن اپنی طرح محنتی اور خود دار ضرور بنا دیا۔ باپ کی محنتوں کے سایے میں راگھو پروان چڑھا۔ کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ فصل کاٹنا بھی اُسے آ گیا اور پھر ایک دن یہ بھی بقول مصنف:

''جب راگھو نے بیج بونا، فصل کاٹنا اور دونوں سے محروم رہنا سیکھ لیا اب وہ پورا کھیت مزدور بن گیا اور اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔'' (لیکن زندگی پوری نہیں ہوئی کہ اسی سنگھرش نے زندگی کے ادب و آداب سکھائے۔ تقاضے اور مطالبے بھی اور یہ جملہ بھی.........)

''باپ کا پیار اس میں ہے کہ وہ باپ کے بوجھ کو اپنے اوپر لے لے اور زمیندار کا دھندا اس میں ہے کہ وہ دونوں پر آہستہ آہستہ بوجھ بڑھاتا جائے۔''

باپ بیٹے کا تو پیار ہے لیکن زمیندار کا دھندا بس اب راگھو کو یہ دھندا۔ یہ نظام سمجھنا تھا۔ حالانکہ وہ یہ نظام اس وقت سے سمجھنا چاہتا تھا جب اس کی عمر کے بچے اسکول گئے اور وہ کھیت میں گیا۔ جب دیگر بچوں نے اُجلے کپڑے پہنے اور اس کے پاس تن ڈھکنے کے لیے میلے کپڑے بھی نہ تھے۔ لیکن اس وقت وہ بہت کم عمر تھا لیکن غربت و افلاس اور جفا کشی کم عمری میں زندگی کے بعض ایسے سبق سکھا دیتی ہے جو اکثر لوگ ایک عمر میں سیکھ پاتے ہیں لیکن جب اس کا باپ یہ کہہ دیتا کہ زمیندار کا لڑکا زمیندار ہوتا ہے اور مزدور کا لڑکا مزدور اور غریب، تو وہ کچھ دیر کے لیے چُپ ہو جاتا ہے کہ بچپن بہر حال بچپن ہوا کرتا ہے۔ ہزاروں سال سے ایسا ہوتا آ رہا ہے اور آگے بھی ہوتا رہے گا یہ بات راگھو کے معصوم ذہن کو پریشان کرتی۔ ہزاروں سال سے ایسا کیوں ہوتا آ رہا ہے؟ ایک خیال جو آگے چل کر سوال بن جاتا ہے۔ پھر جلال و جمال کی منزل بھی آتی ہے۔ لیکن گڈ مڈ۔ کشمکش اور تذبذب درمیان میں بہت سارے واقعات اور واقعات سے جُڑے کردار۔ تلنگانہ۔ سری پورم۔ تاڑ کے پیڑ۔ بھاگوتی ندی۔ میلہ۔ میلے میں طرح طرح کے کھانے اور کھیلنے کی چیزیں۔ ایک طرف دکن کا مخصوص مقامی کلچر اور اس کا تخلیقی اظہار اور دوسری طرف کپڑے کی دکان پر کھڑے راگھو کا یہ احساس.........

''کیا کپڑے اتنے خوبصورت ہو سکتے ہیں؟ اتنے دلکش اور نرم کیا یہ سچ ہے کہ کپڑے انسان کے خوابوں کی طرح اتنے نرم اور گداز اور روپہلے ہو سکتے ہیں۔؟''

کلچر کا یہ اظہار اور انسان کا ریشمی احساس اور پھر دکان دار کی دُھتکار ان سب کی ہم آہنگی سے ناول کا اُبھار اور اس کی رفتار۔ کرشن چندر کی یہی فنکاری ہے کہ وہ فطرت اور ثقافت کے درمیان سے مرکزی خیال کو گزارتے ہیں کچھ اس انداز سے کہ اس کا فطری پن فطرت سے زیادہ انسانی فطرت سے وابستہ ہو جاتا ہے اور ایک ایسا زمینی اور انسانی مسئلہ اُبھرتا ہے جہاں شمال و جنوب، مشرق و مغرب کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ انتشار و اضطراب کا باب کُھلتا ہے جب میلے میں زمیندار کے آدمی دخل دیتے ہیں۔ ظلم و جبر کے ساتھ راگھو کو ذلیل کرتے ہیں اور راگھو جب احتجاج کرتا ہے تو باپ بیٹے کے منہ پر ایک گھونسہ مارتا ہے کہ منہ سے خون نکل پڑتا ہے۔ اسے باپ کی اس حرکت پر سخت حیرت ہوتی ہے اور تکلیف بھی۔ ان جملوں میں کرب دیکھیے اور کردار کے بدلتے ہوئے تیور بھی.........

''اُس نے باپ کی طرف حیرت سے تکتے تکتے ہاتھ سے اپنا لہو پوچھ لیا اور اس کے بعد جو خون بہا اس کو چپکے سے پی گیا۔ کچھ پی گیا کچھ تھوک دیا مگر بولا نہیں۔''

کچھ پی جانا اور کچھ تھوک دینا اور پھر خاموش رہ جانا آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے جسے کرشن چندر نے بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور پھر باپ کا یہ جملہ:

''میں وٹی ہوں میرا بیٹا بھی وٹی ہے بھلا ہم وٹی لوگوں کے لیے میلہ ٹھیلہ کے معنی؟''

وٹی سے مُراد مزدور مفلس انسان جو زمیندار کا غلام ہوتا ہے اور اس کی اپنی کوئی زندگی۔ خواہش اور رائے نہیں ہوتی ہے لیکن راگھو کی تو اپنی رائے بن رہی تھی اور اس بنتے ہوئے عمل میں گھونسہ۔ خون، خون کی لالی اسے پختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

زمیندار کے لڑکے کی شادی۔ مزدوروں کا جانوروں کی طرح استعمال۔ پالکی کا بوجھ۔ راگھو کے پاس ایک بڑا آئینہ جس میں ایک مسافت کے بعد اس کا گاؤں چمک اٹھتا ہے۔ دور سے اپنے گاؤں کا یہ منظر دیکھیے:

''تاڑ کے پتوں سے چھتے ہوئے گھر، گھروں کے بیچ میں سیاہ چٹانوں کا ارتس بنڈا۔ جہاں ابھی تک لوگ جھولا جھول رہے تھے اور وتس بنڈا سے پرے ولے یا اور چنتا کے پیڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ جہاں شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں پرندے بسیرا کرتے جا رہے تھے۔ راگھو راؤ کو اپنی تمام صعوبتوں۔ تمام تکلیفوں تمام دکھوں کے باوجود اپنا گھر، اپنا گاؤں۔ اپنا تالاب، بہت بھلا معلوم ہوا.........زندگی کا وہ حُسن جو دوری پیدا کر دیتی ہے اس کے دل کے آئینہ میں چکا چوند پیدا کر گیا۔''

کرشن چندر فطرت کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن یہ اظہار فطرت بیحد معنی خیز ہوتا ہے اور ناول کے مرکزی خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔

دوسرے گاؤں کے ایک اصطبل میں پناہ لیکن اصطبل کی گندگی سے زیادہ اُسے وہ کتھا یاد رہ گئی جسے جگن ناتھ نے سُنائی گئی عوامی کلاکاروں کے ساتھ۔ یہ کتھا اس وقت سُنائی گئی

جب گھوڑوں نے خشک باجرے اور انسانوں نے اُبلے ہوئے باجرے سے پیٹ بھر لیا۔ جانور اور انسان نما جانور دونوں کو باجرہ۔ کتھا کے آغاز اور انجام نے راگھو کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ذہن میں چھوٹے موٹے بُلبلے ڈوبتے اُبھرتے رہے اور پھر ناگیشور کی دوستی نے ان بلبلوں کو نفرت میں بدل دیا اور پھر ویرپاّ کے یہ جملے:

''میرے بیٹے! میرے باپ نے مجھے یہ نفرت سونپی تھی آج تو بڑا ہو گیا ہے آج یہ نفرت میں تجھے سونپتا ہوں، لوگ اپنے بیٹے کو جائداد دیتے ہیں گھر دیتے ہیں زمین دیتے ہیں میرے پاس کوئی زمین نہیں ہے صرف یہ نفرت ہے جسے میں تجھے سونپتا ہوں۔ میں بوجھ اٹھاتے اُٹھاتے بڈھا ہو چکا میرے پاس طاقت نہیں ہے صرف نفرت ہے جسے میں تیرے حوالے کرتا ہوں۔ اگر تو کوئی راستہ ڈھونڈ سکتا ہے تو ڈھونڈ لے۔''

اور اُس دن سے یہ مقدس نفرت راگھو نے ایک پاکیزہ وراثت کے طور پر سنبھال لی۔ مشاہدات و تجربات اُس میں اضافہ کرتے گئے اور یہ سوچنے پر مجبور کرتے گئے کہ سماج میں ریڈی کم ہیں اور وٹی زیادہ تو پھر یہ کم لوگ زیادہ لوگوں پر حکومت کیوں کرتے ہیں۔ ظلم کیوں کرتے ہیں۔ مگر اچھی بات یہ تھی کہ جسے کرشن چندر نے اثبات اور نشاط کے طور پر پیش کیا کہ مخالفت کا یہ جذبہ زمیندار سے نفرت کم زندگی سے محبت میں زیادہ تھا۔ زندگی سے محبت اور اس محبت کے چراغ روشن کیے چُندری نے۔ ایک عورت نے جو محبت ہی محبت ہوا کرتی ہے۔ اُس کا حُسن۔ سوز و گداز جو پتھر کو بھی پگھلا دیتا ہے چہ جائیکہ نفرت۔

چُندری کے کردار سے ناول تھوڑی دیر کے لیے محبت کی وادی میں پہنچ جاتا ہے حالانکہ چُندری بھی ایک خانہ بدوش غریب لڑکی تھی لیکن جوان اور خوبصورت اور خوبصورتی نفرت کو ایک کیفیت دیتی ہے اور بامعنی اور دلکش بنا دیتی ہے۔ ایک معمولی سا منظر ملاحظہ کیجیے:

''راگھو راؤ سر جُھکا کر احتیاط سے سیلو کی جھاڑیوں کے قریب سے نکل کر اُس راستے پر ہو لیا جس کے دونوں طرف ناگ پھنی جھاڑیاں تھیں اور جو تانڈے کی طرف جاتا تھا ....قریب ہی قافلے کے خیمے تھے کچھ خیمے پٹ سن کے تھے۔ کچھ تاڑ کے پتوں کے بنے ہوئے تھے۔ مرد چٹائیوں پر بیٹھے اسے بٹ رہے تھے۔ کچھ عورتیں شمبھالو کی لچک دار شاخوں سے ٹوکریاں بُن رہی تھیں۔''

اس بیان سے نہ صرف قبیلے کا تعارف ہوتا ہے بلکہ

دوسرے گائوں کے ایک اصطبل میں پناہ لیکن اصطبل کی گندگی سے زیادہ اُسے وہ کتھا یاد رہ گئی جسے جگن ناتھ نے سُنائی کئی عوامی کلا کاروں کے ساتھ۔ یہ کتھا اس وقت سُنائی گئی جب گھوڑوں نے خشک باجرے اور انسانوں نے اُبلے ہوئے باجرے سے پیٹ بھر لیا۔ جانور اور انسان نما جانور دونوں کو باجرہ۔ کتھا کے آغاز اور انجام نے راگھو کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔

ایک نوع کی زندگی اور انداز معاشرت، اُس کی غربت۔ محدودیت سب کچھ ظاہر ہونے لگتی ہے اور محبت کے پیچ بھی اور اُس کے پیترے بھی۔ اس لیے کہ چندری بھی زمیندار کے ظلم و ہوس کا شکار ہوتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ وہ اس شکار کو شکار نہیں سمجھتی۔ سیوا اور قربانی کا نام دنیا اس کی مجبوری ہے۔ اُس کی اس معصومیت اور زمیندار کی طاقت کو دیکھ کر راگھو کو صاف احساس ہو گیا کہ.............. ''یہ آنسو آندھرا کی دھرتی کو سیراب نہ کر سکیں گے اس کے لیے کسان کو اپنا لہو دینا ہوگا۔''

اس سے قبل راگھو زمیندار کے آدمیوں کے ہاتھوں ذلیل ہو چکا تھا لیکن یہ کیفیت نہ پیدا ہوئی تھی جو چندری کو ذلیل اور غمخوار دیکھ کر پیدا ہوئی۔ اپنی ذات اور اپنی محبت میں

یہ ایک اہم سوال اور بڑا سوال ہے جس کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو ادب کو محض کتابی و نصابی حوالوں سے سمجھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکیں گے کہ کرشن چندر محبت کا پرستار ہے، فطرت کا شیدائی۔ یہ قدرت کی اتنی بڑی دین ہے جو آسانی سے کسی فنکار کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اسی لیے کرشن چندر بڑا فنکار ہے کہ اس نے فطرت کے وسیع تر سیاق و سباق میں زندگی کو، انسانوں کو دیکھ جانا سمجھا اور پرکھا ہے۔ ایسے ہی بڑے فنکار فطرت کو محض منظر نگاری کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ فطرت کو انسانی فطرت کا آئینہ بھی دکھاتے ہیں۔

جو فرق وہ کرتا ہے، راگھو اب اس فرق کو سمجھنے لگا تھا۔ اسی سمجھ سے جُڑتا ہے سماج کا نظام۔ زندگی کی پیچیدگی۔ لاشعوری طور پر وہ غم و غصے کو ایک منصوبہ دینے میں مصروف ہو گیا اور پھر بقول کرشن چندر:

''آج وہ وٹی نہیں تھا۔ آج وہ آزاد تھا۔ آج اُس کے ہاتھوں میں ایک نیا آئینہ تھا۔ آج وہ اپنے ہاتھوں میں ایک رنگین و منقش مینا اُٹھائے ایک نئی دلہن کی تلاش میں جا رہا تھا۔''

اسی مقام پر ناول ایک نئے موڑ میں داخل ہوتا ہے اور محبت مزاحمت میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی کرشن چندر کا اصل فن ہے اور نظریۂ ادب بھی کہ وہ تمام عناصر کو محبت کے جذبے میں گوندھ کر پیش کرتے ہیں۔ اور سب کو شیر و شکر کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر محبت کے بطن سے مزاحمت جنم لیتی ہے اور مزاحمت اکثر محبت میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی مزاحمت دراصل فطری محبت کا وہ جذبۂ عمل ہے جو فلسفۂ محبت بن کر وسیع سے وسیع تر ہو جاتی ہے جو لوگ محبت کا وسیع نظریہ نہیں رکھتے وہ اکثر کبھی کرشن چندر کی فطرت نگاری میں کھو جاتے ہیں یا اس کی مزاحمت کو خارجیت سے جوڑ کر کمزور کر دیتے ہیں۔ اس لیے کرشن چندر پر خارجیت اور اشتراکیت کا الزام لگانے والوں کو اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ کرشن کا اصل موضوع محبت ہے جہاں صرف عورت نہیں ہے زمین ہے، وطن ہے اور بنی نوع انسان ہیں۔ اس کے علاوہ پھول، آبشار، وادیاں۔ کُل ملا کر فطرت اور یہ پریشانی و بے چینی کہ زندگی اس فطرت کی طرح کیوں نہیں۔ چند لوگ خلافِ فطرت اور خلافِ آدمیت رویے کیوں اپناتے ہیں۔ خوبصورت کو بدصورت بنانے پر کیوں آمادہ ہیں۔ صدیوں سے کل بھی اور آج بھی بدلی بدلی شکلوں میں۔ یہ ایک اہم سوال اور بڑا سوال ہے جس کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو ادب کو محض کتابی و نصابی حوالوں سے سمجھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکیں گے کہ کرشن چندر محبت کا پرستار ہے، فطرت کا شیدائی۔ یہ قدرت کی اتنی بڑی دین ہے جو آسانی سے کسی فنکار کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اسی لیے کرشن چندر بڑا فنکار ہے کہ اس نے فطرت کے وسیع تر سیاق و سباق میں زندگی کو، انسانوں کو دیکھ جانا سمجھا اور پرکھا ہے۔ ایسے ہی بڑے فنکار فطرت کو محض منظر نگاری کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ فطرت کو انسانی فطرت کا آئینہ بھی دکھاتے ہیں۔ شیکسپیئر نے ایک جگہ اچھی بات کہی ہے To hold the mirror up to nature یعنی فطرت کو آئینہ دکھانا۔ آئینہ نمائی کا یہ عمل بذات خود ایک

فطری عمل ہے اس لیے کہ نابرابری اور ظلم و زیادتی ایک غیر فطری عمل ہے۔ فطرت اور غیر فطرت کے اس مُبہم ٹکراؤ سے جو ان راگھو دو چار ہوتا ہے۔ ابہام اس لیے کہ وہ ابھی نو عمر ہے اور ناتجربہ کار بھی اور بقول کرشن:

''شروع شروع میں تو اسے معلوم بھی نہ ہو سکا کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کا ایک موہوم سا تصور اس کے پاس تھا۔ ظلم کا ایک اندھا تجربہ تھا۔ صحبت کی ایک بے پناہ پیاس تھی۔''

لیکن مشاہدہ اور اس سے زیادہ تجربہ اگر ایک طرف جذبے کو مہمیز کرتا ہے تو دوسری طرف رویے کو نظریے میں بھی بدلتا ہے اور بھوک۔ بھوک تو وہ شے ہے کہ نوجوان کو سرکش اور کبھی کبھی انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ یہ عمل تو قابلِ فہم ہے کہ بھوک کا جبر و قہر ناقابلِ یقین صورتوں کی پیداوار ہے لیکن امیری اور شکم سیری کیوں حیوان ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ طاقت اور دولت کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ اقتدار کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے اور ایک مخصوص پیچ دار نظام لیکن لوگ جانتے ہیں کہ بھوک اور مُفلسی کا بھی اپنا نشہ ہوتا ہے اور یہ نشہ اس وقت غصے میں تبدیل ہو جاتا ہے جب اُسے ایک راہ مل جائے۔ ایک نظریہ کیونکہ نظریہ ہی بتاتا ہے کہ امیر خدا نہیں بناتا اور نہ ہی غریب کو بھی۔ یہ سب کچھ انسانی طاقت اور ناطاقتی کے پیچ دار کھیل ہیں۔ راگھو پہلے اس کھیل کو سمجھنا چاہتا ہے اور دھیرے دھیرے وہ سمجھنے لگا کہ..........'

ہر بار بنیے کی تھیلی بھاری تھی ہر بار راگو کا پیٹ خالی تھا.............'' وہ بھوک اور تھیلی کا موازنہ کرنے لگا۔ تھیلی بھری ہوئی ہو تو برداشت ہو جائے لیکن بھوک کیسے برداشت ہو پھر وہ خود بھوکا نہیں اس کے جیسے سیکڑوں ہزاروں وٹی بھوکے اور غریب۔ ایسا کیوں؟ اگر وہ محنتی ہیں اور ان کا بدن گٹھا ہوا ہے تو وہ کمزور کیوں اور خوف زدہ کیوں؟ ان کے درمیان ہمہ وقت تھیلی تجوری کی بات ہو ہماری بھوک ان کی گفتگو میں کیوں نہیں داخل ہوتی ہے۔ سوال در سوال اور سوال سے تلاشِ جواب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کردار۔ کرداروں کے مکالمے۔ واقعات و حادثات۔ سب کے سب سوالات کے گھیرے میں۔ سوال اور خیال..................

''گالی سے دل کی بھڑاس تو نکل سکتی ہے لیکن پیٹ کی بھوک دور نہیں ہو سکتی۔''

''بھوک دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مالک تجھے کاٹتا ہے تو مالک کو کاٹ۔''

لیکن راگھوراؤ کچھ الگ سا تھا۔ جُرم۔ عیاشی اور غلامی سے الگ۔ راگھو کو تو بھوک ستا رہی تھی۔ اجتماعی بھوک اجتماعی ذلت۔ وہ ان سب کے ذریعہ زندگی کی معنویت کو سمجھنا چاہ رہا تھا اور ساتھ میں عورت کو بھی لیکن ابھی آدرش جذباتیت سے دور تھا لیکن زمیندار اور بنیا اوباش احباب۔ جسم فروش عورت سب سے بڑھ کر بھوک کے ذریعے انسان کی ذلت اس کے خمیر و ضمیر نے اُتھل پتھل مچا رکھا تھا۔ اتھل پتھل جو کسی بھی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

گاؤں کا حبس اور قہر زدہ ماحول اسے گاؤں سے شہر لے آیا اور ہو رکشہ چلانے لگا کردار کا ایک نیا روپ۔ گاؤں سے نکلنے کی مجبوری۔ مزدوری۔ لاچاری سب شیر و شکر ہونے لگتے ہیں اور یہ احساس بھی گُم ہونے لگا کہ وہ ایک انسان ہے وہ محض رکشہ چلانے والا ہے جیسے گھوڑا تانگہ چلاتا ہے۔ جبر کا ایک نیا روپ۔ کچھ رکشہ کھینچتے ہیں اور کچھ رکشہ پر بیٹھتے ہیں۔ شہر میں طاقت و تصادم کا ایک نیا منظر نامہ اور پھر کرشن چندر کا یہ بلیغ جملہ:

''گاؤں میں راگھوراؤ نے غم کھانا سیکھ لیا تھا۔ یہاں شہر میں آ کے راگھوراؤ نے غم کھا کے مسکرانا سیکھ لیا تھا اور دوسروں پر مُسکرانا اور اپنے اوپر ہنسنا سیکھ لیا تھا۔''

جبر و صبر نے ایک مضبوط صورت اختیار کی۔ راگھو نوجوان سے جوان ہو چکا تھا۔ اس کا غم اب تبسم میں بدل رہا تھا اور تبسم۔ تنفّر تنوع میں بدلنے کو بے تاب تھا۔ دیر اس لیے لگ رہی تھی کہ وہ ایک رکشہ والا تھا۔ علم و فکر سے نابلد۔ اس کے پاس صرف احساس تھا اور اضطراب۔ شہر کی مختلف سواریوں اور مسافروں کی فکر انگیز گفتگو اور کرب آمیز خاموشی اسے احتجاج کے قریب لے جا رہی تھی ایسے ہی ایک خاموش کردار مقبول کے ذریعے رکشہ یونین سے وابستگی ہوتی ہے جس سے سلام نہیں ہوتا 'لال سلام' ہوتا ہے اور راگھو کی زندگی میں انقلاب آ جاتا ہے۔ سردی کی ایک رات نے اسے فکر و عمل کی ایسی گرمی دی۔ ایسی تازگی کہ اسے چندری کا پاکیزہ سینہ یاد آ گیا۔ ایک بار پھر محبت نے انگڑائی لی۔ انقلاب کی ہر کروٹ پر محبت ہم قدم خواہ وہ ثریا کی شکل میں ہو۔ آمنہ کی شکل میں یا چندری کی شکل میں یہ کرشن چندر کا فن ہی نہیں فکر بھی ہے۔ جذبہ اور نظریہ بھی۔ یہ سب کچھ اُس نے انڈیل دیا راگھوراؤ میں۔ یہ جملے دیکھیے:

''الفاظ مقبول کے دل سے نکل رہے تھے اور راگھو کے دل میں اُترتے جا رہے تھے۔ اور پیچ کی کوئی طاقت نہ تھی جو اُنھیں روک سکتی۔ راگھو کو سمت ملی تھی۔ اُس نے رستہ پایا تھا۔ پہلے جس چیز کا کوئی مطلب نہ تھا۔ آج اُس میں اسے معنی نظر آئے جہان اندھا تجربہ تھا وہاں روشنی کی لہر دوڑنے لگی۔''

کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ اس تبدیلی میں آدرش زیادہ ہے۔ اور اگر ہے تو ایسا غلط کیا کہ ناول کا اپنا کوئی نہ کوئی مقصد اور آدرش تو ہوتا ہے وہ محض کوری حقیقت نگاری سے کامیابی سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ تصور و تخیل اور مثال و مثالیت اسے اپنے لطیف لپیٹ میں لے کر آگے بڑھاتے ہیں اور تفکر کو تخلیق میں ڈھالتے ہیں۔ احتشام حسین ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''دنیا کا کوئی اہم ناول ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس کی تہہ میں ناول نگار کا کوئی نقطۂ نظر نہ ہو اس کو خیال کہیے۔ مقصد کہیے۔ زندگی میں ہم آہنگی کی جستجو کہیے۔ ذہنی رجحان کہیے۔ کیفیاتی ترجیح کہیے۔ جو نام دیجیے وہ ایک دھاگے کی طرح سارے واقعات کردار پس منظر اور طرزِ اظہار کو باندھے ہوئے ہوگا۔ اگر دنیا میں کچھ باتیں دوسری باتوں سے بہتر اور عظیم تر نہیں تو ناول نگار کے پاس کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔''
(ناول کی تنقید)

ذرا یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

"راگھوراؤ کو آج تک بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اُس رات کب تک، کتنی دیر تک جاگتا رہا۔ کب سویا۔ اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ اور مقبول دونوں لحاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سُن رہا تھا اور مقبول سُنا رہا تھا اور قریب ہی فرش پر ایک طرف ثریا سو رہی تھی اور اس کے پاس ننھی آمنہ ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی اور اس کا ایک ننھا سا ہاتھ بستر سے باہر نکلا ہوا تھا اور کمرے میں ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی دیوار کے سایے میں لرز رہی تھی۔"

اس منظر میں دریا۔ پہاڑ۔ آبشار درخت وغیرہ کچھ بھی نہیں (جس کے لیے کرشن چندر نیک نام ہیں اور بدنام بھی) ایک معمولی بند کمرے میں خوابیدگی کا ایک جذباتی سا منظر لیکن یہ معمولی پن اور خوابیدگی اپنی غیر معمولی بیداری کے کیسے لطیف اور بامعنی اشارے کر رہی ہے۔ دودھیا روشنی کی لرزش خیالات میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے۔ خلوص و محبت اور اپنائیت کی ایک خیالی دنیا جو حقیقی بننے کے لیے تڑپ اُٹھی ہے۔ آنکھیں نم کر رہی ہے۔ یہی تخلیق کاری ہے اور فنکاری بھی کہ منظر کے بطن سے مقصد پھوٹ پڑے اور تخلیق کہاں سے کہاں پہنچ جائے کہ قاری بھی راگھو کا ہم نوا بن جائے اور ایک نئے معاشرہ کی خواہش کی ہوا بہنے لگے۔ اس اعتبار سے یہ ناول انفرادی کشمکش کے بجائے اجتماعی کشمکش میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور یہی اشتراکیت کا اصل رویہ ہے اور فلسفہ بھی کہ جہاں انسان سے نہیں نظام سے تصادم ہونے لگتا ہے۔

اشتراکی مقبول سے ملاقات۔ رکشہ سے مل مزدور تک کا سفر طے ہوتا ہے لیکن کشمکش وجدوجہد ہر جگہ جاری۔ طاقت اور حکومت کا تال میل ہر جگہ۔ ہر مقام پر بلکہ اور وسیع تر پیمانے پر جس کی جڑیں زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی ہیں بقول کرشن چندر:

"جہاں ہر قدم پر نئی زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے حالات کو بدلنے کے لیے انسان کو بہتر کے لیے پرانی زندگی سے ٹکر لینا ہی پڑتی تھی۔"

لیکن اس ٹکڑے سے بغاوت سے راگھو کو جیل ہو گئی لیکن زندگی سماج میں بدلاؤ کے آثار نظر آنے لگے کہ تبدیلی کے لیے، پرانے نظام کو بدلنے کے لیے قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ راگھو کو پھانسی کا اعلان ہوتا ہے۔ بقول سید محمد عقیل:

"راگھو کی پھانسی ہندوستان کے اس نئے کسان کو پھانسی دینے کی کوشش ہے جو آج نئی امنگوں کے ساتھ آندھرا اور تلنگانہ بلکہ پورے ہندوستان میں بیدار ہو رہا ہے۔"

طبقاتی کشمکش پر تو کرشن سے قبل بھی ناول اور افسانے لکھے گئے۔ پریم چند جس کی اعلیٰ ترین مثال ہیں لیکن انقلابی رومانیت یا اشتراکی حقیقت کو لے کر یہ ناول پہلی بار لکھا گیا حتیٰ کہ خود کرشن چندر کا پہلا ناول 'شکست' بھی طبقاتی کشمکش سے آگے بڑھ کر احتجاجی رومانیت پر آکر ٹھہر گیا۔ 'جب کھیت جاگے' شکست کے آگے کا سفر ہے جس میں اشتراکی حقیقت کو معنی خیز انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں حقیقت کو بدلنے کی

"راگھو رائو کو آج تک بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اُس رات کب تک، کتنی دیر تک جاگتا رہا۔ کب سویا۔ اُسے صرف اتنا یاد ھے کہ وہ اور مقبول دونوں لحاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سُن رہا تھا اور مقبول سُنا رہا تھا اور قریب ھی فرش پر ایک طرف ثریا سو رھی تھی اور اس کے پاس ننھی آمنہ ھلکے ھلکے سانس لے رھی تھی اور اس کا ایک ننھا سا ھاتھ بستر سے باھر نکلا ھوا تھا اور کمرے میں ٹیبل لیمپ کی دودھیا روشنی دیوار کے سایے میں لرز رھی تھی۔"

تڑپ ہے۔ اور ایک عمدہ و مساوی معاشرے کے مستقبل کی تلاش بھی۔ گورکی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"کسی واقعے کو دوبارہ پیش کرنے کی کوشش میں حقیقت نگار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مستقبل کی کھوج لگانے سے انکار کرے اس لیے کہ ماضی اور مستقبل آنکھوں سے اوجھل ہونے کے باوجود اس طرح حقیقت ہیں جس طرح حال......."

پریم چند نے گئو دان میں ہوری کے کردار کے ساتھ گوبر کا نوجوان کردار پیش کیا ہے جو ہوری کے مقابلے سرکش ہے باغی ہے لیکن وہ شہر چلا جاتا ہے اس طرح یہ سرکش کردار ایک معمولی سا باغیانہ تیور دکھا کر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ ہوری ہی مرکزی کردار رہتا ہے لیکن کرشن چندر جو پریم چند کی روایت کے پاسدار ہیں، ساتھ ہی اس کی توسیع بھی۔ وہ اس ناول میں باپ کے کردار کو پس منظر میں ڈال کر باغی بیٹے کے کردار کو مرکز میں لا کر بغاوت و سرکشی کے ذریعے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ پریم چند کے دور کی بے چینی اور سرکشی اب کس منزل پر پہنچ چکی ہے بقول علی سردار جعفری:

'جب کھیت جاگے' اس اعتبار سے کرشن چندر کی سب سے اہم کہانی ہے کہ اس میں پندرہ سولہ سال کے بعد وہ کسان نئی شان سے آیا ہے، جس نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں پریم چند کے ناول گئو دان میں دم توڑا تھا اب یہ بے بس اور مصیبت زدہ کسان نہیں ہے بلکہ وہ بہادر چھاپہ مار ہے جو اپنی اور تمام کسانوں کی بے بسی اور مصیبت کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔"

یہ اشتراکی حقیقت پر مشتمل اردو کا پہلا ناول ہے اور کامیاب ناول ہے اور شاید اس اعتبار سے بھی منفرد ناول ہے کہ اس میں نسوانی کردار برائے نام ہیں۔ اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ ناول جیل کی سلاخوں سے شروع ہوتا ہے اور کھیت اور وادیوں میں پھیل جاتا ہے۔ محبت سے شروع ہوتا ہے اور مزاحمت تک پھیل جاتا ہے، محض ایک کردار کو لے کر یہ پھیلاؤ اور گٹھاؤ کرشن چندر کے غیر معمولی فکر و فن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ کرشن چندر ایک کردار کے ذریعے ایک نظام اور ایک زندگی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک فلسفہ پیش کرتے چلتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

"منافع اور ظلم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے دیس کا تو یہ دستور ہے جب رجعت پرست طاقتیں ہارنے لگتی ہیں تو فرقے واری کا سہارا لیتی ہیں۔"

ایسے بے شمار جملے ہیں جن سے ناول کی معنویت و مقصدیت میں اضافہ ہوتا ہے اور قدم قدم پر دعوتِ فکر بھی ہے کہ فکر کی دبازت اور مزاحمت کی کیفیت اب پریم چند سے آگے بڑھ چکی ہے۔ پریم چند انسان کو تقدیر کا غلام سمجھتے تھے لیکن کرشن چندر انسان کو تقدیر پر قادر سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہ انسان اپنی محنت اور سوجھ بوجھ سے صرف اپنی ہی نہیں، اپنے گاؤں، ملک اور معاشرہ کی تصویر بدل سکتا ہے۔ ناول زندگی کا رزمیہ ضرور ہے لیکن اس رزم میں بزم کی تمام کیفیات، تغیرات، کا ذکر مُفکرانہ اور فنکارانہ ڈھنگ سے کیا جاتا ہے اور ناول نگار کا اپنا ایک مقصد، نظریہ بھی ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ مقصد کو فن کے آگے آگے نہیں ہونا چاہیے لیکن پیچھے پیچھے بھی نہیں رہنا چاہیے دونوں کا لطیف و حسین امتزاج ہی بڑی تخلیق کا ضامن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ناول اپنی صداقت، حقیقت بلکہ اشتراکی حقیقت کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ سہیل بخاری کے ان جملوں پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

"یہ ناول مصنف کے اشتمالی رجحانات کا مکمل آئینہ دار ہے اور مصنف کا بہترین ناول ہے..............."

■

Prof. Ali Ahmad Fatmi, Dept. of Urdu, Allahabad University, Allahabad (UP)

سید احمد قادری

کرشن چندر

اردو کا مقبول ترین افسانہ نگار

کرشن چندر کا پہلا افسانہ یوں تو 'ماسٹر بلکی' کے عنوان سے 1926 میں ہفتہ وار 'ریاست' دہلی میں شائع ہوا تھا،لیکن کرشن چندر کے افسانوی سفر کا باضابطہ آغاز افسانہ 'یرقان' سے ہوتا ہے، جو ادبی دنیا (لاہور) میں 1936 میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا تھا۔ ابتدائی دور میں کرشن چندر رومانی افسانے لکھتے رہے، حسن و عشق کی داستان حسین اور دل چسپ انداز میں بیان کرتے رہے۔ لیکن جوں جوں ان کا سماجی شعور بیدار ہوتا گیا، وہ رومانیت سے قدرے دُور ہوتے ہوئے حقیقت نگاری اور زندگی کے اسرار و رموز کو اپنے تمام تر احساسات وجذبات کے ساتھ فن کی بھٹی میں تپا کر افسانوی قالب میں پیش کرنے لگے۔

کرشن چندر کی زودنویسی کافی مشہور ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے 32 افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں، جن پر ہم ایک نظر ڈالیں تو، طلسم خیال (1939)، نظارے (1940)، ہوائی قلعے (1940)، گھونگھٹ میں گوری جلے (1941)، زندگی کے موڑ پر (1943)، نئے افسانے (1943)، نغمے کی موت (1944)، پرانے خدا (1944)، ان داتا (1944)، ہم وحشی ہیں (1947)، ٹوٹے ہوئے تارے (1947)، تین غنڈے (1948)، اجنتا سے آگے (1948)، ایک گرجا ایک خندق (1948)، سمندر دور ہے ((1948)، شکست کے بعد (1951)، نئے غلام (1953)، میں انتظار کروں گا (1953)، مزاحیہ افسانے (1954)، ایک روپیہ ایک پھول (1955)، یوکلپٹس کی ڈالی (1955)، ہائڈروجن بم کے بعد (1955)، کتاب کا کفن (1956)، دل کسی کا دوست نہیں (1959)، کرشن چندر کے افسانے (1960)، مسکرانے والیاں (1960)، سپنوں کا قیدی (1964)، مس نینی تال (1964)، دسواں پل (1967)، گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو (1967)، آدھے گھنٹے کا خدا (1969) اور الجھی لڑکی کالے بال (1970) تک رسائی ہوتی ہے۔

کرشن چندر کے سحر کا زمانہ 36ء کے ابتدائی دور سے شروع ہوتا ہے پھر 47ء کے فسادات ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اردو افسانہ اس طرز احساس اور اسلوب بیان سے اکتا کر نئے رجحانات سے آشنا ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اردو افسانے میں نئے رجحانات اور نئے اسالیب کے عمل دخل کے باوجود کرشن چندر کے رنگ میں لکھا جانے والا افسانہ آج بھی اثر رکھتا ہے۔ کرشن چندر کی رومانیت اپنے عہد کے مزاج سے نکلی تھی۔ مگر انھوں نے اپنے زورِ تخلیق سے اس میں اتنی توانائی پیدا کی کہ وہ اگلے عہد تک چلی اور اس پر اثر انداز ہوئی۔ اس سلسلے میں انتظار حسین نے لکھا تھا:

''کرشن چندر کے ساتھ اردو افسانہ رومانیت کے چنگل سے نکلا اور رومانی حقیقت نگاری کی حدود میں داخل ہوا۔ اس نئی روایت میں رنگی ہوئی ان کی حقیقت نگاری پورے عہد کو اپنے ساتھ بہالے گئی۔ بس یوں سمجھو کہ کرشن چندر ایک فیشن بن گئے۔ نوخیز ذہن میں جو افسانہ آتا، وہ کرشن چندر کے رنگ میں رنگا جاتا۔''

ادب محض خوش وقتی اور ذہنی عیاشی کا سامان نہیں بلکہ علم و دانش کا ایک حصہ اور زندگی کا ایک اہم صحیفہ ہے۔ ادب سے جہاں ہماری جمالیاتی حس کی تسکین ہوتی ہے اور ایک خاص طرح کی مسرت سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ادب ہماری فکری بصیرت اور ذہنی ارتقا کا وسیلہ بھی ہے اور اس امر کا احساس کرشن چندر کو شدت کے ساتھ ہمیشہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بالکونی، دل کسی کا دوست نہیں، نغمے کی موت، گل دان، چینی پنکھا، پالنا، جہلم میں ناؤ پر، سرخ پھول، اور گرجن کی ایک شام، جیسے افسانے لکھے، جن میں ان کی جمالیاتی حس اور رومانیت پوری طرح اُجاگر نظر آتی ہے۔ مثال کے لیے 'جہلم میں ناؤ پر' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'' بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر آہ، اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی منزل پر بے تحاشہ بھاگی جارہی تھی، مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا۔ دل برداشتہ چہرے تھے اور حقے یا پھر تھانیدار صاحب کا مور چھل۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حُسن ناپید ہے۔''

لیکن آگے چل کر جوں جوں کرشن چندر کا سماجی شعور بیدار ہوتا گیا، وہ رومانیت سے حقیقت نگاری کی جانب آتے گئے اور 'یوکلپٹس کی ڈالی' ایک سینتا ایک مگرمچھ، ان داتا، دادر پُل کے بچے، مہالکشمی کا پُل، پشاور ایکسپریس، خونی ناچ، دو فرلانگ لمبی سڑک، اور 'ایک آنہ' وغیرہ جیسے افسانے لکھ کر انھوں نے اردو افسانے میں قابل قدر اضافے کیے۔ ان تمام افسانوں کے مطالعے سے کرشن چندر کے دھڑکتے ہوئے دل میں انسانیت کے درد وداغ اور جستجو و آرزو کے گہرے احساس کے ساتھ ساتھ ان کا مارکسی نقطۂ نظر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کا مشہور افسانہ 'مہالکشمی کا پُل' پیش کیا جاسکتا ہے، جس میں فرقہ وارانہ فساد کی شکار ایک لڑکی جب گرتی ہے تو اس کے ہاتھ میں مارکسزم کی ایک کتاب ہوتی ہے۔ لیکن کرشن چندر کی افسانے پر فنی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ کسی بھی جگہ ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ کرشن چندر اپنے مارکسی نظریات کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ کرشن چندر نے بیشتر افسانے ایسے لکھے ہیں جن میں انسان کی بے بسی، مفلسی، بے

کرشن چندر نے جہاں بہت سارے لازوال اور شاہکار افسانے تخلیق کیے، وہیں ان کے چند افسانے ایسے بھی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ یہ افسانے کرشن چندر جیسے عظیم افسانہ نگار نے لکھے ہیں؟ اس لیے کہ ان افسانوں میں کرشن چندر کا نہ اپنا مخصوص اسلوب ہے، نہ آرٹ ہے اور نہ فنی رچاؤ ہے۔ اس سلسلے میں ہم کرشن چندر کے عورتوں کا عطر، ربر کی عورت، بھگوان کی واپسی، لڑکی کی مہک، تھالی کا بیگن اور زرگاؤں کیرانی جیسے افسانوں کا نام لے سکتے ہیں۔

کسی، تنگ دستی، بد حالی، اور استحصال کی تصویریں جیتے جاگتے کرداروں میں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں کرشن چندر کے چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''وہ پیچش ٹھیک کر دیتا تھا اور وہ پھر آجاتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس علاقے کے لوگوں کی آنتیں کمزور تھیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان کی جیبیں کمزور تھیں۔ گھر اناج سے خالی تھے اور دیہات قحط سے روندے ہوئے تھے۔ لوگ پتے اُبالتے تھے اور درختوں کی چھال اُبالتے تھے۔ اس لیے پیچش ضروری تھی، اس قدر لازمی کہ اگر انسان کے جسم میں آنتیں نہ ہوتیں تو یہ پیچش معدے میں ہو جاتی یا پھر پھیپھڑوں میں ہو جاتی یا کان میں ہو جاتی، مگر ہوتی ضرور۔'' (یوکلپٹس کی ڈالی)

''پانڈے نے کہا آج دس روز سے ہم لوگ ہڑتال پر ہیں۔ سنا ہے آج سے آٹھ روز کے بعد گورنر صاحب اس بلڈنگ کو کھولنے والے تھے، لیکن اب یہ بلڈنگ نہیں کھلے گی، اسے ہمارے سوا کوئی نہیں بنا سکتا۔ بلالیں کسی بڑے سے بڑے آدمی، بڑے سے بڑے نیتا کو اور اس سے یہ عمارت مکمل کرالیں، ہم بھی دیکھیں گے، یہ لوگ پتھر ڈھونا نہیں جانتے، خالی سونے کی قینچی سے ریشم کا فیتہ کاٹنا جانتے ہیں۔'' ایک سیتا ایک مگرمچھ

''روپئے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، کوئی رنگ اور مزاج نہیں ہوتا، اس کی کوئی قوم نہیں ہوتی اور اس کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی محبت نہیں ہوتی۔ روپئے کی ابتدا اور انتہا روپیہ ہے اور زیادہ روپیہ اور زیادہ روپیہ۔''

(برہمن)

کرشن چندر کا افسانہ 'ان داتا' بھی اسی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ جو کہ بنگال کے بھیانک قحط اور اس کے اثرات پر لازوال افسانہ ہے۔

اسی دوران دنیا کے افق پر دوسری جنگ عظیم کے مہیب بادل محیط ہو رہے تھے۔ فسطائی اور سامراجی طاقتیں اپنی پوری بربریت کے ساتھ اپنا رول ادا کر رہی تھیں۔ ادب میں بھی سماجی بے چینی اور تلخی دبے پاؤں آنے لگی تھی۔ کرشن چندر کا دل ایک حساس انسان کا دل تھا۔ جس نے 'گل فروش'، 'خونی ناچ'، 'بے رنگ و بو'، اور 'دو فرلانگ لمبی سڑک' جیسے پر اثر اور افسانوی ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانے لکھوائے۔

کرشن چندر نے جہاں بہت سارے لازوال اور شاہکار افسانے تخلیق کیے، وہیں ان کے چند افسانے ایسے بھی ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ یہ افسانے کرشن چندر جیسے عظیم افسانہ نگار نے لکھے ہیں؟ اس لیے کہ ان افسانوں میں کرشن چندر کا نہ اپنا مخصوص اسلوب ہے، نہ آرٹ ہے اور نہ فنی رچاؤ ہے۔ اس سلسلے میں ہم کرشن چندر کے عورتوں کا عطر، ربر کی عورت، بھگوان کی واپسی، لڑکی کی مہک، تھالی کا بیگن اور زرگاؤں کیرانی جیسے افسانوں کا نام لے سکتے ہیں۔

لیکن ان چند افسانوں کی وجہ سے کرشن چندر کی غیر معمولی فنی و فکری صلاحیت پر حرف نہیں آتا، اس لیے کہ کسی بھی فنکار کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ہر تخلیق شاہکار ہوگی۔ اس لیے کرشن چندر کے بہت سارے بہترین افسانوں کے سامنے ان چند غیر معیاری افسانوں کو فراموش کرنے میں کوئی تامل نہیں اور ابوالفیض سحر کی باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے کہ:

''کرشن چندر نے اردو افسانوی ادب کو جو تنوع دیا، جو ہمہ جہتی و ہمہ گیری دی، جو بلندی عطا کی، جو وسعت اور گہرائی و گیرائی دی، اس کی مثال ہماری ادبی تاریخ میں کم ملے گی۔ ہندوستان کے شہروں، دیہاتوں کے گلی کوچوں، فٹ پاتھوں کے تڑپتے لمحوں، حویلیوں اور جھونپڑوں کے پر سکون صحنوں کی زندگی سے لے کر لندن، ماسکو، اور واشنگٹن جیسے پر ہجوم شہروں کے کلبوں اور کارخانوں کی نئی صنعتی زندگی کی دھوپ چھاؤں، زندگی کے مختلف فلسفوں اور عقیدتوں کے چمن زاروں میں کھلے انسانی احساسات و جذبات کے پھولوں اور ان پھولوں پر منڈلاتی انسانی نفسیات اور کردار کی رنگ برنگی تتلیاں جسم و جاں اور روح کی وادیوں میں گنگناتے آبشاروں، لہلہاتے چنار دلچسپ پیرائے سے کرشن چندر کے ادب کو مزیّن کرتے ہیں، اور اس کی مقامی اور بین الاقوامی قرأت اور قدر و قیمت بڑھاتے ہیں۔''

کرشن چندر کی اعلیٰ صلاحیتوں، تحریر کی شگفتگی اور فکر و فن کا اعتراف بڑے بڑے ناقدوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کرشن چندر کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''کرشن چندر نے اردو زبان میں انسانی وجود کی، اس کے قلب کی سوئی ہوئی وادیوں کو جگایا تھا۔ جہاں کسی اور کی رسائی نہ ہوسکی۔ وہ اپنے ساحرانہ بیان سے ان وادیوں کی ساری رنگینی، شادابی اور دلکشی کو اپنے قارئین کی روح میں منتقل کر دیتا تھا۔ اس کی کہانیوں میں انسان کے مقدس اور معصوم جذبات دل کی طرح دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آہوں اور آنسوؤں امیدوں اور مایوسیوں اور قہقہوں اور مسکراہٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتے یہ انسانی جذبات ہی اس کا سرمایۂ حیات ہیں۔''

(ڈاکٹر قمر رئیس)

''انسانی قدروں کے مرقع نگار کی حیثیت سے اردو میں کرشن چندر کی حیثیت ہمیشہ رہے گی۔ عوام و خواص میں جتنی مقبولیت کرشن چندر کو نصیب ہوئی وہ بہت کم لوگوں کو میسر آئی ہے۔ ان میں تین باتیں خاص تھیں۔ مناظر فطرت سے

والہانہ محبت، اخلاص سے معمور انسان دوستی اور جذبات سے تھرتھراتا ہوا سادہ اور خوبصورت اسلوب۔"

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

کرشن چندر کے افسانوں میں مناظر فطرت کی جتنی حسین اور خوبصورت تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں اور اسے پیش کرنے میں انھیں جو کمال حاصل تھا وہ دوسروں کو کم نصیب ہوا۔ کرشن چندر کے افسانے 'سفید پھول' 'پورے چاند کی رات' 'گل فروش' اور 'خوشبو اڑی اڑی سی۔ وغیرہ جیسے بہت سارے افسانے ایسے ہیں جن میں قدرتی اور فطری مناظر بڑے دلکش اور پیارے انداز میں ملتے ہیں اور ایسے مناظر کی بہترین اور لاجواب تصویر کشی کا فن کرشن چندر کو ہی حاصل تھا، اور اس فن کمال تک کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں پہنچ سکا۔

لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے جہاں کرشن چندر سے کئی اچھے بلکہ بے حد معیاری اور شاہکار افسانے لکھوائے، جن پر آج بھی ترقی پسند ادب فخر کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے اشتراکیت کے بھرپور مظاہرے سے جہاں ان کے افسانوں کا فن مجروح ہوا ہے، وہیں ان کے ایسے افسانوں سے ان کی شہرت اور مقبولیت کو گہن بھی لگا ہے۔

کرشن چندر کے بعض اہم افسانوں سے متاثر ہو کر قرۃ العین حیدر نے لکھا تھا:

"مجھے اب تک یاد ہے کہ "دو فرلانگ لمبی سڑک، زندگی کے موڑ پر، ان داتا، اور بالکونی" وغیرہ ہمیں کس قدر دل آویز اور انوکھی معلوم ہوتی تھیں، ایک ہلکی ہلکی شعریت، حسن کاری، زندگی کا احساس اور پرخلوص مطالعہ، گویا لکھنے والے نے ایک طلسمی آئینہ اس زاویے سے بٹھایا کہ اس میں ہماری مانوس دنیا ایک مختلف رنگ میں نظر آنے لگی، جو بہ یک وقت ان کا حقیقی اور آئیڈیل روپ تھا، یہ نیا رویہ انسان دوستی اور اشتراکیت کہلا رہا تھا۔ یہ دونوں اصطلاحات گھس پٹ کر خاصی بدنام ہو چکی ہیں، مگر ان کی اہمیت اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" (شاعر: کرشن چندر نمبر)

قرۃ العین حیدر کے اظہار خیال کے مطابق دونوں اصطلاحیں کس قدر گھس پٹ کر بدنام ہو چکی ہیں، یہ بحث کا الگ موضوع ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ کرشن چندر اپنے سیاسی نظریے میں اس قدر ڈوب چکے تھے کہ زودنویسی نے ان سے بہت سارے سطحی افسانے لکھوائے۔

کرشن چندر اپنے سیاسی نظریے کی وضاحت میں کس قدر اٹل تھے، ان ہی کے الفاظ میں دیکھیے، جو انھوں نے 1944 میں ترقی پسند مصنّفین کی کانگریس کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا:

"اب وقت آگیا ہے کہ ہر ادیب کھلم کھلا اشتراکیت کا پروپیگنڈہ شروع کردے۔ کیونکہ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، آگے بڑھتی ہوئی رواں دواں اشتراکیت یا ساکن وجامد موت۔"

کرشن چندر کی اشتراکیت کے پروپیگنڈا کی ذہنیت یا سخت گیری کے باعث انھیں نقصان بھی ہوا، اشتراکیت کے معدوم ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کی کمزور پڑتی رفتار سے کرشن چندر کی شہرت دھیمی پڑتی گئی اور آج بعض نقاد اس امر کا اظہار کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتے کہ کرشن چندر کی زودنویسی کے باعث ناقدین انھیں اردو کا کمزور افسانہ نگار تصور کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی زودنویسی کا عالم یہ ہے کہ اگر ساہتیہ اکادمی کے مونوگراف: 'ہندوستانی ادب کے معمار: کرشن چندر' کی مصنفہ جیلانی بانو کی بات پر یقین کیا جائے تو........

"انھوں (کرشن چندر) نے پانچ ہزار سے زیادہ افسانے لکھے، جو تقریباً بائیس مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئے۔" (ص 17)

لیکن میرے خیال میں جیلانی بانو کی یہ بات صداقت سے پرے ہے۔ جیلانی بانو، کرشن چندر کے بائیس مجموعوں کی بات کرتی ہیں اور 'کرشن چندر کی تصانیف' "عنوان کے تحت 32 افسانوی مجموعوں کی فہرست پیش کرتی ہیں۔ اس ضمن میں کلام حیدری کی بات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر نے تقریباً پانچ سو افسانے لکھے ہیں۔ (ماہنامہ شاعر، کرشن چندر نمبر 2، صفحہ 76) ان پانچ سو افسانوں میں کتنے افسانے فکری وفنی سطح پر اعلیٰ پیمانہ تک پہنچ سکے اور برطانوی استبداد، ستیہ گرہ، قحط بنگال، آئی این اے کے مجاہدین آزادی، جہازیوں کی بغاوت، تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات، آزادیٔ ہند، دیسی حکومت کی بدکاری، سرمایہ داروں، اجارہ داروں کا ظالم شکنجہ، حسن وعشق اور کشمیر کی وادیاں وغیرہ جیسے موضوعات کو فنکارانہ طور پر برتا ہے، یہ امر ایک طویل تنقیدی بحث کا متقاضی ہے۔

کرشن چندر اپنے سیاسی نظریے کی وضاحت میں کس قدر اٹل تھے، ان ہی کے الفاظ میں دیکھیے، جو انھوں نے 1944 میں ترقی پسند مصنّفین کی کانگریس کے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا: "اب وقت آگیا ہے کہ ہر ادیب کھلم کھلا اشتراکیت کا پروپیگنڈہ شروع کردے۔ کیونکہ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، آگے بڑھتی ہوئی رواں دواں اشتراکیت یا ساکن وجامد موت۔"

لیکن اس پر ضرور غور ہونا چاہیے کہ وہ کون سی مجبوریاں تھیں کہ کرشن چندر کو اتنے ڈھیر سارے افسانے لکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ظاہر ہے اتنے سارے افسانوں میں کرشن چندر کی اعلیٰ فکری وفنی صلاحیتیں پوری طرح ابھر کر سامنے کیسے آتیں۔ لیکن جن افسانوں میں کرشن چندر کا اپنا مخصوص لب و لہجہ، اسلوب، آرٹ اور فن پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے، ان کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر ایسے خوش نصیب افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے اپنے اسلوب، آرٹ اور فن کے ساتھ ساتھ اپنے تجربے اور مشاہدے کے شاندار اظہار کی بنا پر اپنے پہلے ہی افسانے کی اشاعت کے بعد شہرت حاصل کرلی، جس سے متاثر ہو کر ان کے ہم عصر افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کو یہ کہنا پڑا تھا کہ:

"کرشن چندر اردو افسانہ کو داستان کے دور سے نکال کر مغربی ادب کے شاہکاروں کے دور میں لے آیا، وہ واحد افسانہ نگار ہے، جس نے اپنے پہلے ہی افسانہ پر شہرت حاصل کرلی۔"

کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی ان کا جو اسلوب ملتا ہے، وہ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں سے مختلف اور منفرد تھا۔

ان کی شگفتگیِ تحریر، ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ آنے والی کئی نسلوں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس سلسلے میں مشہور افسانہ نگار، راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں:

"اسلوب کے ایک حصے پر تو انھیں قابو تھا، مثلاً منظر کشی، تشبیہات، استعارے اور احساسِ جمال۔"

"میں نے کتنا چاہا کہ کرشن چندر کا قلم مجھے مل جائے اور میری لکنت دور ہو جائے۔"

بیدی کے اس اظہار خیال سے کرشن چندر کے اندر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

جدیدیت کے دور میں بھی کرشن چندر کو فراموش نہیں کیا گیا اور ان کے کئی افسانے مثلاً چھتری، مردہ سمندر اور غالیچہ وغیرہ کو دورِ جدید کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر نے افسانوی ادب میں جو ایک معیار اور وقار قائم کیا اور جو قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے، ان پر ہم جس قدر فخر کریں، کم ہے۔

■

Dr Syed Ahmad Quadri, Road No. 7
New karimganj, Gaya-823001(Bihar)

رفیعہ شبنم عابدی

کرشن چندر عورت اور تانیثیت

کرشن چندر ہمارے عہد اور فکشن کی تاریخ کا ایک عجیب وغریب فن کار ہے۔ ایسا کثیر الاصناف کہ افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، فنطاسیہ، رپورتاژ، منظرنامے، ڈاکیومنٹری فیچر اور بچوں کا ادب، سب اس کی زنبیل فکر میں موجود اور ایسا مختلف الالوان کہ شاعری، موسیقی ونغمگی، سنگ تراشی، مصوری، مونولاگ، مونتاج، کولاژ، طنز ومزاح، پیکر تراشی، تجسیم کاری، تشبیہات و استعارات سارے کے سارے رنگ، کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست، کے مصداق قاری کو کشاں کشاں ان کے جہانِ تخیل کی سیر کراتے ہیں اور اس مقامِ حیرت پر پہنچ کر سوچنا پڑتا ہے کہ آخر یہ ترغیب، یہ Inspiration انھیں ملتا کہاں سے ہے؟

سہیل عظیم آبادی کے ساتھ ایک مکالمے میں انھوں نے اس کا انکشاف اس طرح کیا ہے:

''آرٹ کا مرکزی نقطہ عورت کی ذات ہے۔ عورت کا حسن، اس کی جوانی، اس کا قد، اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کے بال، اس کے گال، اس کے ہونٹ، اس کی مسکراہٹ، اس کا رونا، اس کی محبت، اس کی نفرت — غرضیکہ عورت کا انگ انگ، اس کی ہر بات دنیا بھر کے آرٹسٹوں کا مرکز رہا ہے۔ اگر آرٹ سے عورت کو نکال دیا جائے تو کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔''[1]

اس انکشاف کے ساتھ ہی قاری کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کرشن چندر جیسے فن کار کا عورت کے تئیں محض یہی نظریہ ہے؟ کیا اُن کے تانیثی افکار کی بنیاد بس اتنی سی ہے؟ یا پھر اُن کا یہ نظریہ عورت کے باب میں مزید معروضات کا متقاضی ہے؟ نیز یہ بھی کیا کہ تانیثیت اپنی جگہ خود ایک اہم، سنجیدہ، فکر انگیز اور بحث طلب مسئلہ نہیں؟ کہ جس کی اپنی ایک تاریخ ہے، تحریک ہے اور اس تاریخ تحریک سے خود کرشن چندر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افکار ونظریات نیز اپنی تحریروں کے وسیلے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ جانے بغیر نہ کرشن چندر کو سمجھا جا سکتا ہے، نہ اُن کے تانیثی افکار کو اور نہ ان کی کہانیوں اور دیگر تحریروں کو، کہ یہ محض زندگی کی تصویریں نہیں، حقائق کا منظرنامہ بھی ہیں جن میں چھوٹی سے چھوٹی، معمولی سے معمولی اور غیر اہم سے غیر اہم شے بھی بہت بڑی، بہت غیر معمولی اور بہت اہم بن گئی ہے اور ان تمام جزئیات اور محاکات سے مل کر جو ایک شکل بنتی ہے، بکھری بکھری اشیا اور پھیلے سمٹے منظروں کے بیچ سے جو ایک تصویر ابھرتی ہے، وہ ہے کرشن چندر کی کہانیوں اور خیالوں کی عورت، جسے کرشن چندر نے متجسس آنکھوں سے دیکھا اور مضطرب انگلیوں سے تخلیق کیا ہے۔

کرشن چندر نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آخری برسوں میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے پہلے افسانے 'یرقان' (مطبوعہ 'ادبی دنیا' لاہور 1936، سالنامہ) سے لے کر ان کی آخری تحریر، ناول 'فٹ پاتھ کے فرشتے' تک جو ماہ نامہ 'بیسویں صدی' میں بالاقساط جنوری 1977 تک شائع ہوتا رہا، یعنی چالیس سال کے اس شاداب وزرخیز، طویل ادبی سفر کے دوران ایک یادگار دن وہ بھی آیا جب 1975 کے سال خواتین کا عالمی سال قرار دیا گیا اور ہر سال 8 مارچ کو 'یومِ خواتین' کے نام سے مخصوص ومنسوب کر دیا گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہی 8 مارچ 1977 'خواتین کو آرٹ کا مرکزی نقطہ قرار دینے والے بین الاقوامی شہرت یافتہ فن کار کرشن چندر کا یومِ وفات ہے۔ عورت کے حقوق وآزادی پر مر مٹنے کی اس سے زندہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے!''

اب ذرا غور کیجیے تو یہی دور ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا کا دور بھی ہے اور تانیثی تحریک کی سرگرمیوں کا عہد بھی۔ یہ دور ساری دنیا اور خاص طور پر ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے انتہائی اہم دور ہے۔ آزادی کی تحریکیں اپنے شباب پر پہنچ چکی تھیں۔ ہندوستانی ذہن برطانوی استعمار واستحصال کے خلاف مکمل طور پر آمادہ و بیدار ہو چکا تھا۔ کانگریس مکمل آزادی کا مطالبہ کر چکی تھی۔ ہندستان کے تمام شہروں میں ہڑتالوں، انقلابی نعروں، گولیوں اور لاٹھیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ساری دنیا ایک اقتصادی بحران کا شکار تھی۔ جنگ، قحط، بے روزگاری، فسادات — وغیرہ ہندوستان کے منظرنامے پر بھی اپنے نقوش ثبت کر چکے تھے۔ یہ دور ادبی حیثیت سے بھی بڑا اہم اور چونکا دینے والا دور تھا۔ ترقی سند تحریک اپنا پہلا اجلاس کر چکی تھی۔ منشی پریم چند کے خطبے کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنسیں جگہ جگہ منعقد ہونا شروع ہو گئی تھیں اور ادب میں ایک نیا موڑ، نیا زاویہ، نیا رویہ اور نیا رجحان پیدا ہو رہا تھا اور یہی وہ رجحان تھا جس نے کرشن چندر کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر دیا جس سے وہ تادمِ مرگ جُڑے رہے۔

دوسری طرف دیکھیے تو یہی دور تانیثی نظریات کے فروغ کا دور ہے۔ پوری دنیا میں بھی اور ہندوستان میں بھی اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے تحریکِ نسواں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا شدہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل، دنیا بھر میں خاندانی شیرازہ بندی کی شکست، عورت اور مرد کے باہمی رشتوں کا انتشار، عدمِ تحفظ اور تنہائی کے خوف کے زیر اثر فرد کی آزادی، انسانی مساوات انصاف، جبر وتشدد کا شکوہ اور فریاد، سماجی رشتوں کی از سرِ نو تشکیل وتعمیر

وجود کے اثبات اور ذات کی شناخت کا سوال، پدرسری سماج میں مرد کی بالادستی کے خلاف عورت کی آزادی اور حقوقِ نسواں کی برآری کا مطالبہ وغیرہ وغیرہ۔ غالباً یہی وہ محرکات و بنیادی تصورات تھے جن کے زیرِ سایہ مغرب میں تانیثیت پروان چڑھی۔

تانیثیت فرانس، امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور جانے کہاں کہاں کی سیر کرکے ہمارے ملک میں انیسویں صدی میں داخل ہوئی اور تھوڑی سی تطہیر کے ساتھ 'تحریکِ اصلاحِ نسواں' کہلائی۔ پھر جب مردِ مصلحین کے ساتھ ساتھ اس میں باشعور تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین نے شمولیت اختیار کی تو وہ بیسویں صدی میں اپنے واضح نقوش کے ساتھ پہچانی جانے لگی اور اکیسویں صدی میں ادب اور میڈیا دونوں کے وسیلے سے فیس بک اور ورڈز اَپ کی طرح، باہر کام کرنے والی اور ٹی وی سیریل دیکھنے والی گھریلو خواتین میں بھی مقبول ہوگئی۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ دنیا کی کسی اور زبان کے ادب میں عورت سے ناانصافی ہوئی ہو تو ہوئی ہو، اُسے نظرانداز کیا گیا ہو تو شاید کیا گیا ہو، لیکن جہاں تک اردو زبان کے ادب کا سوال ہے، اس میں عورت کو کبھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ شاعری ہو یا فکشن ابتدا سے تا حال عورت ہمارے ادب کا ایک اہم، بنیادی، قابلِ ذکر، لائقِ توجہ، کشش انگیز اور مرکزی کردار رہی ہے۔ یعنی کرشن چندر نے آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ صد فی صد صداقت پر مبنی ہے۔ شاعر اور افسانہ نگاروں کو تو چھوڑیے، ہمارے نقاد اور تذکرہ نگار بھی لکھاری خواتین کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ مانا کہ تانیثی تنقید لکھتے وقت کہیں صنفی، علاقائی، مسلکی یا نظریاتی عصبیت کے سبب کبھی کبھی دانستہ یا نادانستہ کچھ genuine خواتین نظرانداز بھی ہوئی ہیں، مگر کم کم ہی سہی، خواتین ادیبوں کا ذکر مل ہی جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مرد ادیب اور نقاد دوسری زبانوں کے مرد ادیبوں اور نقادوں سے نسبتاً زیادہ کشادہ نظر اور وسیع الخیال رہے ہیں۔ منشی پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، شرر، راشد الخیری، رسوا اور شاد عظیم آبادی سے لے کر بیدی، منٹو، بلکہ اس کے بعد آج غضنفر، شموئل احمد، پیغام آفاقی اور مشرف عالم ذوقی تک اور نقادوں کی بات ٹھہری تو سید محمد عقیل، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، ناصر عباس، فضیل جعفری، ابوالکلام قاسمی، زبیر رضوی، عتیق اللہ، دیویندر اسر، بلراج کومل اور قاضی افضال تک کسی سے بھی ہماری خواتینِ ادب کو مغربی خواتین کی طرح کسی قسم کا کوئی گلہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ چند بندھے ٹکے نظریات اور نپے تلے پیمانوں کے تحت جس طرح ہم ایک عرصے سے فراق، ناصر کاظمی، شکیب جلالی کو میر کے بہتر نشتروں کے عزاخانے میں، یگانہ، فیض، مجروح، حسن نعیم اور سید امین اشرف و غالب کے مے کدہ خیال میں سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور حیات اللہ انصاری کو پریم چند کے فکری کھلیانوں میں تلاش کرنے کے عادی ہیں، بالکل اسی طرح ہم معاصر شاعرات بلکہ ہر شاعرہ کو یا تو پروین شاکر کے حزنیہ رومان اور اپنے بے وفا محبوب کے آگے والہانہ بلکہ معصومانہ خودسپردگی کے خلوت خانوں میں ڈھونڈتے ہیں یا کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی باغیانہ جرأت و بے باکی سے پرنسائیت اور تانیثیت کی اچھی بری کتھاؤں کے حرف زاروں میں۔ مگر کرشن چندر قدرے مختلف ہیں۔ کرشن چندر کو کرشن چندر کے آئینے میں ہی دیکھنا پڑے گا: ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے!!

کرشن چندر کے تانیثی افکار کچھ مختلف ہیں۔ وہ تو اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا کا تقریباً ہر کام طبقۂ اناث کا مرہونِ منت ہے۔ مثلاً انسان کو کھیتی باڑی کرنا سب سے پہلے عورت نے سکھایا۔ چاول بھی عورت کی دریافت ہے۔ پودوں اور درختوں کے بیج عورت نے دریافت کیے۔ روٹی پکانے کا فن بھی عورت کی ایجاد ہے اور تو اور کرشن کا خیال ہے کہ انسان نے اپنی سب سے پہلی کہانی کسی عورت یعنی نانی، دادی یا ماں سے سنی ہوگی جو اُس کے بچپن میں رات کے اندھیرے اور سناٹے کے خوف سے بچانے اور زندگی کا حوصلہ پیدا کرنے کی غرض سے اسے سنائی گئی ہوگی اور اس طرح لوری، گیت، شاعری اور کہانی کے فن کا آغاز عورت کے ہاتھوں ہوا۔ وہ تو سارے مرد ادیبوں کو جن میں چیخوف، شولوخوف، موپاساں، مام، پریم چند، منٹو اور بیدی جیسے نام شامل ہیں رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب بعد میں آئے، پہلے تو ایک عورت آئی تھی۔ آج بھی کوئی کہانی عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور نہ ہی دل چسپ سمجھی جا سکتی ہے۔[2] اور اپنے اس بیان کی دلیل میں وہ میرابائی، سیفو، ایملی برانٹے، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مہادیوی ورما اور امرتا پریتم جیسی خواتین لکھاریوں کے نام پیش کرتے ہیں۔ اب اگر انھیں تانیثی نقاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ بین الاقوامی شہرت یافتہ تانیثی مفکرین نیز تحریکِ نسواں کے مخالفین عورت اور مرد کی صنفی تفریق کو حیاتیاتی، عضویاتی، نفسیاتی، معاشیاتی اور سماجیاتی — کسی بھی پہلو سے کیا کچھ کہتے رہے ہیں اور نہ ہی اس بات سے دل چسپی ہے کہ کرشن چندر بھگوان یا خدا کو مانتے تھے یا نہیں۔ وہ مومن تھے یا ملحد۔ مگر اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطرت کے قائل تھے۔ اسی لیے عورت اور مرد کی تخلیق کے باب میں ان کے افکار اوروں سے الگ ہیں۔ ملاحظہ ہو، وہ کس طرح بعض مفکرین کے نظریات کو مسترد کرتے ہیں:

''فطرت نے یکسانیت کو توڑنے کے لیے تضاد کے عمل کو تجویز کیا اور روشنی اور اندھیرا، پانی اور آگ، مرد اور عورت ظہور میں آئے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ مرد اور عورت صرف بچہ پیدا کرنے کے لیے مامور کیے گئے ہیں، ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے ہاتھ میں بچہ پیدا کرنے کی طاقت ہوتی... یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ امیبا کی طرح چلتے چلتے میرے دو ٹکڑے ہو جاتے اور ایک کرشن چندر کو لا ہے کو چلا جاتا اور دوسرا املاڈ کو۔ الگ الگ، اپنی ذات میں مکمل اور خود مختار۔ مگر فطرت نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے مرد اور عورت بنائے ان میں تضاد رکھا۔ کھنچاؤ اور کشش۔ اس کشش سے وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے۔ ساتھ رہنے سے گھر بنا۔ گھر کے لیے محنت کی گئی۔ محنت سے سماج پیدا ہوا اور سماج سے معاشرہ۔ یہ پیچیدہ خوب صورتی ایک دوسرے میں گتھی ہوئی، ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہوئی وہ لچک اور توازن نہ پیدا کر سکتی، اگر انسان اکیلا ہوتا اور خود ہی دُہری جنس کا حامل ہوتا۔ عورت کی تخلیق کائنات کی رمزیت کی طرف ایک

کرشن چندر نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آخری برسوں میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے پہلے افسانے 'یرقان' (مطبوعہ 'ادبی دنیا' لاہور 1936، سال نامہ) سے لے کر ان کی آخری تحریر، ناول 'فٹ پاتھ کے فرشتے' تک جو ماہ نامہ 'بیسویں صدی' میں بالاقساط جنوری 1977 تک شائع ہوتا رہا، یعنی چالیس سال کے اس شاداب و زرخیز، طویل ادبی سفر کے دوران ایک یادگار دن وہ بھی آیا جب 1975 کے سال خواتین کا عالمی سال قرار دیا گیا اور ہر سال 8 مارچ کو 'یومِ خواتین' کے نام سے مخصوص و منسوب کر دیا گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہی 8 مارچ 1977 'خواتین کو آرٹ کا مرکزی نقطہ' قرار دینے والے بین الاقوامی شہرت یافتہ فن کار کرشن چندر کا یومِ وفات ہے۔ عورت کے حقوق و آزادی پر مر مٹنے کی اس سے زندہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے!''

نہایت ہی لطیف اشارہ ہے۔"[3]

اس پر مارکس کی معاشی جدلیات کا اثر سہی، حقیقت تو یہ ہے کہ کرشن چندر کی کہانیوں کی آرٹ گیلری میں عورتوں کی کمی نہیں۔ ابتدا سے آخر تک اُن کی ساری تحریریں اٹھا کر دیکھ لیجیے، حسنِ زن اور حسنِ ظن سے معمور ملیں گی۔ وہ اپنی کہانیوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک عورت کہیں نہ کہیں سے اٹھالاتے ہیں۔ کشمیر کی شاداب وادیوں اور پنجاب کے مرغ زاروں میں تو یہ کام ان کے لیے بہت آسان تھا، دہلی، حیدر آباد، ممبئی، پونے بلکہ پورے ہندوستان میں ان کی یہ تلاش جاری رہتی ہے۔ مزدور عورتیں، چرواہیاں، کسان عورتیں، گوجریاں، دفتر میں کام کرنے والی عورتیں، گھر کی نوکرانیاں، غریب پتی ورتائیں، سوشل کانٹیکٹ بیویاں، خانہ بدوش عورتیں، رقاصائیں، طوائفیں اور کال گرلز یہاں تک کہ غیر ملکی عورتیں سیاحوں کی صورت میں کسی نہ کسی ہوٹل، بارٹی یا کلب میں انھیں مل ہی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اُن کے حُسن کا بیان اور بکھان کرسکیں۔ اور صرف جوان ہی نہیں، بوڑھی عورتیں بھی اپنے کردار کا حسن بکھیرتی دکھائی دیتی ہیں جیسے تائی ایسری۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں بدصورت عورتیں نہیں ملتیں۔ بدصورت عورتیں بھی ضرور ہیں لیکن ان میں بھی وہ کوئی نہ کوئی جسمانی حسن، شخصیت کی کوئی کشش، کوئی خاص ادا یا خوبی دکھا کر انھیں قابلِ دید اور لائقِ توجہ بنا دیتے ہیں اور جب کہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ فطرت میں — مثلاً گلہری میں، زعفران اور گلاب کے پھول میں، جنگل کی ہرنی میں، جلتی ہوئی شمع میں، مچھلیوں اور تیتریوں میں، چاندنی کی کانپتی ہوئی شعاعوں میں، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں میں، شور مچاتی ہوئی پن چکیوں میں، یہاں تک کہ یوکلپٹس کی ڈالی میں کسی خوب صورت دوشیزہ کی قیامت خیز ادائیں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔

یہاں قاری کو یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ عورت کا جسم اور وہ بھی خاص طور پر خوب صورت عورت کا جسم شاید کرشن چندر کے قلم کی کم زوری ہے۔ یہ عورت دیہات کی ہو یا شہر کی، پہاڑی ہو یا قبائلی، گھریلو ہو یا سوسائٹی گرل، جاہل ہو یا تعلیم یافتہ — ان کی نظر عورت کے جسمانی خدوخال پر رہتی ہے۔ گویا عورت کو کرشن چندر ایک مصور کی نگاہ سے نہارتے ہیں۔ ایک سنگ تراش یا مجسمہ ساز کی نظر سے آنکتے ہیں اور ایک شاعر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں افسانہ نگار کرشن چندر تو کہیں گم ہوتا نظر آتا ہے۔ عورت کے حسن میں کھو کر کہانی کا پلاٹ تک بھول جاتا ہے۔ کبھی رومانی مکالمے اور کبھی شاعری پر اُتر آتا ہے۔ یہ رومانیت جو اُن کے ذوقِ جمال کی پروردہ ہے، کرشن کے قلم سے کبھی دور نہیں ہوتی اور کرشن بھی کبھی اُس سے روگردانی نہیں کرتے۔ انھیں ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ ڈور ہاتھ سے چھوٹی تو تاثیر و تاثر کی ساری مالا بکھر جائے گی اور اس کی فنی آب و تاب جاتی رہے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ کرشن ہوس کار نہیں محض حسن پرست بھی نہیں۔ عورت سراپا اُس کے سامنے ہو، مگر اس کے جسم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو کرشن کو بے حد پاکیزہ نظر آتا ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی بہت سی کہانیوں مثلاً 'مرزا گپّی'، 'کوکھ کی کونپل' اور 'جب کھیت جاگے' وغیرہ میں کیا ہے۔ وہ حصہ جس سے ایک شیر خوار بچہ، ممتا کے آنچل تلے، اپنی زندگی کا رزق حاصل کرتا ہے اور وہ عورت جس پر جنت سے نکلوانے کا الزام ہے، کرشن اسی کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

یہاں بے ساختہ منٹو یاد آجاتے ہیں جو ایک جسم فروش گھناؤنی عورت میں بھی ممتا کی پاکیزگی دیکھ لیتے تھے۔ ان کے افسانے 'ڈرپوک'، کا ایک کردار یہ کہتا دکھائی دیتا ہے:

"تم عورت، عورت پکارتے ہو، عورت ہے کہاں؟ مجھے

> کرشن چندر کی کہانیوں کی آرٹ گیلری میں عورتوں کی کمی نہیں۔ ابتدا سے آخر تک اُن کی ساری تحریریں اٹھا کر دیکھ لیجیے، حسنِ زن اور حسنِ ظن سے معمور ملیں گی۔ وہ اپنی کہانیوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک عورت کہیں نہ کہیں سے اٹھا لاتے ہیں۔ کشمیر کی شاداب وادیوں اور پنجاب کے مرغ زاروں میں تو یہ کام ان کے لیے بہت آسان تھا، دھلی، حیدرآباد، ممبئی، پونے بلکہ پورے ہندوستان میں ان کی یہ تلاش جاری رہتی ہے۔

تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی، جو میری ماں تھی۔ مستورات البتہ دیکھی ہیں۔"

لیکن کرشن چندر ماں کے علاوہ ایک اور عورت میں بھی پاکیزگی کا یہی انداز پاتے ہیں۔ عورت کی لطافت کا پہلا سبق جو انھیں اپنی بہن چندر مکھی سے ملتا ہے اور وہ سوچتے ہیں یہ بہن ہی ہے جو مرد کو عورت کی بنیادی تہذیب اور شرافت سے آگاہ کرتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ عورت کو محض ایک sexual object نہیں سمجھتے، جس کا گِلہ ہماری تانیثی ادیباؤں کو ہے۔ عورت کچھ اور بھی ہے۔ وہ تائی ایسری ہے جو سرتاپا شفقت ہے۔ 'چینی پنکھا' میں وہ عورت کو ایک اوباش، آوارہ ویٹرس نہیں، بلکہ ایک باوفا ماں کے روپ میں پیش کرتے ہیں جو اپنے بچے کو کبھی نہیں بھولتی۔ 'خوشی' کا ہیرو، ہیروئن سے شادی کا خواست گار نہیں، بلکہ ماں یا بھائی بہن کا رشتہ چاہتا ہے۔

کرشن چندر نے صرف عورت سے محبت نہیں کی ہے، اس کی مظلومیت کو بھی سامنے رکھا ہے۔ صرف اُس کے خدو خال کی تعریف نہیں کی، بلکہ اُس نازک، حسین، دل کش پیکرِ جمال کے پسِ پردہ وہ کریہہ منظر بھی دیکھا اور دکھایا ہے، جس کے سبب یہ معصوم حسن تباہ و برباد ہو رہا ہے استحصال کا شکار ہو رہا ہے۔ کرشن چندر کی تانیث اسی کریہہ منظر کی تصویر کشی میں پوشیدہ ہے اور اس حقیقت کی غماز ہے کہ سماج نے عورت کو یہ باور کرادیا ہے کہ وہ صنفِ نازک ہے اور اس لیے کم زور ہے اور چونکہ وہ کم زور ہے لہٰذا مرد اُس کا استحصال کر رہا ہے۔ کرشن چندر کی آواز دراصل عورت کی حمایت میں اور مرد کے جبر و تشدد کے خلاف بغاوت میں بلند ہوتی ہے۔ یوں کرشن چندر کی تانیثیت، مارکسی تانیثیت کا اعلامیہ بن جاتی ہے جس کا نظریہ ہے کہ سماج میں عورتوں پر جو ظلم و استبداد ہوتا ہے، اس کی اصل جڑ طبقاتی تقسیم ہے۔ عورت اور مرد دو الگ الگ طبقے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مرد کو طاقت ور اور عورت کو کم زور طبقہ بنا دیا ہے۔ اس کے سبب عورت بھی مرد کا سرمایہ، جنس اور جائداد بن کر رہ گئی ہے۔ اس لیے عورت کو اس جبر و استحصال سے نجات دلانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس کے لیے عورت کو خود معاشی میدان میں آنا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کو آزمانا اور منوانا ہوگا۔ کرشن چندر نے اپنے معاشرے کی اسی بے اعتدالی کو اپنی کہانیوں کا موضوع اور طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یوں ان کی رومانیت تلخ اور کرب آمیز سماجی حقیقت نگاری میں ڈھل گئی ہے۔ 'طلسم خیال'، 'ٹوٹے ہوئے تارے'، 'نظارے' اور 'زندگی کے موڑ پر' کی کہانیوں خصوصاً کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں میں یہ کرب کچھ زیادہ ہی تانیثی رنگ اختیار کرگیا ہے۔ رومان اور حقیقت کا ٹکراؤ انھیں ایک ایسے موڑ پر لے آتا ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ انگارہ بن جاتا ہے جب وہ اس ماحول میں سماجی نابرابری، ذات پات کی تفریق اور مذہبی افتراق، فضول رسموں اور روایتوں کی شکار بے بس لڑکیوں کو تڑپتے، سسکتے اور بلک بلک کر مرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جب وہ سرمایہ دارانہ نظام کی قبیح روایتوں کے آگے عورت کے جسم اور روح کی سودے بازی دیکھتے ہیں۔ جب چھچھورے قسم کے شادی شدہ مرد اپنی بیویوں کے سامنے ایک حسین بیوہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، جب فسادات میں ایک بے بس مسلم لڑکی کی اجتماعی آبروریزی کی دوڑ میں ہوس کاروں اور درندوں کی ایک لمبی قطار دیکھتے ہیں جو اپنے اپنے 'نمبر' کے منتظر ہیں۔ جب رُکمنی جیسی خوب صورت غریب بیوہ کو ایک پچاس سال کا بوڑھا امیر برہمن بیاہ کر لے جاتا ہے۔ جب عیاش شوہر کے گھر سے غافل رہنے کے باوجود بھی اولاد سے محروم ایک بیاہتا، پتی

ورنہ عورت تائی ایسری زندگی بھر اوروں پر اپنی ممتا لٹاتی ہے اور چپ چاپ قبر کی گود میں جا سوتی ہے۔ جب خانہ بدوش عورتیں پاپی پیٹ کی خاطر شام ہوتے ہی سرمایہ داروں کی عیاشی کا سامان بن جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو خود اُن کے اپنے مرد، باپ، بھائی یا شوہر انھیں بیچتے ہیں یا بِک جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ تانیثی ادیبہ، کیٹ ملے Kate Mille نے اسی مسئلے کے خلاف آواز اٹھائی تھی کہ عورت کوئی جائداد نہیں کہ وہ صرف معاشی امداد کے لیے کسی بھی مرد سے جنسی رفاقت پر مجبور ہو۔ کرشن چندر نے تانیثی فکر کے اسی مسئلے کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے اور ضرورت پڑی ہے تو ایسی مجبور عورتوں کو باغی بنا دیا ہے۔ مثلاً 'چابک' کی رجنی، 'پریتو' کی پریتو، 'شکست' کی چندرا، 'جنت و جہنم' کی زینی اور 'دل کسی کا دوست نہیں' کی فلرٹ ہیروئن۔

بہت سی خواتین ادیباؤں کو یہ شکایت ہے کہ عورت کو جنسی شے سمجھ کر انھیں تنگ کیا جاتا ہے۔ خواتین کا ان کے اپنے جسم پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ Alison faggan شاکی ہے کہ کوئی دوسرا یہ طے کرتا ہے کہ اُسے کتنے بچے پیدا کرنے چاہئیں یا بچے پیدا بھی کرنے چاہیے یا نہیں۔ یوں عورت کی اپنی مرضی سے تولیدی عمل کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور بہت سی خواتین کو انقطاع حمل Stenilisation اور اسقاط حمل Abortion پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کرشن چندر کے ناول 'چاندی کا گھاؤ' کی ہیروئن بلبل اسی المیے کا شکار ہوتی ہے۔ اس کا شوہر اس لیے اس کا اسقاط کرواتا ہے کہ وہ مزید کچھ دنوں ہیروئن بن کر، فلمی مارکیٹ میں رہ کر، اسے روپیہ کما کے دے سکے۔

تانیثی ادیبہ بیٹی فرائیڈن ہی نہیں کرشن چندر نے بھی زور و شور کے ساتھ یہ سوال اٹھایا ہے کہ شوہر، بچوں اور گھر کی ذمے داریوں میں الجھ کر عورت اپنا تشخص کھو چکی ہے، جب کہ وہ محض ایک Happy House wife Heroine بن کر نہیں رہ سکتی۔ اُسے تعلیم، ملازمت اور پیشہ ورانہ کیریئر کے مواقع بھی ملنا چاہئیں ورنہ اس کی شخصیت گھٹ کے رہ جاتی ہے اور صلاحیتوں کا خون ہو جاتا ہے۔ 'زندگی کے موڑ پر' کی پرکاش وتی جو شاعرہ بھی ہے، گلوکارہ بھی ہے، ادیبہ بھی ہے، جو اپنے ہم خیال و ہم ذوق رفیق حیات کے خواب سجائے بیٹھی ہے، بلدی کے ایک بیوپاری سے زبردستی بیاہ دی جاتی ہے۔ تو وہ اپنے غم گسار ساتھی پرکاش سے بڑی بے بسی سے کہتی ہے:

''خیر نہیں پڑھا کر، سکھا کر، اور ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ہمیں ماں باپ ذبح کیوں کر ڈالتے ہیں؟''

تب اُسے حوصلہ عطا کرتے ہوئے کرشن چندر 'پرکاش' کے وسیلے سے خواتین کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ:

''دیکھو جب تک تم خود نہ اُڑو۔ اپنے پر نہ پھڑپھڑاؤ۔ یہ زمین تمھیں اُڑنے نہ دے گی۔''

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ سماج نے آزادی کی خواہاں عورت کو سرمایے کی افزودگی کا ذریعہ بنا دیا۔ اُسے یہ خواب دکھایا کہ اگر عورت اپنے جسم کا صحیح استعمال کرے تو وہ خود کفیل ہو سکتی ہے۔ شدت پسند تانیثیت اس فریب کا شکار ہوگئی۔ سماج میں طوائف اور کال گرل جیسے اداروں کی تشکیل ہوئی۔ دوسری طرف عورت کے جسم کو تشہیر کا سامان بنا دیا گیا۔ شخصی آزادی کے زعم میں فریب خوردہ عورت نے بھی جسم کی نمائش شروع کی اور بہت سی تجارتی کمپنیوں کے پراڈکٹس کی فروخت اور منافع میں عورت کام آئی۔ یوں مقابلۂ حسن کا آغاز ہوا۔ کرشن چندر تانیثیت کی اس شدت پسندی کے مخالف ہیں جو عورت کے استحصال کا سبب ہے۔ 'ایک گدھے کی سرگزشت' میں انھوں نے گدھے کی زبانی، جو جج کے فرائض انجام دینے کے لیے

میں سمجھتا ہوں حسن کے پرکھنے کا یہ معیار غلط ہے۔ ایک عورت کا حسن اس کے عمل سے پہچانا جاسکتا ہے۔ عورت کوئی خلا میں رکھی جانے والی چیز نہیں ہے۔ اسے عورت کے ماحول سے الگ کرکے؟ ایک غسل کرنے والے تالاب کے کنارے کھڑا کرکے ناپا نہیں جاسکتا۔ حسن کوئی مصری ممی کی طرح حنوط شدہ لاش نہیں ہے مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگ مقابلۂ حسن میں کان کی لو دیکھتے ہیں مگر اس آواز کو نہیں سنتے جو اس کان کے اندر جاتی ہے۔

مدعو کیا گیا ہے، اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب میں کہلواتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں حسن کے پرکھنے کا یہ معیار غلط ہے۔ ایک عورت کا حسن اس کے عمل سے پہچانا جا سکتا ہے۔ عورت کوئی خلا میں رکھی جانے والی چیز نہیں ہے۔ اسے عورت کے ماحول سے الگ کر کے؟ ایک غسل کرنے والے تالاب کے کنارے کھڑا کر کے ناپا نہیں جا سکتا۔ حسن کوئی مصری ممی کی طرح حنوط شدہ لاش نہیں ہے مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگ مقابلۂ حسن میں کان کی لو دیکھتے ہیں مگر اس آواز کو نہیں سنتے جو اس کان کے اندر جاتی ہے۔ آپ آنکھ دیکھتے ہیں مگر آنکھ کی شرم نہیں دیکھتے۔ سینے کا ابھار دیکھتے ہیں مگر اس کے اندر چھپی ہوئی ماں کی ممتا نہیں دیکھتے۔ اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کا یہ مقابلۂ حسن مکمل فراڈ ہے۔ دھوکا ہے۔ جعل سازی ہے۔ بددیانتی ہے۔''4

بظاہر ہمارے دیگر ادیبوں کی طرح کرشن چندر بھی براہِ راست تانیثی تحریک کے کسی بھی گروہ سے وابستہ نہیں رہے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں ایسی تحریکوں نے باقاعدہ سر اٹھایا ہی نہیں۔ تانیثیت ہندوستان اور اردو ادب دونوں میں اصلاحِ معاشرہ کی صورت میں زیادہ رہی جس میں فلاحِ نسواں پر زیادہ زور ملتا ہے، بہ نسبت آزادی نسواں کے۔ ہمارے سماجی، سیاسی رہ نما اور صاحبانِ قلم — ان سب کا مقصد عورت کو سماج میں جائز مقام دلانا تھا اور یہ سب کے سب ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایات سے وابستہ تھے۔ کرشن چندر بھی ترقی پسند ضرور تھے۔ عورتوں کے حق میں وہ سماج کی فرسودہ روایات کا خاتمہ چاہتے تھے لیکن وہ بھی عورت کو مغربی تانیثیوں کی طرح 'بے لگام' دیکھنے کے مخالف تھے۔ وہ عورت کو عورت ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ گو انھوں نے جبر و تشدد اور استحصال کے خلاف آواز ضرور اٹھائی۔ لیکن یہ ذمے داری وہ سماج پر، مرد مرکوز، پدرسری سماج پر ہی ڈالتے ہیں گویا براہِ راست وہ سماج کے مردوں اور خصوصی طور پر اُن باپوں پر جو اپنی باصلاحیت بیٹیوں کی زندگی کا سودا آنکھ بند کر کے کر دیتے ہیں۔ کرشن چندر نے عورت کے تئیں اس درد کو اپنی کہانیوں میں سموتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا:

''بہ حیثیت مجموعی میں ایک ایسے سماج کی تصویر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں عورت کی شخصیت اور اس کے مرتبے کا پورا پورا احترام کیا جا سکے۔ جہاں اُسے مرد کے برابر معاشی، سیاسی اور اخلاقی درجہ حاصل ہو سکے۔ جہاں اُسے ڈرائنگ روم کی تتلی، کچن کی قیدی، منڈی کی بکاؤ چیز ہی نہ سمجھا جائے۔ بلکہ ایک انسان سمجھ کر اس کا احترام کیا جائے اور اس کی شخصیت کو آگے بڑھانے میں تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں۔''5

حوالہ جات

(1) ماہ نامہ 'شاعر' کرشن چندر نمبر 1942، جلد 38، شمارہ 3-4
(2) کہانی کی کہانی
(3) آئینہ خانے میں: مشمولہ کرشن چندر اور ان کے افسانے مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ص 18
(4) ایک گدھے کی سرگزشت، ص 61
(5) احمد حسن سے انٹرویو: 'شاعر' کرشن چندر نمبر 1967، جلد 38، شمارہ 3-4

1. A Vindication of the rights of Women by Mary Wolstoncraff ISB No.7607.54942 published by Barnes, Noble Books United State of America, 1357910864
2. The Feminism Mystique by Betty Friedan ISB No. 393-32257-2pbk.w.w.noton Company New York, n.y.10110
3. The Female Eunch by Germain Greer ISB No.-13-978-0-37452762-4 New York 10003 Originally Published : London

Rafia Shabnam Abdi, A/502, Sunrise, Aram Nagar 2, Sat Bangla Mumbai - 400061 (MS)

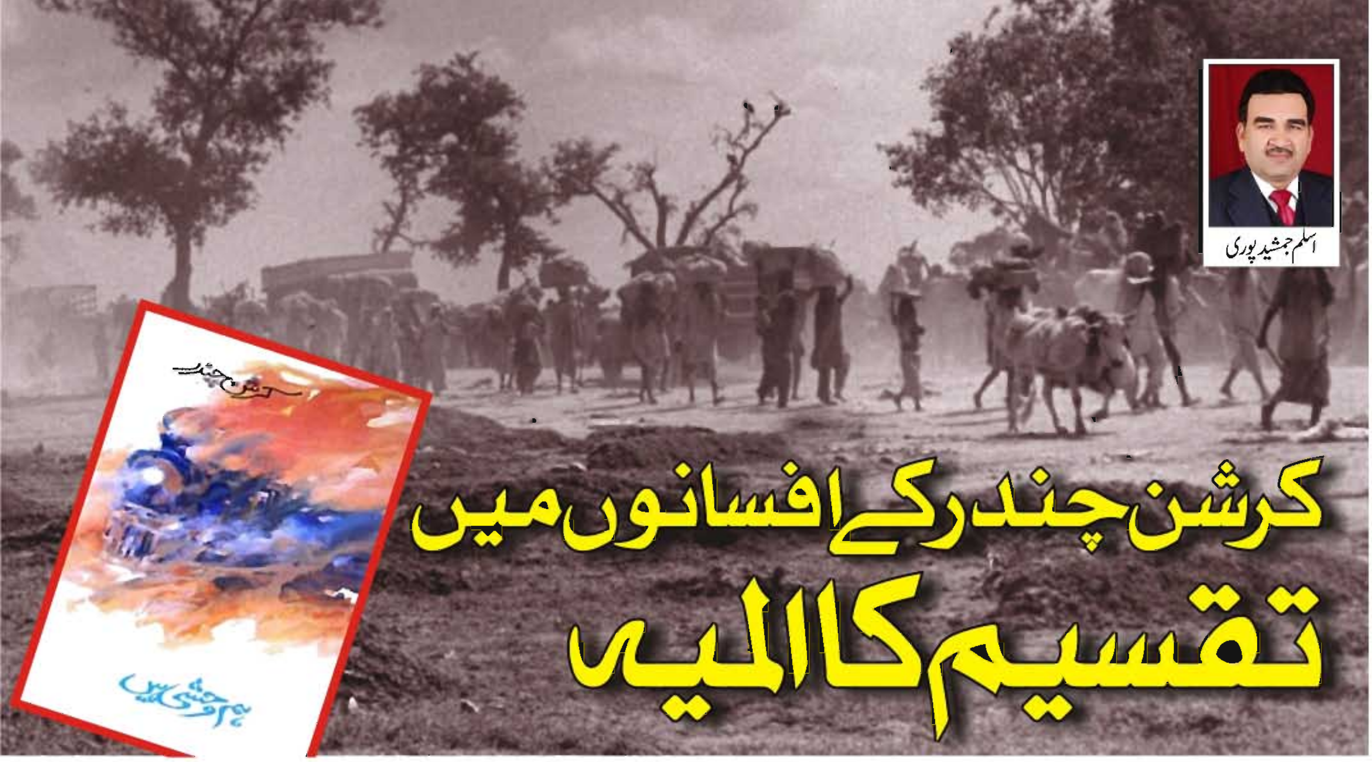

اسلم جمشید پوری

کرشن چندر کے افسانوں میں تقسیم کا المیہ

کرشن چندر نے تقسیم کے المیے پر سب سے پہلے افسانے تحریر کیے۔ ان کے ایسے افسانوں کا مجموعہ 'ہم وحشی ہیں' 1947 نومبر میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت نے افسانہ نگاروں، ناول نویسوں کو اس موضوع کی طرف رغبت دلائی اور پھر ایک ماحول بنتا گیا۔ اردو کے تقریباً سبھی بڑے افسانہ نگاروں نے فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت، قتل و غارت گری اور تقسیم کے درد پر افسانے قلم بند کیے۔

'ہم وحشی ہیں' کے سارے افسانے 47 کے درد کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان افسانوں میں کرشن چندر کے کیمرے نما قلم نے ان واقعات کو قید کر لیا ہے اور قاری جب انھیں پڑھتا ہے تو وہ صرف پڑھتا نہیں بلکہ اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ مجموعے کے سبھی افسانے 'جانور'، 'دوسری موت'، 'امرتسر آزادی سے پہلے'، 'پشاور ایکسپریس'، 'ایک طوائف کا خط'، 'لال باغ'، 'جیکسن'، 'اندھے' تقسیم کے المیے کے تعلق سے اردو کے شاہکار افسانے ہیں۔

'امرتسر آزادی سے پہلے امرتسر آزادی کے بعد' کرشن چندر کا تقسیم ہند کے المیے پر تحریر کردہ بے مثال افسانہ ہے۔ اس میں کرشن چندر نے فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے امرتسر میں آزادی سے قبل کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ جب ہندو اور مسلم سب مل جل کر، ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرتے، ایک دوسرے کے غموں کو بانٹتے، خوشیاں ساتھ مناتے۔ انگریزوں کے مظالم کا ایک ساتھ مقابلہ کرتے۔ خصوصاً جلیان والا باغ کا ایک واقعہ، جسے کرشن چندر نے اپنے قلم سے زندہ کر دیا ہے کہ جب جنرل ڈائر کے حکم سے ہندوستانیوں پر گولیاں برسائی گئیں تو بہت سے لوگ جائے واقعہ پر ہی موت سے گلے ملے جب کہ کچھ نے ادھر اُدھر کودنے، بھاگنے کی کوشش کی۔ باغ میں صدیق اور اوم پرکاش دو دوست بھی تھے۔ صدیق نے اپنی پیٹھ کو سیڑھی بنا کر اوم پرکاش کو دیوار پھاندنے میں مدد کی۔ لیکن اوم پرکاش انگریزوں کی گولی سے نہ بچ سکا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گولی صدیق کو بھی لگی لیکن وہ کسی طرح رام پرکاش کی لاش کو اس کے گھر تک لے آتا ہے اور خود بھی وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ افسانے میں اسی طرح کا ایک اور واقعہ درج ہے۔ چار سہیلیاں بیگم، شام کور، پارو اور زینب ایک ساتھ بازار سے لوٹ رہی تھیں تو انگریز سپاہیوں نے انھیں یونین جیک کو سلام کرنے اور گھٹنوں کے بل گلی پار کرنے کا حکم دیا۔ چاروں کو ذلت محسوس ہوئی، ہمت اور حوصلے نے ساتھ دیا اور چاروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، بس پھر کیا تھا، گولیوں نے انھیں لقمہ بنا لیا یہ واقعات آزادی سے قبل کے امرتسر کے تھے جب ہندو، مسلم، سکھ اتحاد، عوام کی طاقت تھا۔ لیکن آزادی کے بعد تقسیم کے بعد کیا ہوا؟ سارا منظر ہی بدل گیا۔ اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ پڑوسیوں نے پڑوسیوں کو قتل کیا، عورتوں لڑکیوں کی آبرو ریزی کی گئی۔ مکان اور دوکان نذر آتش کر دی گئیں، ٹرینوں کو روک روک کر دونوں طرف کے لوگوں نے قتل عام کیا۔ صدیق اور اوم پرکاش، اور بیگم، شام کور، پارو، زینب کی روحوں کو ایذا پہنچایا۔ کرشن چندر سوال کرتے ہیں کہ کیا صدیق اسی دن کے لیے اپنے دوست کی لاش اس کے گھر لایا تھا، کیا اس نے اوم پرکاش کے ساتھ اسی لیے جان دی تھی، کیا زینب اسی دن کے لیے ملک پر قربان ہوئی تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مجھے مت اٹھاؤ، میں یہیں مروں گی۔ اپنی بہو بیٹیوں کے بیچ، کیا کہا تم نے کہاں چوٹ آئی ہے۔ چوٹ۔ ارے بیٹا! یہ چوٹ بہت گہری ہے۔ یہ گھاؤ دل کے اندر ہے۔ بہت گہرا گھاؤ ہے۔ تم لوگ کیسے اس سے پنپ سکو گے۔ تمھیں خدا کیسے معاف کرے گا۔ پہلے انھوں نے ہمارے مردوں کو مارا، پھر ہمارے گھر لوٹے، پھر ہمیں گھسیٹ کر گلی میں لے آئے اور اس گلی میں اس فرش پر اس مقدس گردوارے کے سامنے جسے میں ہر روز سر جھکایا کرتی تھی، انھوں نے ہماری عصمت دری کی اور پھر ہمیں گولی سے مار دیا۔ میں تو ان کی دادیوں کی عمر کی تھی۔ انھوں نے مجھے بھی معاف نہیں کیا۔ تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں زینب کی ماں ہوں، تو جانتا ہے زینب کون تھی جس نے جلیان والے روز اس گلی میں گورے کے آگے سر نہیں جھکایا جو اپنے ملک اور قوم کے لیے سر اونچا کیے اس گلی سے گذر گئی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں زینب شہید ہوئی تھی۔ میں اسی زینب کی ماں ہوں۔ میں اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ مجھے سہارا دو۔ مجھے کھڑا کر دو۔ میں اپنی لٹی ہوئی آبرو اور اپنی بہو بیٹیوں کی برباد عصمتیں لے کر لیڈروں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے سہارا دو میں ان سے کہوں گی، میں زینب کی ماں ہوں۔ میں امرتسر کی ماں ہوں۔ میں پنجاب کی ماں ہوں۔ تم نے میری گود اجاڑی ہے۔ تم نے بوڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے۔ میری جوان جوان بہوؤں و بیٹیوں کی پاک صاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی کیا زینب اسی آزادی کے لیے قربان ہوئی تھی۔''

(فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے، شیخ محمد غیاث الدین، ص 136-137، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس)

افسانہ 'جانور' بھی کرشن چندر کا تقسیم ہند کے المیے کو پیش

کرنے والا نمائندہ افسانہ ہے۔ کرشن چندر نے قارئین سے، انسانوں سے، ناقدین سے ایک اہم سوال کیا ہے۔ جانور کون ہوتا ہے؟ کیا وہ جو گائے، بھینس، بکری، اونٹ، شیر، ہاتھی کی شکل میں ہمیں دکھائی دے رہا ہے؟ یا وہ جس میں حیوانیت پائی جاتی ہے۔ جو سمجھ نہیں رکھتا، جسے صحیح اور غلط کی تمیز نہ ہو۔ جو رشتوں کو نہ پہچانے۔ جس کی عادت و خصلت میں درندگی ہو، جو غصے میں حیوان بن جاتا ہو تو پھر وہ جنگلوں میں رہنے والا چوپایا ہی نہیں انسان بھی ہو سکتا ہے اور انسان جب جانور بنتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ کرشن چندر نے اپنے اس افسانے میں ہمیں یہی باور کرایا ہے۔

جانور میں تین کردار ہیں۔ یہ سکھ، ہندو اور مسلمان ہیں۔ سردار سوڑھا سنگھ، احمد حمید اور دیس راج کوٹلی جہاں پوری انسانیت، فرقہ وارانہ فساد میں پارہ پارہ ہوئی، یہ تینوں بھی ان فرقہ وارانہ فساد کے شکار ہوتے ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتے ہیں۔ تینوں اپنی اپنی کہانی سنا رہے ہیں۔ دیس راج فساد کی زد میں ہے۔ اپنی بیوی، بچے اور باپ کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ فسادی پیچھا کر رہے ہیں۔ باپ جب تھک کر گر پڑا تو دیس راج نے بچے کو بیوی کے حوالے کیا اور باپ کو کندھے پر لاد لیا۔ بیوی کے پیر شل ہو گئے تو اس نے زندگی سے مایوس ہو کر بچہ واپس دیس کو دیا اور دریا میں کود گئی۔ دیس راج کی مظلوم آنکھیں بیوی کو موت کی آغوش میں جاتا دیکھتی رہ گئیں، وہ بھاگتا رہا بالآخر جب اس کے اندر طاقت جواب دے گئی تو اس نے بچے کو بھی دریا کے حوالے کر دیا۔ بچے کی دریا میں گرتے گرتے بلند ہونے والی چیخیں قاری کو ہلا دیتی ہیں۔ لیکن دیس راج باپ کو لیے جموں آجاتا ہے۔

سردار سوڑھا سنگھ نے فساد میں دوستوں کے ساتھ مل کر مسلمان مرد عورت کو نہر پر لے جا کر قتل کیا جو مسلمان نہر پر بچ گئے انھیں ایک بھٹے میں بند کر کے آگ لگا دی گئی۔ سوڑھا سنگھ نے موچی کے ایک بچے کو بے دردی سے بھٹے کی آگ میں پھینک دیا، اگلے دن سب جل کر خاک ہو گئے لیکن موچی کا بچہ ادھ جلا، بھٹے کے پاس مردہ پڑا تھا۔

احمد حمید زمین دار گھرانے کا ہے۔ وہ کانگریس کا ورکر ہے۔ گاندھی جی کا بھگت ہے لیکن جب یہ فساد شروع ہوئے حمید کی ساری سیاسی سرگرمیوں کے باوجود، حمید کے گھر والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ احمد حمید فوج لے کر اپنے گاؤں گھر والوں کو نکالنے پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے ملاحظہ ہو:

''تو انھوں نے اپنی نوجوان بیوی کی ناف میں ایک نیزے کو گھسے ہوئے دیکھا اور اس کے برفاب ماتھے پر کاغذ کا ٹکڑا تھا جس پر خونی الفاظ میں لکھا ہوا تھا ''نواکھلی کا بدلہ'' اور اس پر ہندوستان کا نقشہ تھا اور ان سب کے گرد ایک بڑا ''اوم'' بنا ہوا تھا اس لیے کہ وہاں سنتے ہیں اسی طرح کاغذ پر اللہ لکھا جاتا تھا۔''

اس واقعے نے حمید کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ اب وہ دوکاندار سے پان کا پتہ لے کر پوچھتا پھرتا ہے اس پر کیا لکھوں؟ اوم یا اللہ —

پورے افسانے میں کرشن چندر نے انسان کے 'جانور' بن جانے کو عمدگی اور فن کاری سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''اندھے'' میں کرشن چندر نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان جذباتی طور پر اندھا رہتا ہے تو پھر وہ آنکھیں رکھ کر بھی اندھا ہوتا ہے۔ کہانی کے متکلم کو جب پتہ چلتا ہے کہ بہار میں مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے تو وہ محلہ کوچہ پیر جہازی میں قتل و غارت گری پھیلاتا ہے۔ ہندوؤں کو نہ صرف ذلیل کرتا ہے بلکہ انھیں قتل کر کے دکانوں اور مکانوں کو نذر آتش کر دیتا ہے۔ لالہ کھتری رام، رام نرائن برہمن کے گھروں کی عورتوں کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے بچوں کو بھی آگ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ جب وہ لوٹ کر اپنے محلے آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے محلے کے مسلمانوں کو ہندوؤں نے قتل کر دیا ہے۔ خود اس کے گھر سبھی افراد قتل ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کی لاش پر قسم کھاتا ہے کہ میں کسی بھی ہندو کو نہیں بخشوں گا۔ پولس بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

> **جانور میں تین کردار ہیں۔ یہ سکھ، ہندو اور مسلمان ہیں۔ سردار سوڈھا سنگھ، احمد حمید اور دیس راج کوٹلی جہاں پوری انسانیت، فرقہ وارانہ فساد میں پارہ پارہ ہوئی، یہ تینوں بھی ان فرقہ وارانہ فساد کے شکار ہوتے ہیں۔ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتے ہیں۔ تینوں اپنی اپنی کہانی سنا رہے ہیں۔ دیس راج فساد کی زد میں ہے۔ اپنی بیوی، بچے اور باپ کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ فسادی پیچھا کر رہے ہیں۔**

'پشاور ایکسپریس' تقسیم کے المیے پر تحریر کردہ اردو کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ 'پشاور ایکسپریس' کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس افسانے کا مرکزی کردار کوئی فرد نہیں بلکہ ریل گاڑی ہے جو پشاور سے بمبئی تک کا سفر کرنے کا کام کرتی ہے۔ کرشن چندر نے ریل گاڑی کو وسیلہ بنا کر اپنے جذبات کا اظہار خوب صورت پیرائے میں کیا ہے۔ 'پشاور ایکسپریس' جو پشاور سے ہندوؤں کو لاد کر لے جا رہی ہے اور جسے ٹکشیلا راولپنڈی، گوجر خان، لاہور، مغل پورہ ہوتے ہوئے جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ ہوتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ کرشن چندر نے مخصوص فرقے کی عورتوں اور مظلوموں کے ساتھ ہر اسٹیشن پر جو شرمناک حرکتیں ہوئی ہیں اس کا منظر بڑی فن کاری سے کھینچا ہے۔ ٹکشیلا اسٹیشن پر ریل گاڑی کو روک لیا گیا۔ آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزیں گاڑی میں سوار ہونے کے لیے آرہے تھے۔ ایک گھنٹے انتظار کے بعد جب وہ لوگ قریب آئے تو میری (ریل گاڑی) روح کانپ گئی۔

''ہندو پناہ گزینوں کا جتھا دور سے آرہا تھا اور شاید لوگوں نے سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھا۔ جتھا دور سے آرہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ وقت گذرتا گیا۔ جتھا قریب آتا گیا۔ ڈھولوں کی آواز تیز ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آواز کانوں میں آئی اور لوگوں نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لیے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا جو آس پاس کے گاؤں سے آیا تھا اور گاؤں کے مسلمان لوگ اسے اپنی حفاظت میں لا رہے تھے۔ چنانچہ ہر ایک مسلمان نے ایک مسافر کی لاش کندھے پر اٹھا رکھی تھی جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ دوسو لاشیں تھیں مجمع نے یہ لاشیں نہایت ہی اطمینان سے اسٹیشن پر پہنچ کر بلوچی دستے کے سپرد کیں اور کہا کہ وہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندوستان کی سرحد پر لے جائے۔'' (ہم وحشی ہیں، ص98)

بات یہیں ختم نہیں ہوتی دوسو لاشوں کے بدلے ان لوگوں نے ٹرین کے بلوچی عملے سے دوسو ہندو اتارنے کو کہا کہ ان دوسو افراد کے چلے جانے سے ہمارا گاؤں ویران ہو جائے گا۔ بلوچی عملے نے ان کی وطن پرستی کی داد دی اور تقریباً ہر ڈبے سے ہندوؤں کو اتار کر تعداد دوسو کی گئی۔ نہ ایک زیادہ نہ

کم اور پھران کو وہیں پلیٹ فارم پر مار دیا گیا۔ پلیٹ فارم سے چلنے کے بعد ریل گاڑی کے محسوسات کچھ یوں تھے:

''اور جب میں پلیٹ فارم سے گذری تو میرے پاؤں ریل کی پٹری سے پھسلے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔'' (ہم وحشی ہیں، ص 14-98)

ٹرین آگے چل کر راولپنڈی کے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں چند مسلمان نوجوان پندرہ بیس نقاب پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے، جب گاڑی جہلم اور گوجر خان کے جنگلوں سے گذری تو ٹرین روک لی گئی اور ان برقعہ پوش عورتوں کو اتار لیا گیا، عورتیں چلانے لگیں کہ وہ ہندو اور سکھ ہیں۔ لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی جن لوگوں نے ان کی حمایت کی ان کو بھی اتار لیا گیا اور گولیوں سے بھون دیا گیا۔ ٹرین یہ سب دیکھ کر مارے شرم کے آگے بڑھ گئی اور جب لالہ موسیٰ سے گذرنے لگی تو دو سو لاشوں سے بدبو اٹھنے لگی۔ بلوچی رضا کاروں نے ٹرین میں بیٹھے مہاجروں سے ایک ایک لاش اٹھا کر باہر پھینکنے کو کہا۔ جب وہ لوگ لاش کو لے کر دروازے تک آئے انھیں پیچھے سے دھکیل دیا گیا۔ اس طرح دو سو لاشوں کے ساتھ دو سو زندہ بھی لاش بن گئے۔ درندگی کا کھیل آگے بھی جاری رہا۔ وزیر آباد اسٹیشن پر ننگی عورتوں کو سوار کیا گیا۔ پھر گاڑی لاہور اسٹیشن پر رکی۔ وہاں پہلے سے امرتسر سے آئی ہوئی گاڑی کھڑی تھی جس میں چار سو مرد اور پچاس عورتیں کم تھیں۔ پشاور ایکسپریس سے چار سو افراد کو اتار لیا گیا اور انھیں بھی وہیں مار ڈالا گیا۔

..اب ٹرین ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ مغل پورہ سے بلوچی سپاہیوں کی جگہ ہندو اور سکھ سپاہی سوار ہو گئے۔ کہانی کا منظر نامہ یکسر بدل گیا۔ اب ظالم ہندو ہو گئے اور مسلمان مظلوم۔ مسلمان اپنی وضع قطع ہندوؤں اور سکھوں جیسی بنا کر خود کو بچانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ لیکن اپنی بول چال سے پہچان لیے جاتے تھے اور مار ڈالے جاتے تھے۔ چار ہندو برہمن کے بھیس والے سوار ہوئے پر پہچان لیے گئے اور مار ڈالے گئے۔

ایک جگہ گھنے جنگل میں گاڑی روک دی گئی۔ تمام ہندو مہاجرین اور سکھ، سپاہی اتر کر جنگل میں چھپے مسلمانوں کو تلاش کر کر کے مارنے لگے۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ کچھ دور چل کر ایک گاؤں کے قریب پھر روک لی گئی۔ وہ گاؤں پٹھانوں کا تھا۔ ریل کے مسافروں نے ہجوم کی شکل میں حملہ کر دیا۔ مردوں کو مار ڈالا، عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ پھر انھیں بھی مار ڈالا۔ لاشوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ لاشوں کو ندی نالے میں پھینکتے جاتے تھے۔ انبالہ اسٹیشن سے ایک مسلم ڈپٹی کمشنر اور ان کے بیوی بچے سوار ہوئے اور کچھ دور چلنے کے بعد انھیں مار دیا گیا۔ ان کی نوجوان لڑکی جو بہت حسین تھی، کو کچھ لوگ لے کر جنگل کی طرف چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کا عنوان اشتراکیت، فلسفہ اور عمل'' تھا:

''لڑکی جنگل میں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس کی کتاب خون سے تر بتر ہو گئی۔ کتاب کا عنوان تھا 'اشتراکیت، عمل اور فلسفہ' از جان اسٹریچی، وحشی درندے انھیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی بولتا نہیں اور کوئی آگے نہیں بڑھتا اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا دروازہ نہیں کھولتا اور میں رات کی تاریکی اور شراروں کو چھپا کے آگے بڑھ رہی ہوں اور میرے ڈبوں میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما کی جے کار بلا رہے ہیں۔'' (ہم وحشی ہیں، ص 109)

ان تمام مراحل سے گذر کر ٹرین بمبئی پہنچی ہے۔ اس کی صفائی ستھرائی کر کے اسے کھڑا کر دیا گیا۔ بظاہر تو اس نے سکون کا سانس لیا ہوگا لیکن اندر اندر اس کی روح تڑپ رہی تھی اور اب وہ دوبارہ اس سفر پر جانے کی خواہش مند نہ تھی۔

تقسیم ہند کے موضوع پر اردو میں بہت سے افسانے تخلیق ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے بعض ناقدین منٹو کے تحریر کردہ افسا نوں کو ہی اعلیٰ و ارفع اور شاہکار افسانے تسلیم کرتے ہیں جب کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ کرشن چندر کے افسانے جانور، پشاور ایکسپریس، امرتسر آزادی سے پہلے، امرتسر آزادی کے بعد، اندھے ایسے افسانے ہیں جو منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، سہائے وغیرہ سے کسی طور کم نہیں۔

کرشن چندر نے کہانی کا اختتام بڑا ہی فن کارانہ کیا ہے:

''میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں۔ لیکن پھر بھی چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔ میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلے، تیل اور لوہے کے کارخانوں میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی اور باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی اور ان آنچلوں میں ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلتے نظر آئیں گے اور موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب کوئی نہ ہندو ہوگا نہ مسلمان بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔'' (ہم وحشی ہیں، ص 110)

پشاور ایکسپریس اپنا سفر مکمل کر کے ختم ہو جاتی ہے اور کہانی میں کرشن چندر نے بڑے جذباتی انداز میں ریل گاڑی کے ذریعے اس وقت کے حالات کا کچا چٹھا لکھا ہے۔ کئی جگہ کہانی واقعی جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ انسانی بربریت اور درندگی کی ایسی خوبصورت منظر کشی اردو افسانے میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ کہانی کا اختتام بڑا اثر انگیز ہے۔ ریل گاڑی کی زبانی کرشن چندر نے اپنے دل کی بات کو زبان دینے کا کام کیا ہے۔ یہی نہیں کرشن چندر ناصح اور وہ بھی کمیونسٹ ناصح بن جاتے ہیں اور مارکس کے اصولوں سے آباد ہونے والے خیالی مزدور نگر کی تمنا کرتے ہیں۔ جہاں مزدور ہوں گے اور سبھی یکساں چیز کے مالک ہوں گے۔

افسانے کا سب سے بڑا وصف اس کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار گوشت پوست کا کوئی ذی روح نہیں بلکہ آہنی جسم کی مالک ریل گاڑی ہے۔ اردو افسانے میں یہ ایک تجربہ تھا جسے کامیاب کہنا چاہیے۔ کرشن چندر نے ریل گاڑی کے محسوسات کو بڑی ہنرمندی سے لفظوں کا لبادہ عطا کیا ہے۔ انسانی دنیا میں وحشت و بربریت کا راج ہے۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کا قتل ہو رہا ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی عصمتیں تار تار ہو رہی ہیں۔ قتل و خوں کے اس گرم بازار میں آہنی جسم کی مالک 'ریل گاڑی' کے جذبات اور محسوسات کے ذریعے کرشن چندر نے انسانیت کو للکارا ہے۔ انسانوں کو شرم دلائی ہے۔ ریل گاڑی محسوس کر رہی ہے کہ ظلم و بربریت پر اتارو، یہ لوگ انسان نہیں ہیں یہ تو انسان ہونے کے مستحق بھی نہیں۔ کیا اسی لیے انھیں اشرف المخلوقات بنایا گیا تھا؟ انسان سے انسان محفوظ نہیں۔ ریل گاڑی جسے چلتا پھرتا گھر تصور کیا جاتا ہے، گھر جو اپنے رہنے والوں کو تحفظ دیتا ہے مگر ریل گاڑی اپنے ہی اندر، اپنے مکینوں (مسافروں) کو مرتا، کٹتا، آہیں بھرتا ہوا، مدد کے لیے چیخ و پکار کرتا ہوا دیکھتی رہی مگر بے بس و مجبور انسان کی طرح کچھ کر نہیں سکی۔

آخر میں، میں کہنا چاہوں گا کہ تقسیم ہند کے موضوع پر اردو میں بہت سے افسانے تخلیق ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے بعض ناقدین منٹو کے تحریر کردہ افسانوں کو ہی اعلیٰ و ارفع اور شاہکار افسانے تسلیم کرتے ہیں جب کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ کرشن چندر کے افسانے جانور، پشاور ایکسپریس، امرتسر آزادی سے پہلے، امرتسر آزادی کے بعد، اندھے ایسے افسانے ہیں جو منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، سہائے وغیرہ سے کسی طور کم نہیں۔

■

Dr. Aslam Jamshedpuri, HOD, Urdu, CCS University, Meerut (UP)

محمد صابر حسین

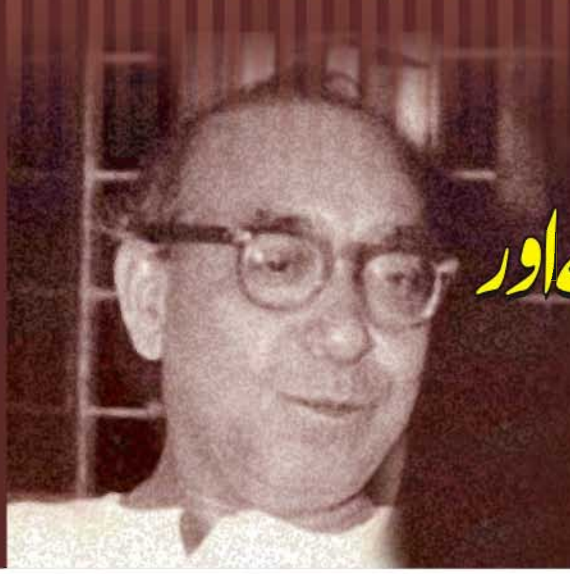

کرشن چندر کے افسانے اور ترقی پسندی

پریم چند نے ادب کی جو تعریف کی ہے اس کی روشنی میں اگر ترقی پسندی کا جائزہ لیا جائے تو اعتراف کرنا ہوگا کہ ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے بھلے ہی دیرپا ثابت نہیں ہوئی لیکن انسان دوستی کے جو نقوش چھوڑ گئی وہ ان مٹ اور دائمی ہیں۔ ترقی پسندی کو بعض لوگ سوشلزم کی تبلیغ مانتے ہیں اور بعض اسے کھلا پروپگنڈا کہتے ہیں جو کلی طور پر درست نہیں ہے۔ چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے ادب کے ذریعے مذہب کی مخالفت کی اور یہی اس تحریک کے خاتمے کا سبب بنا۔ نتیجتاً نیک مقصد کے حصول کے لیے وجود میں آنے والی یہ تحریک ایک تحریک کی حیثیت سے اپنا وجود کھو بیٹھی لیکن اپنے مقصد کے اعتبار سے آج بھی زندہ اور فعال ہے۔ عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو امن اور انصاف کے حوالے سے اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

نکسلی ظلم، دہشت گردی کے نام پر معصوموں کا قتل، گجرات کا فساد عراق افغانستان اور لیبیا کا سقوط، میانمار میں جمہوریت کا خون، فلسطین میں ظلم کا لامتناہی سلسلہ، کشمیر میں اپنوں کے ہاتھوں اپنوں پر ستم اور اس جنت کو جہنم میں تبدیل کرنے کی کوشش کیا ہے؟ ظلم واستبداد کے خلاف لڑنے والوں کا ساتھ دینا غریبوں کے حق میں بولنا مزدوروں کے حقوق دلانے میں پیش پیش رہنا، غربت اور بھوک سے نڈھال کسانوں کی خودکشی پر چیخ اُٹھنا، انسانیت سے لبریز ایسے جذبات اور اقدام کبھی پروپگنڈا نہیں ہو سکتے اور نہ انھیں کسی طرح معیوب قرار دیا جاسکتا ہے۔

کرشن چندر اس تحریک کی سب سے بڑی دین ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں دبے کچلے دکھی غم زدہ استحصال شدہ مظلوم انسانوں کی حالت زار کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ صرف تصویر ہی نہیں پیش کی بلکہ ایسے مظلوم انسانوں کو حوصلہ اور ہمت سے کام لینے کی ترغیب بھی دی۔ مایوسی اور محرومی کے راستے سے ہٹایا۔ جدوجہد کی ڈگر پر چلا اور سنہرے مستقبل کے خواب دکھائے۔ ایسا خواب جس کی تعبیر سچی ہو اور منزل سامنے۔

کرشن چندر نے جس مسئلے پر بھی قلم اُٹھایا اُس میں صاف گوئی اور حقیقت بیانی سے کام لیا خواہ وہ سماجی نابرابری ہو یا حکمرانوں کے مظالم۔ مظلوم انسان سے ہر حال میں ان کا مطالبہ رہا کہ حق اور انصاف کے لیے کسی پس وپیش سے کام نہ لو بلکہ اپنے جائز حقوق کے لیے لڑو اور ہر حال میں اپنے حقوق حاصل کر لو۔ یہی ترغیب ایک مزدور کو افسانہ 'پانچ روپے کی آزادی' میں کرشن چندر اس طرح دیتے ہیں:

''میں نے اُس سے پوچھا! تم نے کان کے مزدوروں سے کبھی بات چیت کی ہے؟ ''نہیں'' اُس نے مجھ سے کہا۔ وہاں تو ہر آدمی اپنی تقدیر کو روتا ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تقدیر بھی بدل جاتی ہے، جب سب مزدور مل جاتے ہیں۔ تم لوگ تو زندگی کی سچائی ہو۔ سوچو تو دراصل وہ کان تمھاری ہے۔ اس میں کام تم کرتے ہو۔ پہاڑ میں بارود کا فلیتہ تم لگاتے ہو۔ چٹان کو ڈائنا مائٹ سے تم اڑاتے ہو۔ پتھروں کو تم توڑتے ہو۔ پتھر کاٹ کر لاری میں تم لادتے ہو۔ جب یہ ساری محنت تم کرتے ہو تو اپنی محنت کا پھل کسی دوسرے کو کھانے کو کیوں دیتے ہو؟ میری بات سنتے سنتے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ سلاخ سہلا رہا تھا۔ سہلاتے سہلاتے اُس نے زور لگا کر اُسے دُہرا کر دیا۔ اُس نے کہا۔

''یہ بالکل نئی بات تم نے بتائی ہے۔''

میں نے کہا۔ نئی بات نہیں ہے۔ سو سال پرانی ہے۔ آزمائی بھی جا چکی ہے۔ وہ سلاخ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا ''ہم بھی آزما سکتے ہیں۔ کل میں اپنے ساتھیوں سے بات کروں گا اور بتاؤں گا۔ کل تم یہاں ملو گے اسی وقت۔''

میں نے اس کی بات پر سر ہلا دیا۔

اُس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ لوہے کی سلاخ کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے مسکرا کر لوہے کی سلاخ کو گھما کر دور نیچے بھرے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔ پانی میں ایک ہلچل پیدا ہوئی جیسے کوئی چیز ڈوب جائے اور نئی چیز اُبھر آئے۔''

آج دنیا میں ہر جگہ جمہوری حکومت بنانے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ ہر فرد کو اس کی بنیادی ضرورتیں روٹی کپڑا اور مکان اُسے ضرور میسر ہو لیکن اکثر ملکوں میں آج بھی عوام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ کولکاتا چنئی اور دلی جیسے بڑے شہروں میں غریب مزدور فٹ پاتھ پر پیدا ہوتے ہیں فٹ پاتھ پر پلتے ہیں اور فٹ پاتھ پر ہی مرجاتے ہیں۔ کرشن چندر نے فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والوں کی زندگی کے مسائل کو پوری سچائی کے ساتھ افسانہ 'دانی' میں پیش کیا ہے۔

''وہ ایک نئے گھر کا خواب دیکھتے ہیں کہ جس طرح وہ فٹ پاتھ کی زندگی گذار رہے ہیں اپنے بچوں کو فٹ پاتھ کی زندگی گزارنے نہیں دیں گے، وہ انھیں ایک گھر دیں گے۔ اس کے لیے دانی ایک چائے خانے میں بھی رات کے بارہ بجے تک زائد وقت کام کرنے لگتا ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کو گھر دے سکے ...ایک دن ثریا اور فٹ پاتھ کے تمام ساتھی سوائے دانی کے فٹ پاتھ پر سو رہے ہوتے ہیں ایک ٹرک فٹ پاتھ پر چڑ جاتا ہے۔ جس کی زد میں ثریا اور علی اکبر آجاتے ہیں۔ جیسے ہی دانی کو خبر ہوتی ہے وہ بھاگا بھاگا آتا ہے اور ثریا کی لاش دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہے... ثریا کے گھر کا خواب بھی اس کے لاشعور میں بسا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایسا گھر بنانا چاہتا ہے جس میں فٹ پاتھ کے تمام لوگ سکھ

چین سے رہ سکیں۔''

بدقسمتی سے اکیسویں صدی میں بھی یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ آج بھی غریب انسان فٹ پاتھ پر کچلے جارہے ہیں۔

اپنے کرداروں کے ذریعے مجبور اور استحصال شدہ انسانوں کو بیدار کرنے کے لیے کرشن چندر نے افسانہ ''میں انتظار کروں گا'' میں بھی اپنی ذہنی فکر کو پیش کیا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شادی بیاہ میں عورتوں کی مرضی کے احترام کو یقینی بنایا جائے۔ ایک چینی کردار ہانگ اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں جو طرزِ عمل اختیار کرتا ہے وہ ایک مہذب معاشرے کے لیے قطعی قابل قبول نہیں ہے۔ ہانگ اپنی بیٹی ذی ای کی شادی کی بات بیک وقت تین لوگوں سے کرتا ہے اور تینوں سے روپئے اینٹھتا ہے۔ عورت کی مرضی جانے بغیر اس کی شادی خرید وفروخت کے مترادف ہے۔ دین اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ ایسے چلن اور رسم ورواج کو ختم ہونا چاہیے۔ ایسی باتوں سے پرہیز کیا جانا چاہیے۔ اور اس سے باز آنا چاہیے کیونکہ عورتیں اب بیدار ہو چکی ہیں۔ ملاحظہ ہو ذیل کا اقتباس:

''ذی ای ایک بڑے اداس اور پھیکے لہجے میں جس میں بے اندازہ تھکن تھی۔ میری طرف مُڑ کر کہا کیا یہ سودا کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ چینی عورت کے پاؤں اب بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اب وہ اپنے پاؤں سے چل کر کہیں بھی جاسکتی ہے۔ جس انداز سے اُس نے 'کہیں' کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قریب سے اُٹھ کے کہیں دور چلی گئی ہے۔ اور شاید وہ بہت دور چلی گئی تھی۔ ہندوستان سے آگے، برما سے آگے، سیام سے آگے، ہند چینی سے آگے، چین کے کھیتوں میں اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔ وہ بولی بہت آہستہ آہستہ... آج مجھے اپنا دیش یاد آرہا ہے جہاں لوگ نئی زندگی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جہاں میری جیسی لڑکیاں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ ایک میں ہی یہاں سڑ رہی ہوں۔ کاش مجھے کہیں سے کوئی پر دے دے۔ میں آج ہی اسی وقت اڑ کر پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں یہ لڑائی ہو رہی ہے۔''

اگر آپ افسانوی ادب اور تنقید پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا ایک عمومی جائزہ لیں تو آپ ان اثرات کو کرشن چندر کی کہانیوں میں با آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ کرشن چندر کا افسانوی ادب خواہ وہ افسانہ ہو یا ناول ترقی پسند تحریک سے کافی متاثر ہے۔

موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی جتنی ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد کے افسانوں میں ملتی ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا ہی اثر ہے کہ نوابوں جاگیرداروں شاہزادوں اور راجکماروں کی جگہ ادب میں عام انسان ہیرو اور مظلوم غریب عورت ہیروئن نظر آنے لگی۔ افسانہ 'مرزا کپی' کی بلوچن اور افسانہ 'آلوچے' کی وہ کشمیری عورت جو آلوچے بیچتی ہے اس کی بڑی خوبصورت مثال ہے۔

بلوچن ایک خانہ بدوش عورت ہے۔ لیکن وہ بازاری نہیں ہے۔ وہ ایک پختہ کردار والی عورت ہے۔ اُسے اپنی عزت بڑی عزیز ہے۔ اس میں نیا عزم ہے۔ اس کا حوصلہ بلند ہے۔ مردوں سے زیادہ اُس میں ہمت اور طاقت ہے۔ غریب ہوتے ہوئے بھی وہ نوجوانوں اور رئیس زادوں سے مرعوب نہیں ہوتی ہے۔ وہ بگڑے اور رنگین مزاج نواب زادوں سے اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ آصف گڑھ کے نوجوان مرزا اپنے باپ کے بڑے چہیتے ہیں۔ انھیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کی رنگین مزاجی کا یہ عالم ہے کہ محلات کی لونڈیاں اور باندیاں تو کیا تاریک گلیوں میں سات پردوں کے پیچھے بھی کوئی غریب حسین دوشیزہ ہو تو وہ مرزا کی بری نظر سے بچ نہیں پاتی ہے۔ خوبصورت عورتوں کو پنگھٹ سے قصبے کی سڑکوں سے، کھیت اور جنگلوں سے جہاں سے بھی جی چاہتا اغوا کرلیتے ہیں۔ یہ کام ان کے لیے بہت معمولی اور آسان ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ان کی مخالفت کرسکے۔ ان کے آگے عورتوں کی خود سپردگی عام بات ہے۔ ان کا حوصلہ بڑھا ہوا ہے۔ اسی حوصلے نے انھیں اپنے نوکروں کے ساتھ بلوچن کو اغوا کرنے کے لیے اکسایا۔ جب وہ نوکروں کے ساتھ بلوچن کو گھیرنے اور پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ سینہ تان کے مرزا اور ان کے نوکروں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے بلکہ مرزا کی گردن پوری طاقت سے پکڑ لیتی ہے اور جب تک مرزا کو 'مرزا کپی' نہیں بنا دیتی اور زندگی بھر کے لیے ایک سبق نہیں دے دیتی مرزا کو نہیں چھوڑتی ہے۔ گویا یہی وہ کردار ہے جسے ترقی پسند تحریک اُبھارنا چاہتی ہے۔ اس افسانے کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

افسانہ 'آلوچے' میں جگ موھن ایک سیاح ھے۔ وہ امیر ھے لیکن اس کا کردار قابل تعریف نہیں قابل نفرت ھے۔ اس کی حالت ایک جنسی مریض کی طرح ھے۔ وہ ھر خوبصورت عورت کو دیکھ کر پیسے کے بل بوتے اُس کے ساتھ جنسی ھوس پوری کرنا چاھتا ھے۔ چاھے اُسے اس کام کو انجام دینے میں اپنی مردانہ طاقت بڑھانے کے لیے انجکشن ھی کیوں نہ لینا پڑتا ھو۔ وہ ایک بار غربت کی ماری ھوئی ایک کشمیری دوشیزہ کے ساتھ اپنی ھوس پوری کرنے میں کامیاب بھی ھو جاتا ھے لیکن یہ قدیم کشمیر کی بات ھے۔

''پھر بلوچن واپس آگئی اور سینہ تان کے مرزا کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ کیا ہے؟ بلوچن نے بڑی دلیری سے مرزا جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اس غیر متوقع سوال سے مرزا جی کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ بول نہیں سکے۔ بلوچن نے آگے بڑھ کر مرزا جی کو گردن سے پکڑ لیا۔ جلالی آواز میں گرج کر بولی۔ ہم روج ادھر سے گزرتا ہے۔ تم روج ہم کو دیکھتا ہے۔ ادھر سینے پر دیکھتا ہے۔ ادھر کا ہے کے واسطے دیکھتا ہے؟ ایں؟ بولو؟ کاہے کے واسطے دیکھتا ہے، ادھر؟ بلوچن نے ایک ہاتھ تو مرزا جی کی گردن پر رکھا دوسرے ہاتھ سے ان کے رخسار پر زور کا ایک طمانچہ مارا۔ مرزا جی زور سے چیخے ''بچاؤ بچاؤ'' مگر چاروں مصاحب بھاگ چکے تھے... آخر بلوچن نے زور کا جھٹکا دے کر غصے میں اپنا گریباں پھاڑ ڈالا۔ اپنے ہاتھ سے اپنی چھاتی کو لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے مرزا جی کی گردن نیچی کی اور پھر زبردستی اپنی چھاتی اُس کے مُنھ میں دے دی۔ لے حرامی لے۔ پی میرے بچی کی کپی۔ اُس وقت پچاسوں آدمی مرزا جی اور بلوچن کے گرد جمع ہو چکے تھے مگر بلوچن اس قدر بپھری ہوئی تھی کہ کسی کی منت سماجت پر کان دھرنے کو روادار نہ تھی اُس نے مرزا کی گلوخلاصی نہیں کی۔ جب تک اُسے اپنی چھاتی کا دودھ نہ پلا دیا۔''

افسانہ 'آلوچے' میں بھی اس کردار کو اُبھارا گیا ہے جس کی ترقی پسند تحریک حمایت کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی عورت کو بری نظر سے دیکھے تو عورت اُس سے ڈر جانے کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دے تاکہ عورت میں جو احساس کمتری ہے اس کا خاتمہ ہو اور عورت اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے کے قابل بن جائے اور اُس میں احساس برتری کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے۔

افسانہ 'آلوچے' میں جگ موہن ایک سیاح ہے۔ وہ امیر ہے لیکن اس کا کردار قابل تعریف نہیں قابل نفرت ہے۔ اس کی حالت ایک جنسی مریض کی طرح ہے۔ وہ ہر خوبصورت عورت کو دیکھ کر پیسے کے بل بوتے اُس کے ساتھ جنسی ہوس پوری کرنا چاہتا ہے۔ چاہے اُسے اس کام کو انجام دینے میں اپنی مردانہ طاقت بڑھانے کے لیے انجکشن ہی کیوں نہ لینا پڑتا ہو۔ وہ ایک بار غربت کی ماری ہوئی ایک کشمیری دوشیزہ کے ساتھ اپنی ہوس پوری کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ قدیم کشمیر کی بات ہے۔ جگ موہن بیس سال بعد دوبارہ غیر ممالک سے کشمیر واپس آتا ہے۔ وہ اپنا پرانا حربہ دہرانا چاہتا ہے لیکن اس بار اُسے ایک نئے کشمیر کی ایک نئی

عورت کا سامنا ہے۔ یہ عورت اپنی ہزار مجبوریوں اور غربت کے بعد بھی اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی ہے۔ وہ جگ موہن کے ارادے کو اپنے پختہ عزم اور استقلال سے نہ صرف خاک میں ملا دیتی ہے بلکہ اپنے کم عمر بچے قادر سے رومال میں ایک پھٹا اور گھسا ہوا پرانا جوتا جگ موہن کو بھیج کر اپنے خطرناک ارادے کو بھی ظاہر کر دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''قادر رومال کو جھلاتے ہوئے آ رہا تھا۔ رومال بھرا ہوا تھا۔ جگ موہن کی نگاہوں میں پھول ہی پھول کھلتے گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کشمیر کی دلہن اپنی سیکڑوں نرگسی آنکھوں سے شرما کر اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ قادر نے خیمے کے اندر آ کے بھرا ہوا رومال جگ موہن کے سامنے رکھ دیا۔ جگ موہن نے کانپتے ہاتھوں سے رومال کھولا۔

رومال میں کشمش نہ تھی۔ اخروٹ بھی نہیں تھے۔ بادام بھی نہیں تھے۔ ایک پھٹا پرانا گھسا ہوا جوتا تھا جس میں اس کا دس روپے کا نوٹ رکھا تھا۔ جگ موہن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے وہ پھٹا ہوا جوتا کھینچ کر اس کے منہ پر مارا ہو۔ غصّے سے اس کے گال تمتما گئے۔ اُس نے جھنجھلا کے قادر سے پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب میں قادر مسکرایا۔ پھر ذرا سا ہنسا۔ پھر زور سے ہنسا۔ پھر بھاگتا ہوا اور ہنستا ہوا ڈھلوان سے نیچے دوڑتا گیا۔ دور تک جگ موہن کے کانوں میں اس کی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ نئے کشمیر کی ہنسی۔''

افسانہ بلوچن اور آلوچے کے اقتباس سے کرشن چندر نے مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی نشاندہی بہت پہلے ہی کر دی تھی۔ پہلے راجے رجواڑے نواب اور نواب زادے عورتوں اور دوشیزاؤں کی عزت و ناموس کو تار تار کر رہے تھے۔ اور آج کچھ سنت لیڈر اور افسران اور ان کے بگڑے ہوئے صاحب زادے اس کام میں ملوث ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ متوسط اور نچلے طبقے کے نام نہاد رئیس زادے جو تعلیم اور ملازمت سے محروم ہیں مگر راتوں رات غلط طریقے سے دولت بٹور کر دیدہ دلیری سے یہ گھناؤنا کام کر رہے ہیں ان کی بے راہ روی کا یہ عالم ہے کہ ان کی بداعمالی سے دس سال سے کم عمر کی بچیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ایسے مجرموں کو عدالت سے پھانسی کی سزا بھی سنائی گئی ہے مگر ہنوز یہ بدترین فعل اب بھی جاری ہیں۔ لہٰذا دوشیزاؤں میں اُس کردار کو اُبھارا جائے جس کی ترقی پسند تحریک حمایت کرتی ہے۔ جس کا ذکر کرشن چندر نے مندرجہ بالا افسانوں میں کیا ہے تاکہ لڑکیاں خود اپنی حفاظت کی اہل بن جائیں۔

کرشن چندر کا سرمایہ دار طبقے کے خلاف غم و غصّے کا اظہار ان کے اشتراکی ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی ایک مثال افسانہ 'مہالکشمی کا پل' میں نظر آتی ہے جس میں پل کے آس پاس رہنے والوں کی غربت بے کسی و ناداری کی کہانی ہے جو محنت کش طبقے یا ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ یا تو مزدور یا چپراسی ہیں یا پھر برتن مانجنے والی عورتیں ہیں۔ سرمایہ دار طبقے نے غیر منظم مزدور طبقے پر اپنے ظلم و بربریت کی ساری حدیں توڑ دی ہیں۔ وہ بے قصور مزدور کو صرف اس لیے نوکری سے نکال دیتا ہے کہ اب ان مزدوروں میں بھی بے جا ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت پیدا ہوگئی ہے۔ اس نوع کی بے شمار کہانیاں ہیں جو بطور خاص کشمیر کے کھیتوں سے ممبئی کے ملوں تک بکھری پڑی ہیں۔ انسانیت سوز ظلم کی مثال افسانہ، ان داتا، کالو بھنگی، ٹیکسی ڈرائیور، کچرا بابا، بارود اور چیری کے پھول، حاجی پیر کا بیٹا، حسن اور حیوان،

کرشن چندر کا مسلک سوشلیزم تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنے افسانوں کے ذریعے اس خیال کا اظہار کرتے رہے اور اس بات کے لیے پُر امید رہے کہ انسان کی زندگی میں ایک دن بہار ضرور آئے گی بشرطیکہ انسان اشتراکی نظام کی بنیاد رکھ لے جس میں ہر انسان معاشی اعتبار سے یکساں ہو ورنہ بغیر اس کے بھوک بے کاری استحصال ناانصافی فساد جنگ اور جہالت کا اس کرۂ ارض سے دور ہونا ممکن نہیں۔

میں انتظار کروں گا، جوتے پہنوں گا، پھول سرخ ہیں، دسواں پل اور کشمیر کو سلام وغیرہ میں موجود ہیں۔

کرشن چندر عوام دشمن سامراجی طاقتوں سرمایہ پرست لوگوں اور سیاسی بداعمالیوں کے مرتکب افراد سے ہمیشہ جنگ کرتے رہے بلکہ جب ان پر شدید غم و غصّے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ان کا طنز گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور سماج کو بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں اور انسانی اتحاد پر زور دیتے ہیں۔

افسانہ 'بالکونی' کا ایک کردار عبداللہ ہے۔ عبداللہ سوچتا ہے کہ کب تک اس کا بیٹا صاحب لوگوں کے لیے پانی کی بالٹیاں بھرتا رہے گا۔ کب تک اس کا چھوٹا بیٹا جو چھوٹا بہشتی کہلاتا ہے، اس رواج اور کام کو جاری رکھے گا اور امیروں کا ظلم سہتا رہے گا۔ کیا غریبوں کے کچھ ارمان اور خواہشات نہیں ہوتے؟ حقیقتاً وہ بھی اچھے کھانے پہننے اور اچھی تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ وہ بھی زندگی ہنسی خوشی سے گزارنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان سب خواہشوں اور امنگوں کے باوجود عبداللہ مثبت رویوں کا مظہر ہے۔ ایک حقیقت پسند کردار ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے بیٹے کا نام 'غریب' رکھا ہے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو راجہ بیٹا کہہ کر نہ خود فریبی میں مبتلا ہونا چاہتا ہے نہ دنیا والوں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اس کے خیالات ترقی پسند ہیں۔ وہ کسی حد تک روایت شکن بھی ہے۔ وہ ہوٹل کے لیے پانی بھرنے والا نوکر ہوتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ اُسے بڑا آدمی بنانا چاہتا ہے۔ اُسے اونچے عہدے پر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ ہرگز اُسے دوسرا بہشتی بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اُسے سماج میں وہ مقام دلانا چاہتا ہے جو خود اُسے کبھی نہ مل سکا۔ اس کے ساتھ اسے زندگی کی ان خوشیوں اور مسرتوں سے ہمکنار دیکھنا چاہتا ہے جو خود اُسے چھو کر بھی نہیں گئیں۔ اس کے لیے وہ کوشاں بھی رہتا ہے اپنی حیثیت اور بساط کے دائرے میں بھلے ہی اپنی زندگی میں عبداللہ اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکا جو اپنے بیٹے کے خوبصورت مستقبل کے لیے دیکھا کرتا تھا۔ باوجود اس کے ہر انسان کو ایسے خواب دیکھنے کا پورا حق ہے۔

کرشن چندر کا مسلک سوشلیزم تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ اپنے افسانوں کے ذریعے اس خیال کا اظہار کرتے رہے اور اس بات کے لیے پُرامید رہے کہ انسان کی زندگی میں ایک دن بہار ضرور آئے گی بشرطیکہ انسان اشتراکی نظام کی بنیاد رکھ لے جس میں ہر انسان معاشی اعتبار سے یکساں ہو ورنہ بغیر اس کے بھوک بے کاری استحصال ناانصافی فساد جنگ اور جہالت کا اس کرۂ ارض سے دور ہونا ممکن نہیں۔

لہٰذا ان کے نظریے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ مزدوروں کسانوں اور غریبوں کو ان کا حق مل جائے۔ کمزوروں پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ عورتوں کے ساتھ کسی طرح کی زبردستی نہیں کی جائے بلکہ ان کا احترام ہو۔ دنیا سے جنگ اور فساد ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ دنیا کا ہر انسان سماجی اور معاشی طور پر یکساں ہو جائے۔ ہر جگہ امن اور خوشحالی ہو۔ بس یہی تو کرشن چندر چاہتے تھے اور یہ چاہت کون سا گناہ ہے؟

ہمارے نقاد سوشلزم اور ترقی پسند تحریک کے متعلق ادب برائے ادب کے حوالے سے جو بھی آرا رکھیں قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن آج دنیا میں طاقت کا توازن نہ رہنے کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ آج ہے۔ یہ بھی ایک سچائی ہے۔ کاش! آج کرشن چندر زندہ ہوتے تو عالمی تناظر میں نہ جانے کتنی شاہکار کہانیاں اردو ادب کو مل جاتیں۔ کاش! کرشن چندر زندہ ہوتے۔

Dr. Mohd Sabir Husain, Head Dept of Urdu, Markham College of Commerce, Hazari Bagh (Jharkhand)

کرشن چندر
قلم کا جادوگر

عظیم اقبال

ایک ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار کے بطور کرشن چندر سے آشنائی اردو ادب کے ہر شیدائی سے متوقع ہے۔ فلموں کے واسطے سے بھی قابلِ ذکر منظرنامے اور پرزور مکالمے کی تحریر سے بھی انھوں نے اپنی اہمیت جتائی ہے؟

کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے اولین تخلیق کاروں میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اغراض و مقاصد کو بہ نفس نفیس اپنا کر ایک مثال قائم کرنے میں بھی پیش پیش تھے۔

وہ ادب میں کسی منافقت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے ادب اور ادیب کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں اُنھیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ہر چند کہ بسا اوقات انھیں تنازعات میں گھیرنے کی کوششیں ہوئیں، وہ ہر بار سرخرو ہوئے۔ ان کی انفرادیت پر آنچ نہ آئی۔

زمینی اور لسانی حد بندیوں کے باوجود ان کا شہرہ دیگر اقوام اور دیگر زبانوں تک میں ہوا۔ خصوصیت سے اشتراکی روس میں انھیں ذوق وشوق سے پڑھا گیا۔ ماسکو میں کسی ادبی سرگرمی کے دوران ایک پرستار کے ذریعے ’’السلام علیکم! کرشن چندر بھائی!‘‘ کے تخاطب سے انھیں تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی ہوئی۔

کرشن چندر اشتراکی نظریات کے حامی تو تھے اور ان کی تخلیقات میں جا بہ جا ان نظریات کی ترجمانی بھی ہوئی، لیکن ان کی پیش کش میں خوش سلیقگی ہمیشہ قائم رہی۔

ان کے افکار اشتراکی ہیں، لیکن ان افکار کے تانے بانے بننے میں رومانی انداز اپنانے کے سبب ان میں آفاقیت آجاتی ہے۔ اس لیے ان کا تاثر تادیر قائم رہتا ہے۔

رومان اور حقیقت کے حسن امتزاج سے کرشن چندر کے افسانوں میں دلکشی اور دلفریبی آئی ہے۔ انھوں نے وہ رتبہ پایا ہے جو دیگر مصنّفین کے حصے میں کم آیا ہے۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

’’. . . اردو کی اِس صنف (افسانہ نگاری) کو جس خوبصورتی اور فن کمالات سے انھوں نے آگے بڑھایا ہے۔ وہ زبان و بیان کے لحاظ سے پریم چند کے کارناموں پر اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔.. مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں، رومان و حقیقت کا ایک دلکش امتزاج، مطالعے کی باریکی اور فراوانی، موجود سماج اور نظامِ معاش سے انتہائی اور دلی نفرت کا جذبہ، طنز و مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش، دلکش رمزیہ نگاری اور انسانی نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔‘‘

یہ واقعہ ہے کہ کشن چندر نے اپنے افسانوں کے توسط سے انسان اور اِس کے معاشرے کے ربط و ضبط کو کمال خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ زندگی کے متعلق کرشن چندر کے نظریات واضح ہیں۔ کبھی تو یہ مستعار ہوتے ہیں اور کبھی ان میں کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا جاتا ہے، جس کے سبب ان میں نیرنگی آجاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بہاؤ مثل دریا ہے۔ لیکن انھیں سمت دینے میں کرشن چندر کلی طور پر قادر ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں، وہ انھیں روک دیتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

’’اُن کا فن مجموعی حیثیت سے پراثر اور دیرپا ہے، جو ان کے تمام افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔‘‘

خود کرشن چندر نے اپنے ایک مصاحبے میں کہا تھا—

’’میں جتنا لکھتا ہوں، اس سے دس گنا زیادہ پڑھتا ہوں۔ اس طرح دیگر لوگوں کی دس چیزیں جب تک پڑھ نہ لوں، اپنی ایک چیز نہیں لکھتا۔‘‘

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کرشن چندر گرد و پیش سے بے بہرہ نہ تھے۔ معاصر ادب سے پوری طرح وابستہ تھے۔

افسانوں میں ان کے تجربے بے شمار ہیں۔ حقیقت کی جلوہ نمائی کے ہمراہ فنطاسی، طنز، مزاح، پیش بینی، منظر نگاری کے جتنے نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ وہ دوسرے کسی فنکار کے یہاں نہیں ملتے۔

بسیار نویسی کا الزام لگا کر بیش تر ان کے فن کو کم تر درجے کا بتایا جاتا ہے، لیکن ایسی سوچ مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت کو داغدار بنانے کی کوشش اس وقت بھی ہوئیں جب وہ باحیات تھے اور آج بھی ہوتی ہیں۔ جب وہ نہیں رہے۔

برسبیلِ تذکرہ ایک واقعہ سن لیجیے — ’’ٹائمس آف انڈیا گروپ کے بچوں کے رسالہ ’پراگ‘ کے دفتر میں کبھی کرشن چندر کا گزر ہوا تو ادارتی اہلکاروں نے ان سے اپنے رسالے کے لیے کسی کہانی کی فرمائش کی۔ کرشن چندر نے کہا—

’’میں بچوں کے لیے نہیں لکھتا۔‘‘

رسالے کے مدیر نے فرمایا—

’’کوئی بات نہیں، آپ جو لکھتے ہیں وہی بچوں کے لیے موزوں ہوگا!—‘‘

کرشن چندر مسکرا کر رہ گئے—

بے شک ان کی مسکراہٹ معنی خیز، اور بلاشبہ ان کی خاموشی پراسرار رہی ہوگی— اس سے قطع نظر، کرشن چندر کے پرستار ایسے بھی تھے جو انھیں فنِ داستان گوئی کا شہنشاہ سمجھتے

تھے اور جنھیں مشرق میں ان کا کوئی ثانی نظر نہ آتا تھا۔ ان کی جادو بیانی کا طلسم ایسا بھی تھا کہ اے ایم یو کے شعبۂ اردو میں استاذ مسز سلمیٰ صدیقی تدریس کا موضوع خواہ کچھ بھی رہے، کرشن چندر کی افسانہ نگاری تک جا پہنچتی تھیں۔ پھر ایک دن، اپنا گھر بار چھوڑ کر کرشن چندر کے گھر جا بسیں—

پہلے لاہور، پھر دہلی اور پھر بمبئی میں کرشن چندر کی زندگی اونچ، نیچ سے گزرتی رہی۔ زیادہ عرصہ فلم نگری میں گزرا۔ انھوں نے زندگی کا جو معیار بنایا تھا، اُسے قائم رکھنے کے لیے رسائل و جرائد سے معاوضہ ملتا تھا، لیکن اس کے ناکافی ہونے کے سبب انھیں طلبا کو پرائیوٹ ٹیوشن بھی دینا پڑا۔ افسانہ نگاری کی اپنی صلاحیت سے انھوں نے استفادہ تو کیا۔ مگر ان پر بسیار نویسی کا الزام بھی لگ گیا۔

کرشن چندر کے قریبی لوگوں پر نظر ڈالیں تو بھائی مہندر ناتھ افسانہ نویسی اور ناول نویسی میں منفرد انداز کے ساتھ جلوہ گر ہیں، بہن سرلا دیوی، مستزاد ہیں، بہنوئی ریوتی سرن شرما ڈراموں میں اپنے عطیات کے سبب محتاج تعارف نہیں— اہلیہ، سلمیٰ صدیقی کی ادبی خدمات بھی لائق تحسین ہیں۔ گویا کہ کرشن چندر کے ارد گرد ادب ہی ادب ہے۔

کرشن چندر کی تحریریں دل کو چھونے والی ہیں۔ ان کے جملوں کی تراش خراش ایسی ہے کہ ہر لفظ دل پر ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ لکھتے وقت اس ذخیرے کا استعمال وہ کھل کر کرتے ہیں۔ جزیات نگاری کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ پھر بھی وہ جانتے ہیں کہ کہانی کو کس موڑ پر لایا جائے تاکہ اس کا اثر ہو، اور یہ اثر دیرپا بھی ہو۔ 'پالنا'، 'ڈِنر'، 'جنت کے مزے'، 'ربر کی عورت'، 'آدھے گھنٹے کا خدا' اس طرز کے ان کے مختصر اور طویل افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کے اختتام پر ان کے نظریے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ بظاہر تفریحی لگنے والے افسانوں میں بھی ایک پیغام ہے، جو ہمیں غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانے ذہن کو بوجھل بنانے کے بجائے، اسے سکون بخشتے ہیں۔ عدم مساوات اور استحصال کے سبب پیدا ہونے والے مضمرات ان کے افسانوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے کردار نت نئے ہوتے ہیں جو اپنی سوچوں نیز اپنے اعمال سے افسانے کی مخصوص فضابندی کرتے ہیں۔ ان کے اعمال کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ افسانے میں تجسس کی آبیاری کا یہ ایک موثر وسیلہ ہے۔

کرشن چندر کی علامتی کہانیاں ہوں یا رومانی، وہ حقیقی زندگی کی عکاس ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کا پیغام واضح ہوتا ہے۔ ان میں ترسیل کی کمی نہیں ہوتی۔ انھیں اپنی حقیقت نگاری پر کوئی نقاب چڑھانے کی یا رِدا ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا قلم بے باک اور شوخ تو ہے، لیکن فحش گو نہیں۔ اپنے قلم پر انھیں کلی اختیار ہے۔ اپنی تمام تر سنجیدگی کے درمیان وہ قدم بہ قدم طنز کے تیر چلاتے جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی مزاح کا مرہم لگانا بھی نہیں بھولتے۔

کرشن چندر خیر و شر کے درمیان کوئی حدِ فاصل کھینچنے کے قائل نہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ اضافی خوبیاں ہیں، جن کا دار و مدار معاشرے پر ہوتا ہے، جنھیں معاشی، سماجی اور سیاسی قوتیں پروان چڑھاتی ہیں—

کرشن چندر نے تقسیم ہند کے برے اثرات دیکھے اور سنے ضرور لیکن ان کے ذاتی تجربات سے وہ نا آشنا رہے۔ اس کے باوجود تقسیم کے خون آشام حادثات کی تصویر کشی کرنے میں وہ بے حد کامیاب رہے۔

فسادات کے پس منظر میں تحریر کردہ کرشن چندر کا افسانہ 'پیشاور ایکسپریس' فرقہ وارانہ تشدد کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، جن میں سچائی کے ہمراہ تلخی بھی ہے۔ بے جان، 'پیشاور ایکسپریس' کو ایک شخصیت عطا کی گئی ہے۔ اسی کی زبانی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ جہاں فسادات میں ملوث کردار اپنے مکروہ چہرے لیے یکے بعد دیگرے روبرو ہوتے جاتے ہیں، افسانہ نگار کا تجزیہ جذباتی نہ ہو کر دانشورانہ ہے، لیکن اس دانشوری میں کرب کا رنگ بھی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"..جو ایک تاریخی خوف اور شَر کے زیرِ اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے، جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے۔ جس کی سنگلاخ سرزمین سے، انھوں نے توانائی حاصل کی تھی، جس کے برفاب چشموں سے انھوں نے پانی پیا تھا، اور جس کے حسین چمن زاروں سے انھوں نے انگوروں کا رَس پیا تھا، آج وہ وطن یک لخت بیگانہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مہربان سینے کے کواڑ ان پر بند کر دیے تھے اور وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لیے بادلِ نخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں۔"

ایک اور اقتباس دیکھیے—

"لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر، اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر جنھوں نے اس خوبصورت پنجاب، اس البیلے، پیارے سنہرے چناب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی، آج پنجاب مر گیا تھا۔"

یہ اقتباس بھی دیکھیے:

"اس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے۔ اس کے گیت مردہ۔ اس کی زبان مردہ۔ اس کا بے باک نڈر، بھولا بھالا دل مردہ اور نہ محسوس کرتے ہوئے اور آنکھ نہ رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی"

تقسیم سے پیدا شدہ فسادات اور ان کے اثرات سے نالاں کرشن چندر اپنے مخصوص نظریے کی پیشکش کرتے ہوئے پیشاور ایکسپریس کو اپنی زبان عطا کرتے ہیں:

"میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں، لیکن پھر بھی چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے— میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر جاؤں گی..."

کرشن چندر مزاجاً رومان پرست ہیں۔ ان کی یہ رومان پرستی کہیں قدرت کے حسین نظاروں اور کہیں نازک انسانی 'جذبوں' کے توسط سے اظہار کا پیکر بنتی ہے۔ ان کا افسانہ 'پورے چاند کی رات' اسی قبیل کا ہے۔ کشمیر کی حسین و رنگین سرزمین کی یہ ایک خوبصورت داستان ہے۔ یہاں پہاڑوں کی سرزمین کشمیر کی حسین وادیوں، پہاڑوں اور جھیلوں کا ذکر

ہے۔ یہ دو معصوم دلوں کی درد بھری داستان ہے۔ کہانی بیان کرنے والا ایک بوڑھا شخص ہے جو کبھی ایک لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا۔ لڑکی بھی اُس کو بہت چاہتی تھی، لیکن ایک غلط فہمی کی بنیاد پر دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اڑتالیس برس کے بعد ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پاتے ہیں، اس لیے کہ دونوں ہی بوڑھے ہو چکے ہیں۔

بوڑھی عورت جب اپنے ماضی کے خوابوں کے شہزادہ بوڑھے مرد کو پہچان جاتی ہے تو اس سے اپنی درد بھری آواز میں کہتی ہے—

"اب اتنے برس کے بعد آئے ہو تو کوئی کیسے پہچانے؟ میں نے چھ برس تمھارا انتظار کیا۔ تم کیوں نہیں آئے؟"

بوڑھے مرد کا جواب تھا۔

"میں آیا تھا مگر تمھیں ایک دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا۔ اس روز تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ ایک ہی رکابی میں۔"

بوڑھی عورت ایک دم چپ ہو جاتی ہے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگتی ہے، پھر کہتی ہے—

"ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔"

اس افسانے میں کرشن چندر نے قدرتی مناظر کو بہت خوبصورتی اور دلکشی سے پیش کیا ہے۔ افسانے کے آخر میں خوبانی کا دوسرا درخت ایک علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ زندگی اور موت دونوں میں ایک تسلسل ہے، ایک روانی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک چیز کے جانے کے بعد دوسری چیز فوراً اس کی جگہ لے لیتی ہے—

کرشن چندر کا تحریر کردہ 'پانی کا درخت' ایک علاقائی خصوصیت کا رومانی افسانہ ہے، جن میں پانی کی اہمیت موضوعِ بحث ہے۔ ایک اقتباس پیش ہے:

"جہاں ہمارا گاؤں ہے، اس کے دونوں طرف پہاڑو ں کے روکھے سوکھے سنگلاخی سلسلے ہیں۔ مشرقی پہاڑوں کا سلسلہ بالکل بے روش و برودت ہے۔ اس کے اندر نمک کی کانیں ہیں۔ مغربی پہاڑی سلسلے کے چہرہ پر جنڈ، پھیکڑ، املتاس اور کیکر کے درخت اُگے ہیں۔ اس کی چٹانیں سیاہ ہیں، لیکن ان سیاہ چٹانوں کے اندر میٹھے پانی کے دو بڑے قیمتی چشمے ہیں اور ان دو پہاڑی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تلہٹی پر ہمارا گاؤں آباد ہے۔"

گاؤں والوں کو درپیش پانی کی قلت کا مسئلہ اس اقتباس میں دیکھیے—

"ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے۔ یہاں کی زمین کو ہانپتے ہوئے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے۔ جو صدیوں کی ناآسودہ پیاس سے پیدا ہوئی ہے۔"

زیرِ نظر افسانے میں ایک ایسی فضا آفرینی ہے جو ہمیں ایک نئی دنیا میں لے جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں پانی واقعی زندگی ہے۔ اقتباس دیکھیے—

"ہمارے گاؤں میں بچے پانی کے لیے بہت سے سوال کرتے ہیں۔ پانی اُن کے تخیل کو ہمیشہ اُکساتا رہتا ہے۔ دوسرے گاؤں میں جہاں پانی بہت ہوتا ہے، وہاں کے لڑکے شاید سونے کے جزیرے ڈھونڈتے ہوں گے۔ یا پرستان کا رستہ تلاش کرتے ہوں گے۔ لیکن ہمارے گاؤں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور تلہٹی پر اور پہاڑوں پر دور دور تک پانی کو ڈھونڈنے کا کھیل

بوڑھی عورت جب اپنے ماضی کے خوابوں کے شہزادہ بوڑھے مرد کو پہچان جاتی ہے تو اس سے اپنی درد بھری آواز میں کہتی ہے—

"اب اتنے برس کے بعد آئے ہو تو کوئی کیسے پہچانے؟ میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا۔ تم کیوں نہیں آئے؟"

بوڑھے مرد کا جواب تھا۔

"میں آیا تھا مگر تمھیں ایک دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا۔ اس روز تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ ایک ہی رکابی میں۔"

کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پانی کو ڈھونڈا تھا اور نمک کے پہاڑ پر پانی کے دو تین چشمے دریافت کیے تھے۔"

ماضی کو یاد کرتے ہوئے افسانہ نگار نے صاحب استطاعت افراد کے ظلم و ستم اور زور زبردستی کو یوں قلمبند کیا ہے:

"یہ میرے لڑکپن کی کہانی ہے، جب ہمارے گاوں سے بہت دور ان پہاڑی سلسلوں کی دوسری طرف سیکڑوں میل لمبی جاگیر کے راجہ اکبر علی خاں نے ہمارے دیہات والو ں کی مرضی کے خلاف رویل ندی کا بہاؤ موڑ کر اپنی جاگیر میں کر لیا۔ اور ہماری تلہٹی کو اور آس پاس کے بہت سے علاقے کو سوکھا اور بنجر اور ویران کر دیا، اس وقت اس ندی کے کنارے کا ہمارا گاؤں اور اس وادی کے دوسرے بہت سے گاؤں پریشان ہو گئے جیسے بہت سے بچے یکا یک اپنی ماں کے مر جانے پر یتیم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے لیے رویل ندی بھی مر گئی اور اس کا پانی بھی مر گیا اور ہمارے لیے ایک تلخ یاد چھوڑ گیا۔"

ان علاقوں میں جہاں پانی کی قلت ہے، وہاں پانی کے چشموں کی دریافت لوگوں کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے۔ اس صورت حال کو افسانہ نگار یوں بیان کرتا ہے:

"...ایسی رات ہمارے گاؤں میں کب آئی تھی، جب ابا خدا بخش نے پانی ڈھونڈ نکالا تھا۔ پانی جو انسان کے ہاتھوں کی محنت تھا۔ اس کے دل کی محبت تھا، آج ہمارے یہاں پانی اسی طرح آیا تھا جیسے بارات ڈولی لے کر آتی ہے، وہ چشمہ آج ہمارے درمیان اس طرح ہولے ہولے شرمیلے انداز میں چل رہا تھا۔ جیسے نئی دلہن جھجک جھجک کر اجنبی آنگن میں پاؤں رکھتی ہے۔ اس رات میرے ایک ہاتھ میں پانی تھا، دوسرے ہاتھ میں بانو کا ہاتھ تھا اور آسمان پر تارے تھے۔"

کرشن چندر کا انتقال 8 مارچ 1977 کو ہوا۔ یوں انھوں نے زندگی کی 64 بہاریں دیکھیں۔ وہ دائمی نزلہ کے مریض تھے اور ان کی میز پر سفید رومال تہہ بہ تہہ رکھے رہتے تھے تاکہ بہ وقت ضرورت کام آسکیں۔ کئی رنگوں کے عمدہ کاغذ کے پیڈ مختلف اصنافِ سخن کے لیے تصرف میں لاتے تھے۔ عمدہ قلم اور مختلف رنگوں کی روشنائی کے استعمال کے بھی دلدادہ تھے۔ لکھنے کے بعد کاٹ چھانٹ سے گریز کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں طوالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے افسانے کے بنیادی حسن پر اثر نہیں پڑتا۔

افسانے کے تحت کردار نگاری ہو یا مکالمہ نگاری، کرشن چندر یہاں بھی اپنے نقوش چھوڑتے ہیں۔ ان کے پیش کردہ کردار جداگانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے قلم سے تراشیدہ انسان، حیوان حتیٰ کہ بے جان اشیا بھی اپنی خصوصی پہچان رکھتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ان کرداروں کی فکر ہو یا آواز، اپنی نہ ہو کر تخلیق کار سے مستعار ہوتی ہے۔ اس لیے ان میں حقیقت دھندلا جاتی ہے اور معنویت ابھر آتی ہے۔ پھر بھی ان کا بھرم قائم رہتا ہے اور ان کا اعتبار نہیں اٹھتا۔ واقعی کرشن چندر قلم کے جادوگر ہیں—"

قصہ گوئی ہو، زبان ہو، بیان ہو— کرشن چندر کا مدمقابل کوئی نہیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ واضح زاویہ نگاہ اور آزمودہ کار بالغ نظری کے سبب انھیں ایک بڑے فنکار کا درجہ حاصل ہے۔ اردو ادب سے ہم عصر ہندوستان نیز عالمی ادب تک کرشن چندر اپنی طویل القامتی کے سبب ایک مینارۂ نور کا درجہ رکھتے ہیں۔ کرشن چندر صدی تقریبات، انھیں اور ان کے معرکوں کو یاد کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں۔

■

Azim Iqbal, Adbistan, Ganj No One, Bettiah - 845438 (Bihar)

صغیر اشرف

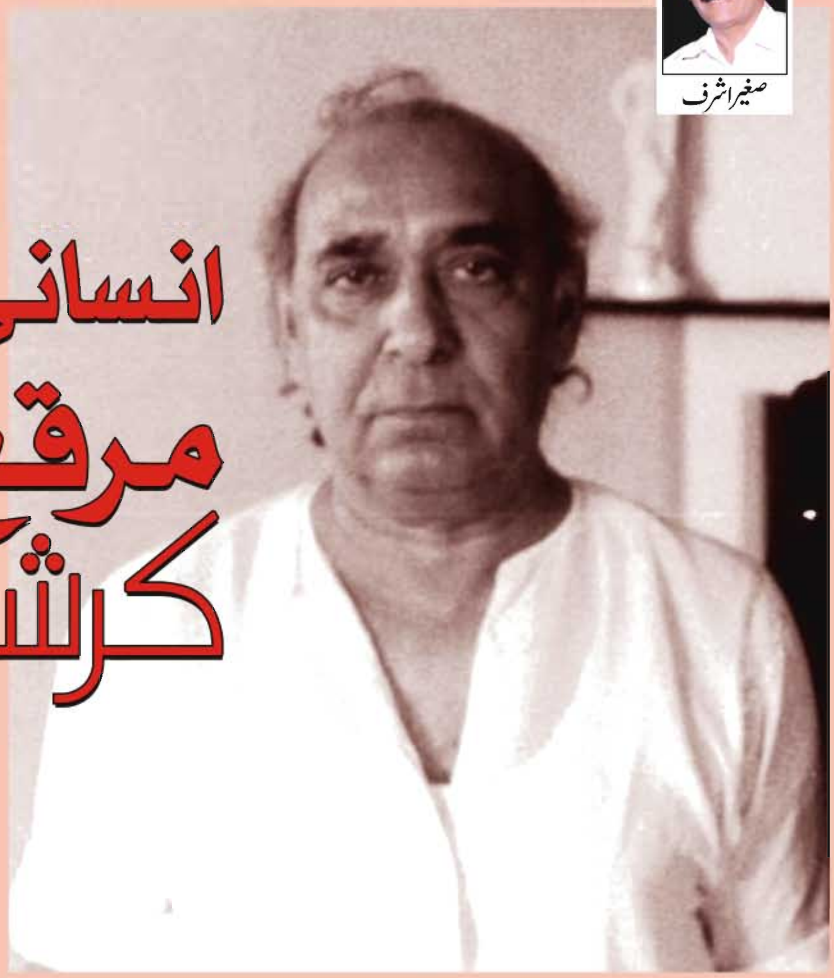

انسانی قدروں کا مرقع نگار کرشن چندر

جموں وکشمیر کے شہر پونچھ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے کرشن چندر کو جنم دے کر 'ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار' اردو کو دیا ہے۔ نثر میں شاعری کرنے والے اور اردو ادب کے گیسوؤں کو سنوارنے والے اس ادیب کا یہ وہ زمانہ تھا جب ادیب اپنی ذات کے لیے نہیں سماج کے اس طبقے کے لیے ہوتا تھا جس کا وہ جُز تھا۔ ایک سادہ اور دل آویز نثر لکھنے کا زمانہ تھا۔ دل ودماغ کو یکجا کر نشاط و جمال آفریں نثر لکھنے کا زمانہ تھا، انسانی وجود کے قلب کی سوئی ہوئی وادیوں کو جگانے اور اپنے ساحرانہ طرزِ بیان سے ان وادیوں کی رنگینی، شادابی اور دلکشی کو قاری کی روح میں منتقل کرنے کا، آہوں، امیدوں، آنسوؤں، مایوسیوں، قہقہوں اور مسکراہٹوں سے آنکھ مچولی کرنے کا زمانہ تھا، وہ زمانہ تھا جب اردو میں افسانہ نے ایک زقند لگائی اور ایک صنف سے بڑھ کر ایک تحریک بن گیا... انتظار حسین کی ایک تحریر کے مطابق ... ''سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر ...'' اس تحریک کے چار ایسے بڑے ستون تھے جن کے جذبوں کی آنچ سے کپکپاتی ہوئی نثر نے اس تحریک کی آبیاری کی اور اردو افسانے کو وہ تنوع، ہمہ جہتی و ہمہ گیری، وسعت و گہرائی اور گیرائی عطا کی جو اردو ادب میں ایک درخشاں ستارے کی طرح آج بھی روشن ہے۔ جن افسانہ نگاروں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں کرشن چندر کا نام نمایاں تھا۔

اردو ادب نے کرشن چندر سے بڑی ہستیاں پیدا کیں لیکن کرشن چندر برِّصغیر کی ترقّی اور حُرّیت پسند تحریکوں میں افق تا افق پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کو ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ خطاب و اعزاز انھیں اردو کی ایک ادب نواز شخصیت خوشتر گرامی (مدیر بیسویں صدی) نے بخشا... کرشن چندر کو اس خطاب سے نوازتے ہوئے اس ادب شناس بزرگ نے کہا تھا کہ ان کا شمار دنیا کے ان چند چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوگا جنھیں ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی...''

(بحوالہ م م راجندر کی ایک تحریر)

افسانہ لکھتے وقت کرشن چندر کے ذہن میں دراصل مالی لحاظ سے کمزور شہریوں، دیہاتیوں کے گلی کوچوں، فٹ پاتھوں پر تڑپتے لمحوں اور جھونپڑیوں کے پُرسکون صحنوں کی زندگیوں کے ابھرتے ڈوبتے چہرے رہتے تھے جن میں وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کو تلاشتے اور اپنی تخلیقات کے تار پود کو بنتے تھے۔

ان کے افسانوں، ناولوں میں خوبصورت عورتوں کا ذکر ان کے متعلق رومانی جزباتی ان کے شروع کے افسانوں میں ضرور ملتی ہے مگر بعد کے افسانوں میں حد سے بڑھی ہوئی رومانیت اور جزباتیت پر قابو پا کر انھوں نے حقیقت پسندی کی طرف اپنی توجّہ منعطف کر لی... خود کرشن چندر اپنی ایک تحریر میں بیان کرتے ہیں ... 'میں صرف عورتوں کے حسن کا ہی نہیں بلکہ اس کی مخصوص نفسیات اور مختلف کیفیات کا بھی عکّاس ہوں۔ میرے افسانوں میں عورت پھول کی طرح شگفتہ، نیلے آسمان کی طرح پاکیزہ اور بچّے کی طرح معصوم نظر آتی ہے، میرے شروع کے افسانوں میں عورت اور مرد کی شخصیت اس قدر دلچسپ، واضع اور اہم ترین ہے جس قدر رومانی ماحول میں ہے... جو پورے افسانے کی فضا پر طاری رہتا ہے۔ حالانکہ ایسے افسانوں میں بھی مردوں کی ریاکاری اور عورتوں کی مظلومی پر سے نقاب اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کہیں کہیں پوری فضا پر وہی رومانی نشہ سا طاری رہتا ہے...'

'جہلم میں ناؤ پر' افسانے میں کرشن چندر نے دو طرح کی عورتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک عورت وہ کہ جسمانی اعتبار سے خوبصورت ہے اور دوسری 'بدصورت' ہے لیکن بدصورت عورت کا دل خوبصورت عورت کے دل سے زیادہ خوبصورت ہے۔ عورت پر مرکوز 'جہلم میں ناؤ پر' افسانے میں جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاند کی سحر فشاں کرنوں پر لرزتی ہوئی اس لڑکی

کوسنیں، جوکانپ رہی تھی اوراس حزیں نغمے کے سیلِ بے پناہ طوفان سے دور بھاگنا چاہتی تھی ...

’ایک دفعہ ایک بدصورت عورت کو دیکھ کر اور آخری لڑکی کو دیکھ کر میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا۔لڑکی نے میری طرف مُبہم ،خمارآلود اور اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا ...وہ نگاہیں شاید کھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں مگر کامیاب نہ ہوسکیں...ان آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر فوراً ہی گم ہوگئی جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے نیلے پانیوں میں کھوجائے۔ اس کا داہنا بازو تھوڑا اوپر اٹھا اور پھر نیچے گر گیا... چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور پھر ایک لمحے میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہوگئی۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے...‘

افسانے کا کوئی بھی لفظ نہ گونگا ہے نہ بہرا بلکہ خاموش صداؤں میں کچھ کہتا، کچھ سنتا، اور کچھ گاتا سا لگتا ہے جومحبت کی دی ہوئی چنگاری میں کسی بھید کو جاننے کے لیے بیتاب ہو...!

کرشن چندر سلجھی ہوئی عادتوں والے آزادخیال ادیب اور انسان صفت ایک ایسے شخص تھے جو کسی مذہبی روایت کے پابند نہیں تھے... کم گو،خوش ذوق اور عاشق مزاج تھے...ان کی طبیعت کا یہی بنیادی جوہر ان کی حسن پرستی تھا... نثر میں شعریت ان کی اسی حسن کاری کا کرشمہ ہے کہ پھولوں سے انھیں پیار تھا، پرفضا وادیوں اور شاداب پہاڑیوں سے انھیں عشق تھا۔کشمیر کی صحت مند فضاؤں میں انھوں نے کہانیاں لکھیں تو نینی تال کی سرسبز وشاداب وادیوں کا ذکر بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں کیا۔کہا جائے تو سلمیٰ، کرشن چندر کو نینی تال کے ہی مرغزاروں کی دین تھیں جنھیں پاکر اس مشہور افسانہ نگار نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بورژوا سماج کے خلاف نبرد آزما ایک بے باک ادیب ہی نہیں ایک باغی انسان بھی تھے۔

سلمیٰ انھیں بے حد عزیز تھیں۔غالباً 1941 میں جب سلمیٰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں، کرشن چندر اور سلمیٰ کے درمیان ذہنی طور پر اتنی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی کہ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور نینی تال میں مہارانی جہانگیرآباد اور دیگر ادبی وسماجی دوستوں کی موجودگی میں 7 جولائی 1941 کی شام جہانگیرآباد پیلیس میں ان کا نکاح ہوا اور دونوں ایک دوسرے کے ہوگئے۔ایک انٹرویو کے دوران سلمیٰ سے جب رحمٰن نیّر (مدیر بیسویں صدی) نے سوال کیا ...’کرشن چندر نے کیا باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے بعد نکاح کیا تھا...؟‘ تو سلمیٰ نے ’ہاں‘ میں جواب دیا اور مزید کہا... ’نکاح کے وقت ان کا نام ’وقار ملک‘ رکھا گیا تھا۔ دراصل لفظ ’ملک‘ انھیں بے حد پسند تھا۔ وقار کے ساتھ ملِک کے اضافے کی تجویز انھوں نے ہی رکھی تھی...‘

’کرشن چندر جی نے اسلام قبول کرلیا تھا تو ان کی آخری رسوم اسلامی طریقے پر کیوں ادا نہیں کی گئی...؟‘ اس سوال کے جواب میں ایک لمبی سرد گہری سانس لے کر سلمیٰ بولیں... ’کرشن صرف ایک انسان تھے ... محبت ان کا مذہب اور اردو ان کی زندگی تھی۔ رسم و رواج کو وہ پرانی غلطیوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے‘۔ خود کرشن نے ان سے کہا تھا... ’وہ (سلمیٰ) جس طرح چاہیں ان کی آخری رسومات ادا کریں...، لیکن سلمیٰ نے ہی نہیں چاہا کہ اس عظیم ادیب کی موت پر کوئی ہنگامہ یا دوفرقوں میں کوئی خلش پیدا ہو... ان کے مطابق... ’کرشن چندر چونکہ کسی ایک کے نہیں کروڑوں لوگوں کے تھے انھیں دفن کیا جاتا تب بھی وہ کرشن چندر ہی رہتے اور آگ کے سپرد کردیا گیا تب بھی وہ کرشن چندر ہی رہے...‘

(’کرشن چندر: بیوی اور دوستوں کی نظر میں‘ رحمن نیر ’بیسویں صدی، کرشن چندر نمبر، مئی 1977)

’کیا کرشن چندر مسلمان تھا... ؟‘ خواجہ احمد عباس جو ہندو مسلمان سے بالاتر انسان دوستی کو اپنا دھرم مانتے تھے کرشن چندر سے متعلق اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں... ’جو مذہب کو ہم دونوں ایک فرد کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے تھے۔ ہم نے نہ ہندو دھرم (مذہب سے زیادہ ایک فلسفہ ہے) نہ اسلام (جو مذہب سے زیادہ ایک کلچر ہے ... ایک طرزِ زندگی، ایک تاریخی ورثہ اور ایک روایت ہے) پر کبھی بات کی مگر یہ معلوم ہے کہ کرشن چندر نے جس طرح مسلمان کرداروں کی نمائندگی کی اپنے ادب میں اس پر لوگ کہتے تھے... ’پچھلے جنم میں تو ضرور مسلمان رہا ہوگا...‘

’کیا کرشن چندر مسلمان تھا...؟‘ خواجہ احمد عباس جو ہندو مسلمان سے بالاتر انسان دوستی کو اپنا دھرم مانتے تھے کرشن چندر سے متعلق اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں... ’جو مذہب کو ہم دونوں ایک فرد کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے تھے۔ ہم نے نہ ہندو دھرم (مذہب سے زیادہ ایک فلسفہ ہے) نہ اسلام (جو مذہب سے زیادہ ایک کلچر ہے ... ایک طرزِ زندگی، ایک تاریخی ورثہ اور ایک روایت ہے) پر کبھی بات کی مگر یہ معلوم ہے کہ کرشن چندر نے جس طرح مسلمان کرداروں کی نمائندگی کی اپنے ادب میں اس پر لوگ کہتے تھے... ’پچھلے جنم میں تو ضرور مسلمان رہا ہوگا...‘

ہندوستان ہی میں نہیں، ایشیا کے عظیم تر ادیب تھے کرشن چندر...! ان کی بیش تر کتابوں کے ترجمے غیرملکی زبانوں میں ہوئے اور ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپنے سے خاصی رقم بطور رائلٹی انھیں موصول بھی ہوتی رہی... مرنے کے بعد کسی ادیب کے پسماندگان کے لیے چند کتابیں، قلم، چشمہ اور دوسری اہم ترین چیزوں کے ساتھ کتابوں کی رائلٹی ہی ان کا سرمایہ ہوتی ہے۔ کرشن چندر دراصل ایک ایسے عظیم شخص اور معروف ادیب تھے جنھیں سرمایہ داری سے نفرت تھی... اور سرمایہ بطور ان کے پاس کچھ تھا تو وہ اردو کی صرف 25 کتابیں اور 30 کے قریب ہندی کی کتابوں سے ملنے والی رائلٹی جس کی حقدار کرشن چندر کی وصیّت کے مطابق سلمیٰ تھیں لیکن اس میں تضاد بھی تھا کہ... کرشن چندر کی پہلی بیوی ودیاوتی کے مطابق ’علیحدگی سے مرتے دم تک ان کی اور بچّوں کی کفالت کے لیے کرشن چندر انھیں 75 روپے ماہوار ...اور بعد میں ایک ہزار روپے ماہانہ انھیں دیتے رہے مگر ان کی کتابوں کی رائلٹی میں وہ خود کو 2/3 کی حقدار اور سلمیٰ کو 1/3 کی حقدار مانتی تھیں۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا جبکہ ڈاکٹر احمد حسن کے مطابق ... ایل ایل بی کرنے کے بعد کرشن چندر نے انگریزی میں مضامین لکھنا شروع کیے جو معاشی اور سیاسی نوعیت کے تھے اور یہ لاہور کے انگریزی روزنامہ ’ٹربیون‘ میں شائع ہوئے۔ 21اپریل 1938 کو جب علّامہ اقبال کا انتقال ہوا تو ’ٹربیون‘ میں انھوں نے ایک مضمون لکھا جس میں اقبال کی چند نظموں کے تراجم پیش کیے

تھے۔ جو بے حد مقبول ہوئے۔ کرشن چندر نے 'دی ناردن ریویو (Northern Review) اور دی ماڈرن گرل (The Modern Girl) جیسے انگریزی کے روزناموں میں بھی مضامین لکھے ...ڈاکٹر احمد حسن لکھتے ہیں کہ ... 'کرشن چندر اگر انگریزی میں لکھتے رہتے تو وہ انگریزی زبان کے ایک بڑے قلم کار ہوتے لیکن چونکہ انھیں اردو زبان کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اردو زبان میں لکھنے کے لیے ان کے اندر کا ادیب انھیں بے چین کر رہا تھا چنانچہ ادبی زندگی اختیار کرنے کے عزم کے ساتھ جب ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا تو سب کی نگاہیں یکا یک ان کی طرف اٹھ گئیں۔ ادبی حلقوں میں ان میں چھپے ہوئے جوہر کا احساس ہونے لگا۔ اور اس دَور کے مشہور جرائد کرشن چندر کے افسانوں کو نمایاں جگہ دینے لگے۔ ان کے اسلوب میں انفرادیت پیدا ہونے لگی اور جتنی جلدی کرشن چندر کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کم ادیبوں کو حاصل ہوئی ہوگی...'

کرشن چندر کا اندازِ تحریر نہایت شگفتہ بے ساختہ اور بے حد حسین تھا، جس پر اہلِ زبان رشک کرتے تھے اور کہتے تھے ... 'اس صدی کے بہت بڑے افسانہ نگار اور سب سے بڑے نثر نگار پریم چندر سے لے کر آج تک کسی ادیب نے اتنی خوبصورت نثر نہ لکھی ہوگی۔' کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ خود بھی ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں ... 'لفظوں کی تراش خراش، بندشوں کی نزاکت، حسین لفظوں کا اجتماع، مطالب کی گہرائی، طنز و مزاح کا اتنا حسین امتزاج، فطرت کی رنگینی اور انسان کی بہیمیت اور شقاوت، حسن اور حیوانیت کی مکمل داستان جو ان کے افسانوں میں ملے گی ... اور کہیں نہیں...'

'یرقان' کو کرشن چندر کا پہلا افسانہ بتاتے ہوئے مہندر ناتھ لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ افسانہ کالج کے دنوں میں لکھا تھا۔ ان پر ایک بار یرقان کا حملہ ہوا تھا... اور اس بیماری کے بعد ہی کرشن چندر نے افسانہ 'یرقان' لکھا جس پر یرقانیت کا کافی اثر ہے۔' کرشن چندر کے اس پہلے افسانے کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے... 'یہی بیماری اس مختصر سے قصے کی ابتدا تھی، نہ میں بیمار پڑتا نہ شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما سے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کی میری محبوبہ ہے یعنی میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے... جو اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حُسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں... شاما وہ خط مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ بے چاری ان پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک، ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی ہے... لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گلِ عارض پر چمک اور آنکھوں میں دمک آ جاتی ہے... لب کانپتے ہیں۔ اور پھر مجھے اس کی مہین و شیریں آواز سنائی دیتی ہے... 'آگے کیوں نہیں پڑھتے...؟'... اور میں بھلا پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا'... محبت؟ نہیں یرقانیت!... یا اللہ... مجھے محبت ہے کہ یرقان...'

1936 میں کرشن چندر نے پہلا انشائیہ مضمون 'ہوائی قلعے' لکھا جو 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوا تو مدیر 'ہمایوں' نے اس مضمون کو ان الفاظ میں سراہا۔ 'کرشن چندر کا شمار اردو کے موجودہ ادبا کی صفِ اوّل میں ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان، سیر حاصل رنگین تخیّل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔' ایک انتساب بطور 'ہوائی قلعے' کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔ 'ہوائی قلعے کا موضوع ہے ہندوستان میں 'خیالی پلاؤ'... فرق صرف یہ کہ 'خیالی پلاؤ' ہندوستان کی مثالی 'بھوک' کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔' یہ ایک محدود سی اصطلاح ہے جس کا مرجع 'پیٹ' ہے لیکن 'ہوائی قلعے' ایک بلند اور وسیع ترین اصطلاح ہے اور اس میں نہ صرف خیالی پلاؤ بلکہ کئی ایک اور دلکش چیزیں بھی شامل ہیں جن کے وجود سے ہندوستان ابھی ناآشنا ہے۔

1936 میں کرشن چندر نے پہلا انشائیہ مضمون 'ہوائی قلعے' لکھا جو 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوا تو مدیر 'ہمایوں' نے اس مضمون کو ان الفاظ میں سراہا۔ 'کرشن چندر کا شمار اردو کے موجودہ ادبا کی صفِ اوّل میں ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان، سیر حاصل رنگین تخیّل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔' ایک انتساب بطور 'ہوائی قلعے' کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔ 'ہوائی قلعے کا موضوع ہے ہندوستان میں 'خیالی پلاؤ'... فرق صرف یہ کہ 'خیالی پلاؤ' ہندوستان کی مثالی 'بھوک' کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔' یہ ایک محدود سی اصطلاح ہے جس کا مرجع 'پیٹ' ہے لیکن 'ہوائی قلعے' ایک بلند اور وسیع ترین اصطلاح ہے اور اس میں نہ صرف خیالی پلاؤ بلکہ کئی ایک اور دلکش چیزیں بھی شامل ہیں جن کے وجود سے ہندوستان ابھی نا آشنا ہے۔ اس میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ 'خیالی پلاؤ' میں 'ہوائی قلعے' نہیں سما سکتے۔ لیکن 'ہوائی قلعے' میں بیٹھ کر 'خیالی پلاؤ' پکائے جا سکتے ہیں ... غور کیا جائے تو اس لحاظ سے سارا ہندوستان ایک 'ہوائی قلعہ' معلوم ہوتا ہے...'

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کیا تھا پھر وہ افسانہ نگاری کی طرف متوجّہ ہوئے۔ یہی وہ فن تھا جس نے انھیں عالمی شہرت عطا کی لیکن طنز و مزاح کا عنصر ان کی تحریروں میں ہمیشہ شامل رہا۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون 'ماسٹر بلاقی رام' تھا جسے دسویں جماعت میں لکھا تھا جو ایک مزاحیہ اخبار 'ریاست' میں شائع ہوا۔ جس کے مدیر 'دیوان سنگھ مفتون' تھے۔ ان کے مزاحیہ مضمون کی شکل میں 'عورتوں کا سال' ان کی آخری مزاحیہ تحریروں میں شامل ہے۔

جدید اردو ظرافت کے علمبرداروں میں کرشن چندر کی حیثیت ایک روشن مینارہ کی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیّا لال کپور، شفیق الرحمٰن اور ان کے دوسرے تمام ممتاز معاصرین میں کرشن چندر محترم اور منفرد ہیں۔ احمد جمال پاشا اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں۔ 'طنز و مزاح، تحریف، انشا، زبان و بیان، فن، اسلوب، لہجہ، تکنیک، شعور، نظریے، آدرش، مشاقی، مواد و معیار اور مقدار کے اعتبار سے کرشن چندر لاثانی اور لافانی ہیں۔ ان کے مضامین اور افسانوں کی ظریفانہ کیفیت بہت عام ہے۔ ان کے سنجیدہ سے سنجیدہ مضامین اور افسانوں میں آپ کو پھلجھڑیاں چھوٹتی نظر آئیں گی۔ خواہ وہ چٹکیاں لے لے کر ہنسائیں یا گدگدا کر یا بڑی معصومیت سے اپنے ناظر کو تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر اس کے پیٹ میں ہنسی کے بل ڈال دیں یا اس کے منہ سے ہنسی کے فوارے جاری کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ زندگی کی اس ناہمواری پر کرشن چندر خود بھی اس کے قہقہوں میں شامل ہو جائیں یا اپنی ہنسی میں اس کو بھی شریک کر کے فضا زعفران زار بنا دیں...'

کرشن چندر کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'طلسم خیال' تھا جسے چودھری نذیر احمد نے چھاپا، جس کے چھپنے سے پہلے ہی ان کے افسانے عوام میں خاصے مقبول اور عام ہو چکے تھے اور ان کی ادبی حیثیت میں بھی خاصا اضافہ ہوا تھا۔ اوپیندر ناتھ اشک، کنھیّا لال کپور اور دیگر ادیبوں سے بھی ان کے مراسم بڑھے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ لاہور آئے تو مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب، میرا جی، احمد ندیم قاسمی، عاشق حسین بٹالوی، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، ممتاز مفتی، فیّاض محمود اور چودھری نذیر احمد جیسے معتبر ادیبوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہیں کرشن چندر کی ریڈیو سے بھی وابستگی ہوئی۔ نئے اور پرانے ادیبوں کی آماجگاہ بنے آل انڈیا ریڈیو

کے کرتا دھرتا ان دنوں پطرس بخاری تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ جہاں کہیں کوئی ذہین ادیب انھیں نظر آتا وہ اسے ریڈیو اسٹیشن کی نوکری آفر کر دیتے... کرشن چندر کو بھی انھوں نے ہی نوکری آفر کی تھی۔ اس نوکری کے لیے انھوں نے بھلے ہی ہاں کر لی تھی مگر وہ خود ذہنی طور سے اپنے اس فیصلے سے خفا اور خود سے ناراض رہے۔ اس ذہنی کیفیت کا اظہار انھوں نے 1936 میں شائع اپنی کتاب کے انتساب میں بھی تحریر کیا تھا... 'اس کرشن چندر کی یاد میں جسے گزشتہ نومبر کی ایک کثیف اور اداس شام کو خود ان کے ہاتھوں نے گلہ گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا...'

کرشن چندر کا دراصل یہ ماننا تھا کہ کوئی ادیب سرکاری محکمہ میں نوکری کر کے اچھّا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ خاص کر وہ ادیب جو سوشلسٹ خیال کا حامی ہو اور انقلابی نقطۂ نظر رکھتا ہو... آخر کار لاہور ریڈیو اسٹیشن کی نوکری چھوڑ کر وہ دلّی آئے اور دلّی ریڈیو اسٹیشن جیسے ان کا منتظر تھا۔ یہاں ان کی ملاقات ریوتی سرن شرما، فیض احمد فیض، ن م راشد، ہنس راج رہبر، شاہد احمد دہلوی ایسے معتبر ادیب و شاعروں سے ہوئی۔ منٹو، اشک، میرا جی، جیسے ادیب ان دنوں دلّی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھے۔ اور معیاری ریڈیو ڈرامہ پروڈیوس کیے جا رہے تھے۔ کرشن چندر نے بھی اپنا مشہورِ زمانہ ڈرامہ 'سرائے سے باہر' لکھا اور منٹو، اشک کے لکھے ڈراموں کی کھیپ میں وہ براڈ کاسٹ بھی ہوا...

اس بیچ کرشن چندر کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا۔ شوکت تھانوی نے لکھنو ریڈیو اسٹیشن چھوڑ کر پنچولی آرٹ پروڈکشن جوائن کر لیا تھا اور کرشن چندر بطور ریڈیو ڈرامہ اور اسکرپٹ رائٹر انچارج لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہاں ان کے انسانے اور دیگر تخلیقات ہندوستان بھر کے ادبی جرائد میں دھڑلّے سے شائع ہو کر مقبول ہو رہی تھیں... ان کی شہرت کا ڈنکہ اس وقت پورے ہندوستان میں بج رہا تھا اور افسانہ نگاروں کا قافلۂ سالار انھیں سمجھا جانے لگا تھا... یہیں وہ احتشام حسین، مجاز، سبطِ حسن، حیات اللہ انصاری اور دیگر ادیبوں کی خیال افروز باتوں سے مستفید بھی ہوئے...'

اس دوران پونا سے ایک پروڈیوسر نے انھیں اپنی فلم کمپنی میں بحیثیت مکالمہ نگار نوکری کی پیشکش کی۔ فلمی دنیا میں کام کرنے کا ارادہ تو کرشن چندر نہیں رکھتے تھے لیکن اس پیشکش سے انھیں اپنی راہیں مزید کھُلتی ہوئی نظر آئیں... وہ ممبئ آ گئے۔ فلمی دنیا میں کام کرنے کا ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا... نئ دنیا نئے چہرے، نئ قدریں، نیا ماحول، نرالی اور انوکھی باتیں، نئے سوال، جن کے جواب تلاش کرنے کا ایک نیا تجربہ تھا... نیکی، شرافت، اچھّائی، برائی، اخلاق اور دیگر قدروں کا فقدان تھا...، وشوامِتر عادل، نیاز حیدر، عادل رشید، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عبّاس، اعجاز احمد، ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، اختر الایمان اور دیگر ادیبوں سے کرشن چندر کی ملاقات رہتی تھی۔

یہاں کے فلمی ماحول میں سانس لیتے ہوئے کرشن چندر نے دو فلمیں... 'سرائے سے باہر' اور 'دل کی آواز' بنائیں اور انھیں پروڈیوس بھی کیا، ڈائرکشن بھی دی...، لیکن بزنس میں نہ صرف گھاٹا ہوا بلکہ انھیں زندگی کے اک نازک دَور میں لا کھڑا کیا...، یہ وہ دور تھا جب انسان کو اپنی عظمت،

اپنی محنت، تدبّر و سنجیدگی، ذہانت و ذکاوت تک کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا تھا...، قنوطیت و یاسیت کا شکار ہو کر انسان راہ سے بے راہ ہو جاتا تھا... لیکن کرشن چندر نے کبھی ان نامساعد حالات کا رونا نہیں رویا۔ اور اپنے قلم کو کسی طور بھی زنگ نہ لگنے دیا... اور مسلسل لکھتے رہے... اور جو کچھ لکھا وہ صلے اور ستائش سے بے نیاز ہو کر لکھا۔

افسانوں کے علاوہ کرشن چندر نے اور بھی بہت کچھ لکھا... لیکن افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس نے کرشن چندر کو ذرّہ سے آفتاب بنا دیا اور وادیوں کی گہرائی سے فلک بوس چوٹیوں تک پہنچا دیا۔ یہ کمال کرشن چندر کے جادوئی قلم کا تھا کہ وہ صحرا میں کھڑے ہوئے تنہا درخت اور سڑک کے کھمبے پر ایک کامیاب افسانہ یکساں انداز میں لکھ سکتے تھے... روز نامہ 'امروز' لاہور کی ایک اشاعت میں قمر تسکین لکھتے ہیں... 'گورنمنٹ کالج (لاہور) کے سامنے والی سڑک جو گول باغ سے چوک انارکلی، نیلا گنبد تک رواں دواں ہے... کرشن چندر کی مخصوص گزرگاہ تھی جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے گھر موہنی روڈ پہنچا کرتے تھے... 'دو فرلانگ لمبی سڑک' انھوں نے اسی سڑک پر لکھی تھی جو ان کے گہرے مشاہدے کا واضع ثبوت ہے...،

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی ابتدا لاہور سے ہوئی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ لاہور کے ہی ادبی رسالے میں شائع ہوا، لاہور کے ہی ایک پبلشنگ ہاؤس نے ان کی پہلی کتاب چھاپی اور لاہور نے ہی ان کی تعلیم و تربیت کو سنوارا۔ اسی لیے لاہور سے انھیں محبت تھی تو لاہور کے گلی کوچوں سے انھیں بے انتہا پیار تھا...، لاہور سے کوئی ادیب و شاعر، یا ادب نواز کوئی... ممبئ میں ان سے ملنے آتا تو وہ لاہور کے در و دیوار کو سلام ضرور بھجواتے تھے، لاہور میں رہتے ہوئے انھیں ممبئ کی دوری میں کسی فاصلے کا شائبہ تک نہ ہوا...، اپنے احباب سے وہ اکثر (لاہور) اپنے مخصوص ٹھکانوں پر پہنچ کر ان سے بات چیت کے ذریعے ہی سہی، نصف ملاقات کر لیا کرتے تھے... قمر تسکین لکھتے ہیں... 'مال روڈ کے کافی ہاؤس، انڈیا ہاؤس، نیلا گنبد بیکری، اور لاہور کا عرب ہوٹل ان کے مخصوص ٹھکانے تھے جہاں بیٹھ کر وہ اپنے احباب سے گپ شپ کیا کرتے تھے۔ لاہور سے تقریباً چودہ سو میل دور ممبئ میں مقیم احباب سے انھیں یہ دوری لاہور سے بیگانہ نہ کر سکی تھی...'

عجز و انکسار کے ایک ایسا پیکر تھے کرشن چندر، جنھیں کسی بھی ملک کے سرحد پار کے ادب نواز عوام کسی طور نہیں بھلا سکتے... وہ اردو کے تھے ہی ایسے محبوب افسانہ نگار جن کا نام انسانی قدروں کے مرقعہ نگار کی حیثیت سے تاریخِ ادب میں ہمیشہ رقم رہے گا...، قلم کے اس جادوگر کے بارے میں... ناقدین نے ان کے ادیبانہ فن پر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے لکھا ہے... 'کرشن چندر،... میر و غالب اور اقبال کے بعد اردو تخلیقی ادب کے افق پر فکر و فن کی برگزیدگی کے ساتھ روشن ہونے والا سب سے بڑا اور سب سے اونچا مینار ہے...!' اسی طرح... رومانویت و حقیقت نگاری کا وہ دلکش امتزاج جو فیض کی نظموں میں ہے، ساحر کی شاعری میں ہے،... ترقّی پسند افسانہ نگاروں میں کہیں ہے تو صرف کرشن چندر کے یہاں...! کرشن چندر کے ساحرانہ طرزِ بیان، سادہ اور دل نواز کہانیوں میں انسان کے مقدّس اور معصوم جذبات دل کی طرح دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں سے روشناس کراتے ہیں...

■

Sagheer Ashraf, Urdu Counsellor (Kumaon) Open University (P.G. College), Ex-Postmaster H.S. G. II, Khatari- Ram Nagar (Nainital) U.K - 244715

تاثیر نواز میر

کرشن چندر کی ڈرامہ نگاری

کرشن چندر کا نام زبان پر آتے ہی ایک لافانی فکشن نگار کا نقش ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ بیسویں صدی کے چند اہم فکشن نگاروں میں کرشن چندر کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ناول نگاری و افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی کامیاب ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ کرشن چندر روایت کی پاسداری اور پرواہ سے بالا ہو کر اپنے ترقی پسندانہ مزاج کا عکس اپنے ڈراموں میں بھی بکھیرتے ہوئے اپنا راستہ خود تلاش کرتے ہیں۔ سماج کا ہر پہلو اور ہر عکس ان کے ڈراموں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ زندگی اور معاشرے کے متضاد پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی ڈراما نگاری انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی سامنے لے آتی ہے۔ بیکاری، قاہرہ کی ایک شام، دروازہ، نیل کنٹھ، سرائے کے باہر اور، دروازے کھول دو ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔

کرشن چندر کی ڈراما نگاری کا آغاز 1936 میں ڈراما 'بیکاری' سے ہوتا ہے۔ اسی سال لندن میں سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ کرشن چندر ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ جس کا اثر ان کے ڈراموں میں ان کے عہد کے مختلف سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کے عکس کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈراما چونکہ حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے یہ نہ صرف زندگی اور معاشرے کے متنوع اور متضاد پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ان کے باطنی اور خارجی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ کرشن چندر بھی اپنے ڈراموں میں ان حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہیں جو سماج میں رائج طبقاتی کشمکش کے لیے ذمے دار ہیں جنھیں وہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان میں سماجی نابرابری، اونچ نیچ، ذات پات، بھید بھاؤ، چھوت چھات اور دیگر سماجی و سیاسی محرکات شامل ہیں۔ اس طرح کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی ہمیں ان کے ڈراموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا ڈراما 'سرائے کے باہر' خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

ڈرامے میں انھوں نے جاگیردارانہ ذہنیت اور نچلے طبقے کے استحصال کو ظاہر کیا ہے جس کے لیے سرائے کے باہر زندگی بسر کرنے والے ایک بھکاری کے کنبے کے خدوخال اور سرائے کے اندر رونما ہونے والی بدعنوانیوں کا بھرپور نقشہ پیش کیا ہے۔ منی اندھے بھکاری کی نوجوان بیٹی ہے جو اپنے باپ کے لیے روٹی مانگ کر لاتی ہے۔ منی پر ہر آنے جانے والے کی نظر جمی رہتی ہے ہر کوئی اس کی جوانی پر لعن وطعن کرتا ہے مثلاً سرائے کی نوکرانی اس کو کس طرح للکارتی ہے:

''منی: بی بی کچھ کھانے کو دو گی صبح سے بھوکی ہوں۔

بی بی: پرے ہٹ نامراد، کیوں اندر گھسی چلی آتی ہے۔ جا کسی مشٹنڈے کے بغل میں بیٹھ اور چین سے رہ۔ تیری جوانی کو آگ لگے'' (سرائے کے باہر)

بھکاری پن کی زندگی گزارتے ہوئے منی کی زندگی اتنی تلخ بن چکی ہے کہ وہ اپنے والدین سے بھی گستاخی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے:

''اندھا بھکاری: منی بیٹا بڑی بھوک لگی ہے۔

منی: تو مجھے کھالو۔ بھوک لگی ہے۔ بھوک لگی ہے۔ جب سنو بھوک لگی ہے۔ جانے یہ پیٹ ہے کیا بلا۔ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ ادھر بی بی الگ گالیاں دیتی ہے اور ادھر میری جان کو کھائے جاتے ہیں''

منی کے والدین بھی اسے کسی اچھے مالدار کو فروخ کرنا چاہتے ہیں لیکن انھیں کوئی مناسب خریدار نہیں ملتا ہے۔ اس کا باپ کسی بنیے سے اس کا پانچ سو میں سودا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ردعمل میں جو گفتگو اس کے باپ اور ماں کے درمیان ہوتی ہے اس کا نقشہ کرشن چندر یوں پیش کرتے ہیں:

''بھکارن: تم کیا کرو گے ان پانسو روپے سے

اندھا بھکاری: ان پانسو سے پھر ایک قطعہ زمین خرید لیتا، گائیں رکھتا، بھیڑ بکریاں۔ میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت سا گھر ہوتا، کچی مٹی کا بنا ہوا۔ کھڑیا مٹی سے پتا ہوا۔ منی کی اماں تجھے کیا معلوم ہے کہ بھکاریوں کی ٹولی میں داخل ہونے سے پہلے میں ایک کسان تھا۔''

اس ڈرامے میں کرشن چندر نے ہندوستانی سماج کے دو رخ دکھائے ہیں۔ ایک طرف غریب ومظلوم طبقہ ہے جو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنی بیٹی تک کو بیچنے پر مجبور ہے اور دوسری طرف وہ عیاش اور دولت مند لوگ دکھائے گئے ہیں جو معصوم اور مظلوم لوگوں کے خون کو چوستے ہیں اور اپنی ہوس کی خاطر ان معصوموں کی زندگی، ان کے خواب وارمانوں کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں۔

'دروازے کھول دو' کرشن چندر کے شاہکار ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں انھوں نے تہذیب و معاشرت کی عکاسی ایسے بھرپور انداز میں کی ہے کہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے خاص کر ان پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے جو ہمارے سماج ومعاشرے میں پھیلی ذات پات اور بھید بھاؤ کو بیان کرتے ہیں۔ اس وضاحت کے لیے کرشن چندر ایک پنڈت پراپرٹی ڈیلر رام دیال کی بلڈنگ کا انتخاب کرتے ہیں جہاں ہر مذہب اور فرقے کے لوگ فلیٹ خریدنے آتے ہیں ان میں مسلمان، سکھ، ہندو پٹھان، ڈاکٹر، مدراسی ہوٹل والا وغیرہ شامل ہیں۔ ان لوگوں سے رام دیال فلیٹ سے متعلق ایگریمنٹ کرواتا ہے لیکن ان کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتے ہی انھیں ذات پات اور بھید بھاؤ کی وجہ سے فلیٹ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ کرشن چندر نے بڑے موثر انداز میں اس صورت حال کی عکاسی کی ہے کہ جب ایک مرد اور عورت جو اصل میں مسلمان ہیں اور پنڈت رام دیال سے فلیٹ حاصل کرنے کی خاطر وہ اپنا نام ہندو بتاتے ہیں۔ رام دیال انھیں فلیٹ دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ایگریمنٹ لکھونا شروع کرتا ہے لیکن جیسے ہی اسے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصل میں مسلمان ہیں تو فلیٹ دینے سے انکار کرتا ہے اور ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''رام دیال: تم دونوں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ کیا ڈراما کھیلا ہے مجھ سے۔ میں نے تمہاری باتوں پر وشواس کر لیا تھا، جھوٹے، مکار، وشواس گھاتی۔''

غصے کی حالت میں رام کی زبان سے مزید یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''رام دیال: (خفا ہو کر) اردو بازار جائیے، جامع مسجد کے چوک جائیے، خدا بخش کے محلے جائیے، بہت سی جگہیں ہیں آپ کے رہنے کے لیے۔ کیا ضروری ہے کہ آپ میرے ہی سر چڑھ کر رہیں؟ ہوں! بڑے آئے تقریر کرنے والے میرا دماغ چاٹ لیا۔ یہاں کوئی فلیٹ خالی نہیں ہے۔''

اس ڈرامے کا ہر کردار درمیانی طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اپنی تہذیب و کلچر کا نمائندہ ہے۔ اپنے ماحول کی پیداوار ہونے کے باوجود فرسودہ جکڑ بندیوں سے نجات پانے کے لیے مسلسل جدوجہد میں نظر آتے ہیں لیکن رام دیال کو روایت پرستی، مذہبی تنگ دلی، طبقاتی اور علاقائی منافرت نے بری طرح سے جکڑ رکھا ہے۔ رام دیال بدلتے وقت کے ساتھ خود کو بدلنے کا قائل نہیں ہے۔ سیٹھ رام دیال کے علاوہ سبھی کردار نئی روشنی اور نئی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ وہ نئے دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ بات چاہے کریم اللہ کی ہو یا آفتاب رائے یا پھر ڈاکٹر ویلو کی، سبھی منطقی عوامل سے گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

'ایک روپیہ ایک پھول' کرشن چندر کا ایک مختصر سا ڈراما ہے۔ جس میں ایک حسین اور مغرور کروڑپتی لڑکی مس باٹلی والا کے کردار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اونچے طبقے کی لڑکیاں کس قدر مغرور ہوتی ہیں۔ اس کی ایک خادمہ میری اس کے ہر راز سے واقف ہے اور مس باٹلی والا سے زیادہ ذہین بھی ہے۔ مس باٹلی والا کے معاشقے نہ جانے کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں ڈرامے سے اعلیٰ طبقے کی سوسائٹی میں رونما ہونے والے حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''بیلا: میری یہ میرا منگیتر تھا

میری: کون سا سرکار، ساتواں یا آٹھواں''

اس ڈرامے میں کرشن چندر نے سندھی رفیوجیوں کی سیدھی سادی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے جنھیں مس بیلا دو ہزار روپے چندا دیتی ہے اور اسی لیے اسے وہ لوگ اپنے جلسے میں مہمان خصوصی کے طور پر بلاتے ہیں جہاں وہ بے تکی سی تقریر کرتی ہے اور سارے مہاجر زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ چند مکالمے:

''آپ نے کھانے کی شکایت کی یہ شکایت مجھے بھی کبھی کبھی ہوتی ہے............ میرا خیال ہے کہ آپ صرف ایک وقت کا کھانا کھائیں......

کپڑے کے متعلق انسان کو زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔ پرماتما نے انسان کو ننگا پیدا کیا اگر اس کو ہمیں کپڑے دینے ہی ہوتے تو وہ ہمیں کبھی ننگا پیدا نہیں کرتا۔

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آج کل کپڑا کم بلکہ اگر ہو سکے تو بالکل ہی نہ پہننا فیشن میں داخل ہو چکا ہے۔''

ڈراما 'کتاب کا کفن' میں کرشن چندر نے اپنے زمانے کے شاعروں اور ادیبوں کی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ یہ ڈراما کافی حد تک ان کے ذاتی تجربے کو بھی پیش کرتا ہے۔ ایک طرف شاعر اور ادیب، جو اپنی عمر ادب کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں اور کئی کتابیں تصنیف کرتے ہیں وہیں دوسری طرف پبلشرز (Publishers) ان کی انھی کتابوں سے لاکھوں روپے کماتے اور صاحب کتاب کو اس میں سے ان کا جائز حصہ تک نصیب نہیں ہوتا اور انھیں چند روپیوں کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔

کرشن چندر نے اپنے عھد کی تہذیب و معاشرت کو بڑے قریب سے دیکھا ھے اور گھرے مشاھدے اور تجربے کے بعد انھوں نے زندگی کے ھر پھلو کو اپنے ڈراموں میں پیش کرنے کی کوشش کی ھے۔

''تیواری: متاجی! یہ میری کتابیں ہیں۔ یہ مجھے روٹی نہیں دے سکتیں لیکن میری بیوی کا کفن تو بن سکتی ہیں۔ دیکھیے (کونٹر کی طرف اشارہ کر کے) یہ میری بیوی کی ارتھی ہے۔ اوپر صبح کا تارا ہے، نیچے دل کی فریاد ہے۔ بیچ میں میری بیوی کی ارتھی ہے...... اب میں اس کفن کو آگ لگا دوں گا'' (کتاب کا کفن)

اس سلسلے کی اگلی کڑی ان کا ڈراما 'حجامت' ہے۔ پولیس آفیسروں کی بے توجہی اور لاپرواہی اس ڈرامے کا خاصہ ہے۔ ڈرامے کا مرکزی کردار دولا شاہ ہے جو دراصل ایک پاگل ہے اور سر بازار پولیس والوں کے سامنے بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ میں نے اپنے بھائی کا خون کیا ہے، چنانچہ مجھے سزا ملنی چاہیے۔ اس کا یہ شور و غل سن کر ایک سپاہی اسے تھانے لے آتا ہے جہاں تھانے دار حسب روایت اس سے پوچھ تاچھ کرتا ہے۔ یہاں تھانیدار کی کاہلی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک قاتل کے قتل تسلیم کرنے کے باوجود وہ بائیس سال پرانا ریکارڈ دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔ دولا شاہ جب بار بار اپنے لیے سزا کی گزارش کرتا ہے تو پولیس آفیسر اس سے یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس بہت سارے نئے کیس حل کرنے کے لیے پڑے ہیں اور اتنی فرصت نہیں کہ پرانے کیس کھولے جائیں لہٰذا تم گھر چلے جاؤ۔ ڈرامے کے مطالعے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں اگر کسی کو قید کیا جاتا تھا تو اس کو سزا پر بھیجنے سے پہلے اس کی حجامت کی جاتی تھی اور سر کے بال منڈوائے جاتے تھے۔

'کتے کی موت' ایک مزاحیہ ڈراما ہے جس میں کرشن چندر نے ایک مغرور کروڑپتی حسینہ مس بیلا کے بیمار کتے کو موضوع بنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ امیر گھروں کی طرز معاشرت کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ کتے کے بیمار ہونے سے گھر میں اس طرح ماتم چھا جاتا ہے جیسے کسی عزیز کی موت واقع ہوئی ہے۔ کتے کے لیے ڈاکٹروں کو ضرورت سے زیادہ پیسے دیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بھی یہ شیوہ اپنا رکھا ہے کہ غریب لوگوں کے علاج کے بجائے وہ امیر لوگوں کے کتوں کے علاج میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ مس بیلا کا ڈرائیور ایک جوتشی سے کتے کے علاج کے لیے کہتا ہے۔ مس بیلا اس جوتشی کے مشورے پر ایمان لاتے ہوئے پانچ سو کالے کتوں کے کھانے کا اہتمام کرتی ہے۔

جوتشی: دیکھا آپ نے یہ وہی کالے کتے کی روح ہے جس کے خوف سے آپ کا ٹامی رو رہا ہے اور بیمار پڑا ہے۔'' (کتے کی موت)

جب بیلا کا کتا ٹھیک ہو جاتا ہے تو وہ بے حد خوش ہو جاتی ہے گویا اسے دنیا کی ساری خوشیاں مل گئی ہیں۔ اس خوشی کے موقع پر وہ ناچ گانے کا اہتمام کرتی ہے۔ اسی دوران معلوم ہوتا ہے کہ رام دین (مس بیلا کا خانساماں) کا بیٹا جو بیمار تھا انتقال کر گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے اور پھر ناچ گانا شروع ہو جاتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو، بس ایک کتنے کی موت واقع ہوئی ہو۔

کرشن چندر نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور گہرے مشاہدے اور تجربے کے بعد انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو اپنے ڈراموں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اعلیٰ طبقے کی مغروریت پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبقہ جہاں ایک طرف غریب انسانوں کا خون چوستا ہے وہیں دوسری طرف انھیں اتنا حقیر اور بے حس سمجھتا ہے کہ گویا ان کی سماج میں کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ سماج میں رونما ہونے والے ہر طرح کے حالات کو انھوں نے اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ ڈراما نیل کنٹھ، سرائے کے باہر، کتاب کا کفن اور دروازے کھول دو اس اعتبار سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

■

Taseer Nawaz Mir, Lecturer in Urdu, C/O - Deptt. of Urdu, Govt. Degree College Bhaderwah Tehsil - Bhaderwah, District - Doda, Jammu and Kashmir

کرشن چندر اور ادب اطفال

ستار فیضی

بچوں کے عالمی ادب میں 'رابنسن کرب سو' کو پہلا ناول مانا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی سے ناول ایک نثری ادب پارے کو کہا جانے لگا۔ انگریزی کے اثر سے ناول اردو میں آیا۔ لیکن اردو نثر کی تاریخ میں داستانوں کا دور ختم ہونے کے بعد بیسویں صدی تک زمانے میں کئی کہانیوں کی موجودگی یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ناول اردو ادب میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ پھر ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اردو ادب میں اپنی افادیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ ناول ایک نثری صنف ہے اور دل آویز نثری فن پارہ بھی۔

ناول کے اجزا جیسے موضوع، پلاٹ، کردار، مکالمے، منظرنگاری، زماں و مکاں، زبان و بیان نظریہ حیات جذبات نگاری سے ہی ناول میں جان پیدا ہوتی ہے۔ اردو کے کئی ناول نگاروں نے اس صنف کی خدمت کی۔ انھوں نے ناول کے معیار کو قائم رکھا اور اس کے فن کو سنوارا ہی نہیں بلکہ اس کے تخلیقی حسن کو نکھارا بھی۔

اردو کے ادبِ اطفال میں ابتدائی دور میں ایسی ہی تخلیقات ہیں جو تراجم یا ماخوذ شکلوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً عظیم بیگ چغتائی کا بچوں کا ناول 'قصر صحرا' ہے۔ سندباد جہازی کا 'سفرنامہ' مقبول عام ناول سمجھا جاتا ہے۔ ان ناولوں کے پلاٹ اور موضوع بچوں کو ایک انوکھی دنیا کی سیر کراتے ہیں۔ بچے مختصر کہانیوں کے برخلاف لمبی لمبی کہانیاں سننے پڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں کیونکہ یہ ان کی فطری دلچسپی ہے۔ طویل کہانیوں میں یہ سیر و سیاحت، دلچسپ واقعات اور حیرت و استعجاب پسند کرتے ہیں۔ ناول ہی میں ان کو یہ ساری باتیں ملتی ہیں۔ بچے ناولوں سے ذہنی تشفی و سکون محسوس کرتے ہیں۔ بچوں کے ناولوں کے تمام تر واقعات اور حادثات ہماری زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے انھیں متاثر کرتے ہیں۔

بچوں کے ناول ایسے ہونے چاہئیں جوان کے مسائل کو سلجھانے میں کارفرما ہوں۔ ان کے اندر ہمت، استقلال، حق گوئی، ایمانداری، دیانت داری، سمجھداری وغیرہ اچھے جذبہ پیدا کرسکیں۔ تفریح کے علاوہ خیالات، معلومات اور تجربات میں اضافہ کرتے ہوں۔

اس کے علاوہ بچوں میں قوت تخیل اور تجسس کا مادہ بھی پیدا ہو۔ ناول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اپنی کردار سازی بھی کریں۔ پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے بچوں کے ناول کو چھ مختلف اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔

اردو زبان میں بچوں کے لیے بھی تقریباً ہر اہم موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔ ان ناولوں میں انسانی تہذیب و تمدن انوکھی مہمات، سراغ رسانی کے واقعات، اخلاقی و سماجی موضوعات، فنطاسیہ، مافوق الفطری واقعات سائنسی ناول، ہلکے پھلکے واقعات مزاحیہ ناول بھی اردو ادب اطفال کے سرمایے میں شامل ہیں۔

> **سائنس فکشن جہاں بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم کرتا ہے وہیں انہیں خلائی مہمات، فضائی سیر و سیاحت اور اسی نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ آج کے بچے تو خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرتے ہیں اور انسان خلا میں جاکر اپنی ہی دنیا کو چھوٹے سے ستارے کی شکل میں دیکھتا ہے۔**

آپ اور ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا تخیلاتی اڑن کھٹولا اب پرانی چیز ہوگئی۔ بچوں کی فکر میں بلندی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ آج کے بچے اب مافوق الفطرت واقعات خلائی معلومات میں بے حد دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عصر حاضر میں سائنس فکشن نے بچوں کے ادب میں منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔

سائنس فکشن جہاں بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم کرتا ہے وہیں انھیں خلائی مہمات، فضائی سیر و سیاحت اور اسی نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ آج کے بچے تو خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرتے ہیں اور انسان خلا میں جاکر اپنی ہی دنیا کو چھوٹے سے ستارے کی شکل میں دیکھتا ہے۔

کرشن چندر ناول نگاروں میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھوں نے بچوں کے لیے بھی ناول لکھے ہیں۔ ستاروں کی سیر، الٹا درخت اور بچوں کی الف لیلہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ 'ستاروں کی سیر' ماہنامہ 'کھلونا' نئی دہلی میں اکتوبر 1957 سے اپریل 1959 کے آخر تک قسط وار شائع ہوا۔ بعدازاں یہ ناول مکتبہ پیام تعلیم نے 1966 میں کتابی شکل میں شائع کیا جو 20 ابواب پر مشتمل ہے۔

بچوں کو نئے جہانوں کی گھر بیٹھے سیر کرانے والے ناول ستاروں کی سیر میں کرشن چندر نے تحیر و استعجاب اور کائنات کے

اسرار سے واقف کرایا ہے۔ اس ناول میں ایک عجیب وغریب روبوٹ ایک سائنس داں کے احکامات کا پابند ہے اور اس کے کام انجام دیتا ہے۔ یہ روبوٹ سائنسداں نے 8 برس کی محنت سے تیار کیا ہے۔

ناول کے آغاز میں ایٹم بموں اور راکٹوں کی جنگ سے دنیا کی تباہی و بربادی کا منظر پیش کیا ہے۔ انسان پہاڑوں پر پناہ لے رہے ہیں دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک سائنس دانوں کی دنیا اور دوسری عام آدمیوں کی۔

سائنس داں ایک دوسرے پہ سبقت لے جانا چاہتے ہیں ان میں ایک بوڑھا سائنس داں بھی ہے جو عرفی، ناز اور موہنی تین بچوں کے ساتھ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر رہتا ہے۔ اس کا چوتھا سائنسی بیٹا جمی روبوٹ ہے۔ جمی روبوٹ کے ہاتھ پر ناک کان یہاں تک کہ بال بھی لوہے کے ہیں جس کا ایک دل ہے اور دو دماغ ہیں یہ دل سے نہیں دماغ سے کام کرتا ہے۔ ایک دماغ کام کرنا چھوڑے تو دوسرے دماغ سے کام کرتا ہے۔ یہ روبوٹ خودکار بیٹری سے چلتا ہے۔ بوڑھے پروفیسر کی تیار کردہ راکٹ میں روبوٹ کی مدد سے بچے بیٹھ جاتے ہیں اور اسٹارٹ کر دیتے ہیں۔ خلا میں پہنچ جاتے ہیں۔ ستاروں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ انھیں عجیب وغریب کائنات دیکھنے کو ملتی ہے۔

ناول میں بچوں کی نادانیاں، شرارتیں، معصومیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس میں تخیلی اور سائنسی انکشافات کی آمیزش سے پر اسرار اور عجیب وغریب فضا تخلیق کی ہے کہ اس کے سامنے طلسمی دنیا ہیچ نظر آتی ہے۔

ناول کا پلاٹ نہایت عمدگی اور خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے۔ موضوع تو خشک معلوم ہوتا ہے لیکن مصنف کے پیرایۂ بیان کی مثال دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ باتوں باتوں میں بچوں کو چاند ستاروں کی سیر کرائی۔

بچوں کا جہاز یا راکٹ ماہتاب ایئر پورٹ پر پہنچتا ہے جہاں تانبے کی مخلوق بستی ہے جو موتیوں کا لباس پہنتی ہے۔ بچے چھوٹوں کے شہر میں بادشاہ کے دربار میں پہنچتے اور درباریوں کے حیرت انگیز بیانات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ پھر وہاں سے ایک فولادی شاہین بچوں کو عقاب کی وادی میں لے جاتا ہے۔ بوڑھا بالشتیہ کاغذی جنات وغیرہ اسی نوع کے متعدد دلچسپ واقعات اس ناول میں بیان کیے گئے ہیں۔ آخر کار یہ بچے روبوٹ کی مدد سے اپنی دنیا میں خیر و عافیت سے واپس آجاتے ہیں۔

اس ناول کے چند انوکھے واقعات سے متعلق اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''یہاں ہر چیز چاندنی کی طرح شفاف تھی گلاب جامن اور امرتی اور حلوہ وغیرہ ہر شے کا رنگ سفید تھا پانی پیتے ہیں محسوس نہیں ہوتا اور لڈو کھاتے ہیں تو محسوس نہیں ہوتا۔''

ناول نگار نے بچوں کی تفریح کا سامان مہیا کیا ہے۔ چاند کی دنیا میں پہنچ کر مصنف نے بچوں کی دلچسپی کی چیزوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس راز کا انکشاف کر کے بچوں کے جذبۂ تجسس کو آسودہ بھی کر دیا ہے کہ خلا کی انسان چاند کی غذا سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

کرشن چندر کے شاہکار تخیل نے اس شہر کی تخلیق میں بڑی گلکاریاں کی ہیں۔ ایک منظر:

''یہ نظر آنے والی عمارت موتیوں سے بنائی گئی ہے۔ دودھیا رنگ کی چھ چھ سات سات منزلہ عمارتیں بے حد خوب صورت اور دلکش ہر عمارت تاج محل کی طرح خوب صورت نظر آتی تھی۔ دیواریں لفٹ ٹیلی فون لباس بھی موجود ہے۔ مثلاً

ناول کے آغاز میں ایٹم بموں اور راکٹوں کی جنگ سے دنیا کی تباہی و بربادی کا منظر پیش کیا ہے۔ انسان پہاڑوں پر پناہ لے رہے ہیں دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوچکی ہے۔ ایک سائنس دانوں کی دنیا اور دوسری عام آدمیوں کی۔ سائنس داں ایک دوسرے پہ سبقت لے جانا چاہتے ہیں ان میں ایک بوڑھا سائنس داں بھی ہے جو عرفی، ناز اور موہنی تین بچوں کے ساتھ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر رہتا ہے۔ اس کا چوتھا سائنسی بیٹا جمی روبوٹ ہے۔ جمی روبوٹ کے ہاتھ پر ناک کان یہاں تک کہ بال بھی لوہے کے ہیں جس کا ایک دل ہے اور دو دماغ ہیں یہ دل سے نہیں دماغ سے کام کرتا ہے۔ ایک دماغ کام کرنا چھوڑے تو دوسرے دماغ سے کام کرتا ہے۔

موتی نگر کا میئر بچوں کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ تانبے کے ہیں بجلی سے چلتے ہیں لیکن انسانوں سے کئی اعتبار سے بہتر ہیں۔

بعض جگہ دلکش مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں ادبی دنیا میں منظر کشی کے میدان میں کرشن چندر کے سحر کار قلم اور نادر کار تخیل کی پیش کش کو ہمیشہ بے مثال اور لاجواب سمجھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''تمام سطح زمین پر نیلے رنگ کی گھاس بھوری مٹی، پتوں کا رنگ سنہری پھول سفید، بادل درختوں کی چوٹیوں کو چھوکر نکلتے ہوئے اور ان میں سے موسیقی کی بارش۔۔'' اس شعریت آمیز نثر کا طلسم قاری کو خواب ناک فضا میں پہنچا دیتا ہے۔

کرشن چندر کی کردار سازی میں، بہت ساری خوبیاں ہیں۔ کرشن چندر نے اس روبوٹ کو بھی ان صفات سے متصف کر کے مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ روبوٹ تو مرکزی کردار ہے عرفی، نار اور موہنی کے کردار بھی منفرد خصوصیت کے حامل ہیں۔ عرفی سمجھدار حوصلہ مند مددگار امن پسند مستقل مزاج ہے۔ موہنی نٹ کھٹ شوخ ہے۔ لوتاز دوراندیش اور بہت سوجھ بوجھ والی لڑکی ہے۔ یہ تینوں کردار مخصوص صفات اور امتیازی خصوصیات کی وجہ سے انفرادیت کا احساس دلاتے ہیں۔

کرشن چندر کی زبان انتہائی دلکش عام فہم ہے۔ مکالموں میں روانی زبان میں تعریف پیدا کرنا مکالموں میں دلکشی پیدا کرنا کمال کی بات ہے۔ اس ناول میں دنیا کی تباہی خوف و دہشت جنگ بربادی کی فضا سے نجات پانے کی خواہش بیدار کرنے یعنی سائنسی ترقی سے امن کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرنے کی تلقین دی گئی ہے۔ اس طرح کرشن چندر ننھے قاریوں کے دل و دماغ کو گرفت میں لینے والے تخلیق کار کے طور پر ابھرتے ہیں۔

یہ ناول کرشن چندر کا شاہکار ہے اور اردو کے ادب اطفال میں کرشن چندر کو اہم ترین ناول نگار کا درجہ دلانے میں کامیاب ہے۔ 50 برس پہلے لکھے گئے اس ناول کے پلاٹ اور مرکزی خیال کو لے کر آج فلمی دنیا کے رائٹرس نے کئی تبدیلیوں کے ساتھ چند فلمیں بنائی ہیں جیسے مہیش بابو کی فلم 'نانی'، شاخ رخ خان کی ہندی فلم 'راون'، اور رجنی کانت کی 'روبوٹ' ان فلموں کا تخیل اور تصور کرشن چندر نے اسی ناول میں پچاس سال پہلے پیش کر دیا تھا۔

'الٹا درخت' بھی کرشن چندر کا بے حد دلچسپ ناول تھا جس میں زمین پر بوئے جانے والے بیج سے پیدا ہونے والے ایک ایسے درخت کی کہانی ہے جو زمین پر سیدھا اگنے کی بجائے زمین کے اندر نیچے کی طرف اگنے لگتا ہے اور اس کا تنا اور شاخیں آسمان کی بجائے زمین کی گہرائی میں الٹی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس درخت کی ہر شاخ پر ایک نئی دنیا بچوں کو ملتی ہے اور ان میں ایک ایسی دنیا بھی ہوتی ہے جس میں سب کام مشینیں کرتی ہیں۔ ان سب کو کنٹرول کرنے والی مشین کو چلانے والا شخص ایک بچہ ہوتا ہے جس کا صرف ایک ہاتھ ہے اور ہاتھ میں صرف ایک انگلی! یہ ناول بچوں کو سائنس اور انسان کے تعلق کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ سبق دیتا ہے کہ سائنسی ترقی انسان کے فائدے کے لیے ہونی چاہیے اس کی ضرورت ختم کرنے کے لیے نہیں۔

■

Sattar Faizi, 5/205-1, Foprt Street, Kadapa - 516001 (AP)

خان حفیظ

کرشن چندر کا طنز و مزاح
مشاہیرِ ادب کی نظر میں

"وہ اپنے خوبصورت انداز بیان کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ ان کے اسٹائل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس میں ایسے ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو عموماً ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں مثلاً رومان مزاج اور حقیقت مزاج۔ حقیقت ایک ایسا عنصر ہے جو رومان کے حق میں زہر قاتل ہے اور رومان وہ عنصر ہے جو حقیقت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے لیکن کرشن چندر کے اسلوب بیان میں وہ نہ صرف اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں۔ کرشن چندر قدرت سے ایک شاعر دل، ایک فلسفی دماغ اور ایک مجاہد کا جگر لے کر پیدا ہوئے تھے۔"

(کرشن چندر شخصیت اور فن: جگدیش چندر ودھان کنہیالال کپور، ص۔ گرد پوش)

کرشن چندر کے طنز و مزاح کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ اصطلاحی معنوں میں مزاح نگار نہیں دکھائی دیتے لیکن اس کے باوجود ان کے اندر موجود خوش مزاجی اور شگفتگی ان کے افسانوں اور ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اس میں طنز کی تلخی بھی ہے اور مزاح کی شیرینی بھی اور ان کے اثرات ذہن میں راست داخل ہو جاتے ہیں۔

سید اعجاز حسین فرماتے ہیں:

"مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیت رومان حقیقت کا ایک دلکش امتزاج، مطالعے کی باریکی اور فراوانی موجودہ سماجی اور معاشی نظام سے انتہائی اور دلی نفرت کا جذبہ طنز و مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش، دلکش رمزیہ نگاری اور انسانی نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔"

(مختصر تاریخ ادب: ترمیم شدہ ڈاکٹر اعجاز حسین ترمیم و اضافہ: ڈاکٹر محمد عقیل ص 377)

کرشن چندر ذہین افسانہ نگار ہیں اور ان کی ذہانت کا ثبوت ان کے افسانوں سے صاف عیاں ہے۔ ان کو جس ناول نے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں شامل کر دیا وہ ہے۔ 'ایک گدھے کی سرگذشت' جس میں مزاح کے معیاری نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ساتھ ہی فن کی گہرائی بھی۔ اس کا ایک اقتباس حاضر خدمت ہے:

کرشن چندر کے طنز و مزاح کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ اصطلاحی معنوں میں مزاح نگار نہیں دکھائی دیتے لیکن اس کے باوجود ان کے اندر موجود خوش مزاجی اور شگفتگی ان کے افسانوں اور ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اس میں طنز کی تلخی بھی ہے اور مزاح کی شیرینی بھی اور ان کے اثرات ذھن میں راست داخل ہو جاتے ہیں۔

"گدھا: یا حضرت مجھے چھوڑ دیجیے۔

مولوی: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم مال غنیمت ہو۔

گدھا: حضور میں مال غنیمت نہیں ہوتا۔ غنیمت ہی ہے کہ میں ایک گدھا ہوں ورنہ اب تک مارا گیا ہوتا۔

مولوی: اچھا یہ بتاؤ کہ تم ہندو ہو کہ مسلمان؟ پھر ہم فیصلہ کریں گے۔

گدھا: حضور میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں تو بس ایک گدھا ہوں اور گدھے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

مولوی: میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔

گدھا: ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ مولوی صاحب ایک مسلمان یا ہندو تو گدھا ہو سکتا ہے مگر ایک گدھا مسلمان یا ہندو نہیں ہو سکتا۔"

(ایک گدھے کی سرگذشت: کرشن چندر، ص 12)

خواجہ احمد فاروقی کرشن چندر کے طنز و مزاح پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"طنز نگاری فکر و تخیل کی آمیزش اور فنی خوبی میں ایک گدہے کی سرگزشت شہ پارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے وہ زخم تیز پیدا ہوتا ہے جس کو دلکشا کہا جائے۔ کتاب کو ختم کرنے کے بعد بھی طنز کے نشتر دل میں کھٹکتے ہیں اور فکر و احساس کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں۔"

(ماہنامہ شاعر، کرشن چندر، خواجہ احمد فاروقی، ص 33)

کرشن چندر واقعات کی کڑیوں کو اس طرح جوڑتے ہیں کہ موضوع انتہائی دلچسپ ہوجاتا ہے۔ ایک بات سے دوسری بات کو پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے خوبصورت فقرے وجود میں لاتے ہیں کہ مزاح کے افق پر قوس قزح کے خوشنما رنگ بکھر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک گدھے کی سرگزشت کا ایک اقتباس اور پیش کیا جاتا ہے۔

"آپ سے چند منٹ کے لیے ایک انٹرویو چاہتا ہوں کہیں آپ اس لیے انکار تو نہیں کریں گے کہ میں ایک گدھا ہوں؟

پنڈت جی (نہرو): نہیں بولیے، میرے پاس انٹرویو کے لیے ایک سے ایک بڑا گدھا آتا ہے۔ ایک گدھا اور سہی کیا فرق پڑتا ہے۔ شروع کرو۔"

(ایک گدھے کی سرگزشت، کرشن چندر، ص 670)

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں طرح طرح کے تجربات کیے اور نئے نئے موضوعات تلاش کیے اور ان کو سنوار اور تراش کر قاری کے سامنے پیش کیا۔

کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومانیت، شعریت اور رنگینی پائی جاتی ہے، جو اس زمانے کے تقاضوں پر کھری اترتی ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ کرشن چندر ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے جلد محسوس کرلیا کہ آنے والا وقت ان چیزوں کو قطعی پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے انھوں نے اپنے قلم کی گرفت کو سماجی مسائل، سیاست، نفسیات اور معیشت کی جانب موڑ دیا۔ اس پر اس قدر مہارت پیدا کرلی کہ وہ دوسروں سے الگ نظر آنے لگے اور اپنا بالکل الگ میدان ہموار کرلیا۔ پھر انھوں نے افسانے کی دنیا کو ایسی روشنی بخشی کہ دوسرے افسانہ نگار اس سے مستفید ہونے لگے۔ بقول ڈاکٹر حامد اللہ ندوی:

"کرشن چندر نے اپنے سنجیدہ افسانوں کا جو بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کے معدودے چند مزاحیہ افسانے اور ناول آٹے میں نمک کے برابر معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک نمک جو نہ صرف ان کی ادبی شخصیت کو دلکش بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے بلکہ طنز و مزاح کی تاریخ میں بھی انھیں ایک بلند مقام دلاتا ہے۔" (ماہنامہ شاعر جنوری۔فروری 1980، آج کے مزاح نگار، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، ص 53)

کرشن چندر نے کئی ایسے بہترین افسانے اردو ادب کو دیے ہیں جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو کرشن چندر ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنے فن پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فن زندگی اور فن افسانہ نگاری کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔

وہ اپنے افسانوں میں طنز و مزاح کی بیساکھی سے سماج میں پھیلے ہوئے ناسوروں پر نشتر لگا کر ان کا علاج کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ انھوں نے افسانوں اور ناولوں میں قسم قسم کے کرداروں کو جنم دے کر نمایاں کام کیا۔ اور ان کو موضوع بحث بنا کر صفحۂ قرطاس پر نگینے کی طرح جڑ دیا جو دیکھنے میں پتھر لگتے ہیں۔ لیکن قیمتی ہیں۔

ان کے بارے میں اعجاز صدیقی (ماہنامہ شاعر کے مرحوم مدیر) رقمطراز ہیں:

"کرشن چندر کی ذات وصفات کا آمیزہ کچھ عجیب سا بنا تھا۔ کبھی وہ بچہ نظر آتے کبھی ایک دم بزرگ، ایک بڑے فلسفی اور دانشور نہایت کم گو۔ مگر جب بولنے پر آجائیں تو حکمت و دانش کے دفتر کھل جائیں جنھوں نے انھیں سنجیدگی کے لبادے میں لپٹا ہوا دیکھا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہنسی مذاق کرتے ہیں تو محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ کوئی دیکھے تو یقین نہ کرے کہ یہ وہی کرشن چندر ہیں جن کے نام کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بج رہا ہے۔ بڑے ہی بامعنی خوبصورت اور طنزیہ اور مزاحیہ جملے حرکات و سکنات میں شوخی آنکھوں سے ان کے بے قرار اور سرشار روح جھانکتی ہوئی۔"

(کرشن چندر کی شخصیت اور فن: جگدیش چندر ودھان رائے، اعجاز صدیقی، ص۔گرد پوش)

ڈاکٹروں نے ان کے دل کے عارضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ سنجیدہ اور فکر طلب مضامین پر قلم اٹھانے سے احتراز کرنے اور صرف ہلکے پھلکے ہی مضامین لکھنے پر اکتفا کریں۔ اسی دوران انھوں نے دو مضامین 'عورتوں کا سال' اور 'لڑکی بگھارتی ہے دال' لکھے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کا پہلا مضمون جو انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں رقم کیا تھا جس میں ماسٹر بلاقی رام کا حاکہ اڑایا تھا۔ وہ مزاحیہ تھا اور ان کا آخری افسانہ ایک لڑکی بگھارتی ہے دال وہ بھی طنزیہ و مزاحیہ تھا۔ یہاں ایک لڑکی بگھارتی ہے دال کا ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے:

"قاعدے سے مجھے دال بگھارنے کے ذکر سے پہلے دال گلنے کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے شروع ہی سے ہم سنتے آئے ہیں کہ دال گلتی نہیں۔ غریب کی امیر کے سامنے نہیں گلتی، حاکم کی بادشاہ کے سامنے نہیں گلتی۔ مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ دال بآسانی گل سکتی ہے اگر آپ اپنی دال خوشامد کی دھیمی دھیمی آنچ پر پکائیں اور کسی چمچے کی مدد سے بار بار ہلاتے جائیں بلکہ اگر ہوسکے تو خود ہی چمچہ بن جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر دال نہ گلے تو اپنی دیگچی کے گرد کسی صاحب ثروت کا تعویذ باندھیں۔ اس پر بھی دال نہ گلے تو کسی دال گلیے سے رجوع کریں۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں آپ کو ایسے دال گلیے مل جائیں گے جو سکۂ رائج الوقت مناسب تعداد میں لے کر ہر قسم کی دال گلا سکتے ہیں آزمودہ ہے۔

سوال و جواب:

اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کو دوسروں کی دال میں کالا نظر آتا ہے اپنی دال میں نہیں۔ جواب کے لیے بغلیں جھانکیے۔"

(ایک لڑکی بگھارتی ہے دال، کرشن چندر، ماہنامہ شاعر کرشن چندر نمبر ص 23)

ان کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کبھی ہندوستانیت نہیں چھوڑی اور اس کو کرداروں کے ذریعے

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کا پہلا مضمون جو انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں رقم کیا تھا جس میں ماسٹر بلاقی رام کا حاکہ اڑایا تھا۔ وہ مزاحیہ تھا اور ان کا آخری افسانہ ایک لڑکی بگھارتی ہے دال وہ بھی طنزیہ و مزاحیہ تھا۔ یہاں ایک لڑکی بگھارتی ہے دال کا ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جارہا ہے:

"قاعدے سے مجھے دال بگھارنے کے ذکر سے پہلے دال گلنے کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے شروع ہی سے ہم سنتے آئے ہیں کہ دال گلتی نہیں۔ غریب کی امیر کے سامنے نہیں گلتی، حاکم کی بادشاہ کے سامنے نہیں گلتی۔ مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ دال بآسانی گل سکتی ہے اگر آپ اپنی دال خوشامد کی دھیمی دھیمی آنچ پر پکائیں اور کسی چمچے کی مدد سے بار بار ہلاتے جائیں بلکہ اگر ہوسکے تو خود ہی چمچہ بن جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر دال نہ گلے تو اپنی دیگچی کے گرد کسی صاحب ثروت کا تعویذ باندھیں۔ اس پر بھی دال نہ گلے تو کسی دال گلیے سے رجوع کریں۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں آپ کو ایسے دال گلیے مل جائیں گے جو سکۂ رائج الوقت مناسب تعداد میں لے کر ہر قسم کی دال گلا سکتے ہیں آزمودہ ہے۔

ابھارا۔ انھوں نے جہاں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو کردار بنایا وہاں دوسری جانب مزدور کسان موچی بھنگی کو بھی جگہ دی اور ان کے ذریعے لطیف طنز کے بیج بوئے

وہ اپنے افسانوں میں مارکس سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ افادیت اور مقصدیت کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد پنہاں معلوم ہوتا ہے۔ وہ ناولوں اور افسانوں کو تفریح کا ذریعہ نہیں مانتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں اور ناولوں نے ترقی حاصل کی۔

کرشن چندر کے یہاں ایک خوبی اور بھی پائی جاتی ہے کہ ان کے مضامین میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے اور بہترین مقصد کی وجہ سے وہ طبقے میں پڑھے اور سمجھے جاتے ہیں انھوں نے ہندو مسلم فسادات پر بھی افسانے لکھے اور دونوں فرقوں پر طنز کیا اور انھیں سمجھانے کی سعی کی کہ یہ انسانیت کے بالکل برعکس ہے۔ دونوں آپس میں بھائی بھائی ہو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے مت بنو۔ اس سے تم کو اور ملک دونوں کو نقصان ہوگا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان کے متعلق رقم طراز ہیں:

''ان میں تین باتیں خاص تھیں۔ مناظر فطرت سے والہانہ محبت، اخلاص سے معمور انسان دوستی اور جزیات سے تھر تھراتا ہوا سادہ اور خوبصورت اسلوب ان کی رومانیت کے سب شاکی تھے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ بات تو ایسی تھی کہ ان کا شمار ہمیشہ صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا رہے گا۔''

(کرشن چندر شخصیت اور فن، جگدیش ودھان رائے گوپی چند نارنگ، ص گردوپوش)

کرشن چندر نے اپنے مضامین میں معیاری اور بہترین طنزیہ و مزاحیہ انداز پیش کیا ہے۔ وہ ڈاکٹروں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدے کے ذریعے روکھے مضامین کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس ہوتے ہوئے بھی کہیں کہیں پر مشکل الفاظ کا استعمال ہے۔ وہ اپنے مضامین میں حقیقت کا رنگ دے کر طنز کے نشتر برساتے ہیں اور مزاح کی گلکاریاں کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے بارے میں خواجہ عبدالغفور مثبت رائے رکھتے ہیں اور ان کو عظیم فنکار کا درجہ دیتے ہیں:

''وہ پورے ادب پر چھائے ہوئے ہیں اور عوام الناس کی ملکیت ہیں۔ بین الاقوامی ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ افسانے، ناول، ڈرامے، انشائیے اور تنقیدی مضامین لکھتے ہیں۔ دنیا کی 65 زبانوں میں ان کی تصانیف کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ تصانیف کی تعداد تو ان کو کیا یاد ہوگی بچپن کشمیر کی پر فضا وادیوں میں گزرا ہے۔ جس کی مہک اب تک تازہ ہے ان کی تحریریں زعفران زار ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں مزاح کا رنگ نرالا اور اچھوتا ہے۔ کردار نگاری میں ان کا جواب نہیں۔

(طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ: خواجہ عبدالغفور، ص 246)

ان کا انداز بالکل نرالا ہے۔ وہ کرداروں سے بھرپور فائدہ اٹھانا جانتے ہیں اور اس سے اعلیٰ طنز و مزاح کی ندیاں بہاتے ہیں۔ ان کے کردار انتہائی معمولی ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کا معیار بلند اور دلفریب ہوتا ہے جس کی مثال اس مضمون (پرہیز) میں دیکھی جا سکتی ہے:

''گھر میں میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی ہی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے میں ایک کپ پانی، لنچ میں ایک گلاس پانی، رات کو دو

گلاس پانی، ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے خوش ہو کر اس پر صاد کیا۔ کیونکہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ نل کھولیے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے۔ کبھی گھونگھے، کبھی چوہے کبھی کیکڑے ایسی ایسی غذائیات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو۔

تو آئندہ سے پانی چھان کر لیجیے۔ ڈاکٹر نے سختی سے کہا، سولہ روپے نکالو میری فیس کے۔''

(پرہیز: کرشن چندر، ماہنامہ آج کل طنز و مزاح نمبر اوّل اپریل 1974، ص 24)

کرشن چندر نے اس میں سماج کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ بیوی سے لے کر پانی سپلائی کرنے والوں تک ہر ایک کو طنز کے دائرے میں قید کر کے ایسی باتیں پیدا کی ہیں کہ مزاح خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

کرشن چندر کی تحریریں زندہ جاوید ہیں۔ انھوں نے اپنی کاوشوں سے اردو ادب میں پیدا ہونے والے خلا کو پر کر کے اپنا نام طنز و مزاح کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ ان کی تحریروں میں کشمیری تہذیب، نرم دلی، سادگی جگہ جگہ پر نظر آتی ہے وہ کشمیر کی فضا اور ماحول سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے طنز میں مزاح کی آمیزش کی وجہ سے شوخی اور لطافت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ سید احتشام علی کی رائے سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے۔

''فن اور وسیلۂ اظہار کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی مواد اور موضوع کی بلکہ اس میں تو ایسا جادو ہے کہ کبھی کبھی یہ مواد کی سطحیت کا پردہ پوش بن جاتا ہے اور زبان اور بیان کے رسیا اسی کے چند گھونٹ پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تنہا اسلوب پر فن کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے نہ اس کو نظر انداز کر کے۔ کرشن چندر افسانہ نویسی کے اس اہم ترین بھید سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کو برتنے پر قدرت رکھتے ہیں۔''

(کرشن چندر شخصیت اور فن جگدیش چندر ودھان رائے سید احتشام علی ص گردوپوش)

■

Dr. Khan Hafeez, 2/17, Fahimabad Labour Colony, Chaman Ganj, Kanpur - 208001 (UP)

کرشن چندر

ایک گدھے کی سرگزشت

اقتباس

احوال واقعی المعروف بہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

حضرات میں نہ تو کوئی سادھوفقیر ہوں، نہ پیر دست گیر ہوں، نہ شری 108 سوامی گھم گھمانند کا چیلا ہوں، نہ جڑی بوٹیوں والا صوفی گورکھ سنگھ مجھیلا ہوں، میں نہ ڈاکٹر ہوں نہ حکیم ہوں، نہ کسی ہمالیہ کی چوٹی پر مقیم ہوں، میں نہ کوئی فلم اسٹار ہوں، نہ سیاسی لیڈر۔ میں تو بس ایک گدھا ہوں جسے بچپن کی غلط کاریوں کے باعث اخبار بینی کی مہلک بیماری لاحق ہوگئی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ میں نے اینٹیں ڈھونے کا کام چھوڑ کر صرف اخبار بینی اختیار کی، ان دنوں میرا مالک دھنو کمہار تھا جو بارہ بنکی میں رہتا تھا۔ (جہاں کے گدھے بہت مشہور ہیں) اور سید کرامت علی شاہ بار ایٹ لا کی کوٹھی پر اینٹیں ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ سید کرامت علی شاہ لکھنؤ کے ایک مانے ہوئے بیرسٹر تھے اور ان دنوں اپنے وطن مالوف بارہ بنکی میں ایک عالی شان کوٹھی خود اپنی نگرانی میں تعمیر کرا رہے تھے۔ سید صاحب کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے اپنی کوٹھی کا وہ حصہ جو انھوں نے سب سے پہلے تعمیر کرایا۔ وہ ان کی لائبریری کا ہال تھا اور ریڈنگ روم تھا۔ جہاں وہ علی الصبح آ کے بیٹھ جاتے۔ باہر برآمد میں کرسی ڈال کے اخبار پڑھنے کا چسکا پڑ گیا۔ ہوتا اکثر یوں تھا کہ ادھر میں نے ایک بلند ہوتی ہوئی دیوار کے نیچے اینٹیں پھینکیں اور بھاگتا ہوا ریڈنگ روم کی طرف چلا گیا۔ وکیل صاحب اخبار پڑھنے میں اس طرح مصروف ہوتے کہ انھیں میرے آنے کی خبر بھی نہ ہوتی اور میں ان کے پیچھے کھڑا رہ کر اخبار کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے یہ شوق یہاں تک بڑھا کہ اکثر میں وکیل صاحب سے پیشتر آ کے اخبار پڑھنے لگتا۔ بلکہ اکثر تو ایسا ہی ہوا ہے کہ اخبار کا پہلا صفحہ میں پڑھ رہا ہوں اور وہ سینما کے اشتہاروں والا صفحہ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں، افوہ ایڈن آئزن ہاور اور بلگانن پھر ملاقات کریں گے؟ "وہ کہہ رہے ہیں" آہا حضرت گنج میں دلیپ کمار اور نمی کی تصویر لگی رہی۔" میں کہہ رہا ہوں "چچ چچ سکندریہ کے ہوائی حادثے میں بارہ مسافر ہلاک ہوگئے۔" وہ کہہ رہے ہیں "باپ رے باپ سونے کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔" بس اسی طرح ہماری تنقید کا سلسلہ جاری رہتا، حتیٰ کہ میرا مالک اینٹیں گن کر مستری کے حوالے کر کے واپس آتا اور میری پیٹھ پر زور سے ایک کوڑا مار کے مجھے پھر اینٹیں ڈھونے کے لیے لے جاتا مگر وکیل صاحب مجھے کچھ نہ کہتے۔ دوسرے پھیرے میں جب میں واپس آتا تو وہ خود اخبار کا اگلا صفحہ اٹھا کر مجھے دے دیتے۔ اور اگر میں اخبار پڑھ چکا ہوتا تو لائبریری کے اندر جا کر کوئی کتاب اٹھا کے لے آتے اور زور زور سے پڑھنا شروع کر دیتے یہ جو میں پڑھنا بولنا سیکھا ہوں، اسے سید صاحب کی کرامت سمجھیے یا ان کی مہربانی کا نتیجہ۔ کیوں کہ سید صاحب کو اخبار پڑھتے ہوئے خبروں پر بحث کرنے اور کتاب زور زور سے پڑھنے اور پڑھتے ہوئے اس پر تنقید کرنے کی عادت تھی۔ یہاں جس جگہ پر وہ کوٹھی تعمیر کرا رہے تھے، انھیں کوئی ایسا نہ ملا جس سے وہ ایسی بحث کر سکتے۔ یہاں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں ہی ایک گدھا انھیں ملا مگر اس سے انھیں بحث نہ تھی۔ وہ دراصل گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اپنے دل ودماغ کی باتیں کسی سے کہنا چاہتے تھے۔ گدھے کے بجائے ایک خرگوش بھی ان کی صحبت میں رہتا تو عالم فاضل بن جاتا۔ سید صاحب مجھ سے بڑی ملاطفت سے پیش آتے تھے اور اکثر کہا کرتے "افسوس کہ تم گدھے ہو۔ اگر آدمی کا بچہ ہوتے تو میں تمھیں اپنا بیٹا بنا لیتا" سید صاحب کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ خیر صاحب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن سید کرامت علی شاہ کی کوٹھی تیار ہوگئی اور میرے مالک کو اور مجھے بھی اسی دن وہاں کے کام سے جواب مل گیا۔ اسی رات دھنو کمہار نے تاڑی پی کر مجھے ڈنڈے سے خوب پیٹا اور گھر سے باہر نکال دیا۔ اور کھانے کے لیے گھاس بھی نہ دیا۔ میرا قصور یہ بتایا کہ میں اینٹیں کم ڈھوتا تھا اور اخبار زیادہ پڑھتا تھا اور کہا کہ "مجھے تو اینٹیں ڈھونے والا گدھا چاہیے، اخبار پڑھنے والا گدھا نہیں چاہیے۔"

خیر صاحب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن سید کرامت علی شاہ کی کوٹھی تیار ہوگئی اور میرے مالک کو اور مجھے بھی اسی دن وہاں کے کام سے جواب مل گیا۔ اسی رات دھنو کمہار نے تاڑی پی کر مجھے ڈنڈے سے خوب پیٹا اور گھر سے باہر نکال دیا۔ اور کھانے کے لیے گھاس بھی نہ دیا۔ میرا قصور یہ بتایا کہ میں اینٹیں کم ڈھوتا تھا اور اخبار زیادہ پڑھتا تھا اور کہا کہ "مجھے تو اینٹیں ڈھونے والا گدھا چاہیے، اخبار پڑھنے والا گدھا نہیں چاہیے"۔

مچھلیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں اور دیگر احوال مچھلیوں کے انڈوں کا ایک اینگلو انڈین شکاری کا

مچھلیوں کے ڈیپارٹمنٹ میں مچھلی مارکیٹ کا شور وغل تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اب تک میں دفتری کارروائی کا خاصا عادی ہو چکا تھا اس لیے میں نے پہلے کاؤنٹر کی پہلی کھڑکی سے شروع کیا۔

پہلے کلرک نے کہا ''میں تو صرف مچھلیوں کے انڈوں کی فائلیں لیتا ہوں آپ آگے جایئے۔ دوسرے کلرک نے کہا ''میرے پاس تو صرف مچھلیوں کے ذخیروں کے متعلق معلومات ہیں۔ وہ بھی صرف تین قسم کی مچھلیوں کے متعلق، راہو، سامن اور پام فریٹ۔ آپ نے کیا نام بتایا؟''

''راموؔ'' میں نے آہستہ سے دہرایا۔

کلرک نے انکار میں سر ہلا کے کہا ''اس نام کی کوئی مچھلی ہمارے پاس نہیں ہے۔ آگے جایئے۔''

''مگر...'' میں نے تشریح کرنی چاہی۔

کلرک نے سر ہلا کے کہا'' بےکار بحث مت کرو آگے جاؤ''

تیسرے کلرک سے میں نے چھوٹتے ہی کہا ''صاحب مگر مچھ ہے..''

تیسرا کلرک بولا شارک مچھلی کے تیل کے بارے میں یا جاپانی ٹرالر کو کرائے پر لینے کے بارے میں اگر پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں، ورنہ آگے جائیں۔''

چوتھے کلرک تک پہنچتے پہنچتے میرے غصے کا پارہ خوب بڑھ چکا تھا۔ یہاں ایک بڈھا مسکین صورت کلرک اپنی چونچ سی ناک نکالے ایک بڑا سا رجسٹر کھولے اونگھ رہا تھا۔

میں نے کہا ''سنو اور تمھیں سننا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ ایک دھوبی کو ایک مگر مچھ نے کھالیا ہے۔'' بڈھے کلرک نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ''آں؟ کیا کہتے ہو؟''

میں نے چلا کے کہا ''ایک دھوبی کو ایک مگر مچھ نے کھالیا ہے۔''

بڈھے کلرک کے احمقانہ چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ بولا ''ایک دھوبی نے ایک مچھلی کو کھالیا ہے؟ تو کیا ہوا؟ بہت سے دھوبی مچھلی کھاتے ہیں۔ نہ کھائیں تو ہمارا محکمہ کیسے چلے گا۔''

میں نے کہا ''دھوبی نے نہیں۔ مگر مچھ نے دھوبی کو کھالیا ہے۔''

وہ بولا ''دھوبی نے نہیں، مگر مچھ نے مچھلی کو کھالیا ہے! اچھا! اچھا! تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔ بہت سے مگر مچھ مچھلیا کھاتے ہیں، نہ کھائیں تو زندہ کیسے رہیں؟''

میں نے زور سے چلا کے کہا ''سنو۔ مچھلی نے نہیں مگر مچھ۔''

وہ بولا ''اچھا ایک مگر مچھ..''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ''اور ایک دھوبی۔ یاد رکھو۔ ایک دھوبی۔ ایک مگر مچھ۔''

وہ بولا ''ایک دھوبی ایک مگر مچھ اب آگے چلو۔''

میں نے کہا ''دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھوتا تھا۔''

وہ بولا ''اچھے کپڑے دھوتا تھا؟''

میں نے چلا کے کہا ''اچھے دھوتا تھا کہ برے دھوتا تھا، تمھیں اس سے کیا مطلب؟''

وہ بولا ''میرا دھوبی بہت برے کپڑے دھوتا ہے۔ اگر تم سفارش کرو تو میں تمھارے دھوبی کو...''

میں نے بالکل بھنا کے کہا ''تم پوری بات نہیں سنو گے۔''

وہ بولا ''اچھا سناؤ۔ ایک دھوبی ایک مگر مچھ۔ وہ دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھوتا تھا۔ پھر؟''

میں نے کہا اتنے میں ایک مگر مچھ آیا ''اس نے دھوبی کی ٹانگ پکڑ لی۔''

''کیا پکڑی ذرا اونچا بولو، میں کم سنتا ہوں۔'' وہ بولا

''ٹانگ! ٹانگ'' میں نے چلا کے کہا۔

''مرغے کی'' کلرک خوشی سے چلایا۔

''مرغے کی نہیں دھوبی کی ٹانگ۔''

''دھوبی کی ٹانگ میں نے کبھی نہیں کھائی۔'' بڈھے کلرک نے افسوس سے سر ہلا کے کہا ''کیسی ہوتی ہے؟''

میں نے بالکل جھلا کے کہا ''ارے دھوبی کی ٹانگ نہیں۔ مگرمچھ آیا، جب بے چارہ دھوبی کپڑے دھو رہا تھا وہ پکڑ کے کھا گیا! سمجھے۔''

''ہاں! ہاں۔ اب سمجھ گیا'' کلرک نے سر ہلا کے کہا ''دھوبی کپڑے دھو رہا تھا، اتنے میں ایک مگرمچھ آیا اور دھوبی کے کپڑے کھا گیا۔''

میں نے اس کی طرف بڑے غصے میں دیکھا۔ اور پھر اگلی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

یہاں پر ایک ادھیڑ عمر کا اینگلو انڈین اپنے گنجے سر پر نیلی وردیوں کا اُبھرا ہوا جال لیے بیٹھا تھا۔ اس کے ناک سے معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت بھی تھوڑی سی پیے ہوئے ہے۔ بظاہر بہت خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ کہنے لگا ''فرمائیں میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟

میں نے دل میں سوچا کہیں یہ بھی اس بڈھے کی طرح گڑبڑ نہ جائے اس لیے میں نہایت آہستہ آہستہ بیان کرکے سارا واقعہ اس کے ذہن نشین کراؤں گا۔ اس لیے میں نے کہا ''سنیے۔ ایک مگرمچھ ہے۔''

اینگلو انڈین صاحب کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔ بولا ''کدھر ہے؟''

میں نے کہا ''جمنا گھاٹ پر۔''

وہ بولا ''جمنا پر تو بہت گھاٹ ہے وہ کدھر ہے؟''

اینگلو انڈین صاحب سب کچھ نوٹ کرتا جا رہا تھا میں نے سوچا۔ اب مجھے اپنے کام کا آدمی مل گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ''میں نے کہا کرشن نگر کے پاس۔ ریل کے پل کے نیچے۔''

اینگلو انڈین نے نوٹ کرکے پوچھا ''کتنا لمبا ہوگا۔''

''کیا گھاٹ؟''

''گھاٹ نہیں مگرمچھ!'' اینگلو انڈین بولا۔

میں نے کہا ''میں نے دیکھا تو نہیں مگر لوگ کہتے ہیں تیس فٹ سے کم نہ ہوگا۔''

'ہا!'' انگلیو انڈین کی آنکھیں اور بھی چمک اٹھیں۔ اب تو اس کے رخسار بھی چمک رہے تھے۔ تیس فٹ! واہ! واہ! کیا تم مجھے موقعے پر لے جاسکتے ہو؟''

''ہاں لے جاسکتا ہوں۔''

''ہم ساتھ میں اپنی رائفل لے چلیں گے'' اینگلو انڈین میری طرف حیرانی سے دیکھ کر بولا ''تم مگرمچھ کے شکار کے لیے ہی آئے تھے نا!''

میں نے کہا ''نہیں بات ہے یہ کہ اس مگرمچھ نے ایک دھوبی کو کھا لیا ہے۔ اس کے خاندان کو مدد درکار ہے، میں اس سلسلے میں..''

''وہ!'' اینگلو انڈین کا دل بجھ گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بجھ گئی۔ بالکل کاروباری اور دفتری انداز میں بولا ''میں مگرمچھ کا شکار تو کرسکتا ہوں، مگر رامو کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ ساری ہمارے محکمے سے دھوبیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے بالکل زچ ہوکر کہا ''تو میں کہاں جاؤں؟ تمھارے محکمے کا دھوبی سے کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی دوسرے محکمے کا مگرمچھوں سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر کس کا تعلق کس سے ہے! یہ کیسے پتہ چل سکتا ہے؟''

اینگلو انڈین نے بڑے غور سے اور بڑی ہمدردی سے مجھے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم مرنے والے کے رشتہ دار ہو؟''

''نہیں... میں تو بس اس کا گدھا ہوں۔''

''پھر بھی اتنی ہمدردی جتاتے ہو'' اینگلو انڈین میری طرف چوکنا ہوکے دیکھنے لگا ''دیکھو میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں آج کل کے زمانے میں کسی دوسرے سے اتنی ہمدردی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''تم مجھے یہ مشورہ نہ دو۔ یہ تو بتاؤ کہ میری یہ عرضداشت کون سنے گا؟''

اینگلو انڈین سوچ میں پڑ گیا اور پنسل چبانے لگا۔ پنسل چباتے چباتے بولا ''معاملہ مگرمچھ کا ہے۔ مگرمچھ سے عدالت کا کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ تم اس قتل کے سلسلے میں عدالت ہی جاسکتے تھے۔ لیکن مگرمچھ کا تعلق چڑیا گھر سے ضرور ہے۔ تم چڑیا گھر جاسکتے ہو، مگر چڑیا گھر والے کیا کریں گے۔ ان کے ہاں پہلے سے بہت سے مگرمچھ موجود ہیں پھر چڑیا گھر والوں کا دھوبی سے کیا تعلق۔ کیوں کہ چڑیا گھر کے جانور تو کپڑے پہنتے ہی نہیں.. ہا! یکایک وہ خوشی سے اچھل پڑا اور اب کے میں نے اس کے چہرے پر وہی بشاشت دیکھی جو کچھ عرصہ پہلے میں نے رنگا چاری اور سبرامنیم کے چہرے پر دیکھا آیا تھا۔

''اینگلو انڈین سوچ میں پڑگیا اور پنسل چبانے لگا۔ پنسل چباتے چباتے بولا ''معاملہ مگرمچھ کا ہے۔ مگرمچھ سے عدالت کا کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ تم اس قتل کے سلسلے میں عدالت ہی جاسکتے تھے۔ لیکن مگرمچھ کا تعلق چڑیاگھر سے ضرور ہے۔ تم چڑیاگھر جاسکتے ہو، مگر چڑیا گھر والے کیا کریں گے۔ ان کے ہاں پہلے سے بہت سے مگرمچھ موجود ہیں پھر چڑیا گھر والوں کا دھوبی سے کیا تعلق۔ کیوں کہ چڑیاگھر کے جانور تو کپڑے پہنتے ہی نہیں.. ہا! یکایک وہ خوشی سے اچھل پڑا اور اب کے میں نے اس کے چہرے پر وہی بشاشت دیکھی جو کچھ عرصہ پہلے میں نے رنگا چاری اور سبرامنیم کے چہرے پر دیکھا آیا تھا۔''

وہ بولا ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔''

''کیا''

''سنو، دھوبی کا تعلق صابن سے ہے۔ اور صابن کی درآمد برآمد کا تعلق کامرس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ دیکھو تم سیدھے کامرس کے وزیر کے پاس چلے جاؤ۔ اس کے سامنے رامو دھوبی کی ساری بپتا رکھ دو۔ اگر وہ چاہتا ہوگا کہ دھوبی کپڑے دھو دھو کر کپڑے پھاڑتے رہیں اور لوگ اس طرح نئے نئے کپڑے پہننے پر مجبور ہوتے رہیں تو وہ اس سلسلے میں ضرور تمھاری مدد کرے گا۔''

■

کرنا ہجرت گدھے کا بارہ بنکی سے اور جانا دہلی کو اور بیان اس شہر دل پذیر کا

دلّی چلو

ان دنوں دلّی چلو کا لفظ عام تھا۔ اور ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا۔ چنانچہ میں بھی ایک حد تک اسی نعرے سے متاثر ہوکر دلی جارہا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ راستے میں کیسی کیسی افتاد پڑے گی ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ میں نے دیکھا ایک مسلمان بڑھئی شرعی داڑھی رکھے ہوئے ایک چھوٹا سا بقچہ بغل میں دبائے ایک چھوٹے سے گاؤں سے بھاگ کر سڑک پر آرہا تھا۔ میں نے ازراہِ ہمدردی اسے اپنی پیٹھ پر سوار کرلیا اور تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا تا کہ اس کے گاؤں کے فسادی اس کا پیچھا نہ کرسکیں چنانچہ ہوا بھی یہی اور میں بہت آگے نکل گیا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ چلو میری وجہ سے ایک بے گناہ کی جان بچ گئی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے فسادی راستہ رو کے کھڑے ہیں۔

ایک فسادی نے ہماری طرف دیکھ کر کہا ''دیکھا اس بدمعاش مسلمان کو، نہ جانے کس غریب ہندو کا گدھا چرا کر لے جارہا ہے۔''

مسلمان بڑھئی نے اپنی جان بچانے کے لیے بہت کچھ کہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی اسے فسادیوں نے تہہ تیغ کردیا۔ مجھے ایک فسادی نے رسے سے باندھ لیا اور اپنے گھر لے چلا۔

جب ہم آگے بڑھے تو رستے میں مسلمانوں کے چند گاؤں آتے تھے۔ یہاں پر چند دوسری طرف کے فسادی آگے بڑھے۔

ایک نے کہا ''دیکھا، یہ غریب گدھا کسی مسلمان کا معلوم ہوتا ہے۔ اسے یہ ہندو فسادی گھیر کر لے جارہا ہے۔''

اس بے چارے نے اپنی جان بچانے کے لیے بہت کچھ کہا، مگر کسی نے ایک نہ سُنی اور اس کا صفایا ہوگیا اور میں ایک مولوی صاحب کے حصے میں آیا جو مجھے اسی رسی سے پکڑ کے اپنی مسجد کی طرف لے چلے۔ راستے میں میں نے مولوی صاحب کی بہت منت سماعت کی۔

گدھا: یا حضرت مجھے چھوڑ دیجیے۔

مولوی: یہ کیسے ہوسکتا ہے، تم مالِ غنیمت ہو۔

گدھا: حضور میں مال غنیمت نہیں ہوں۔ غنیمت ہی ہے کہ میں ایک گدھا ہوں۔ ورنہ اب تک مارا گیا ہوتا۔

مولوی: اچھا۔ یہ بتاؤ کہ تم ہندو ہو کہ مسلمان۔ پھر ہم فیصلہ کریں گے۔

گدھا: حضور میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان میں تو ایک گدھا ہوں۔ اور گدھے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

مولوی: میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔

گدھا: ٹھیک تو کہہ رہا ہوں مولوی صاحب ایک مسلمان یا ہندو گدھا ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک گدھا مسلمان یا ہندو نہیں ہوسکتا۔

مولوی: تم بھی بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ ہم گھر جا کر تمھیں ٹھیک کریں گے۔

مولوی صاحب نے مجھے مسجد کے باہر ایک کھونٹے سے باندھ دیا اور خود حجرے میں چلے گئے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور رسی تڑا کر وہاں سے بھاگا۔ وہ بھاگا ہوں، وہ بھاگا ہوں کہ میلوں تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا کہ تنگ نظر انسانوں کے جھگڑے سے ایک گدھے کا کیا واسطہ، میں اب نہ کسی ہندو کی مدد کروں گا نہ مسلمان کی، چنانچہ اب میں دن بھر کسی گھنیرے سائے میں پڑا رہتا، یا کسی جنگل یا میدان میں گھاس چرتا رہتا اور جب رات ہوتی تو اپنا سفر شروع کردیتا۔ اس طرح چلتے چلتے بڑی مشکل سے کہیں چھ سات ماہ کے بعد میں دلی کے اطراف واکناف میں داخل ہوا۔ دلی کا جغرافیہ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں تا کہ دلی آنے والے سیاح میری معلومات سے فیضیاب ہوں اور دھوکا نہ کھائیں۔

دلّی کا جغرافیہ

دلّی کے شمال میں ریفیو جی، جنوب میں ریفیو جی، مشرق میں ریفیو جی اور مغرب میں ریفیو جی بستے ہیں۔ بیچ میں ہندوستان کا دارالخلافہ ہے۔ اس میں جگہ جگہ سنیما کے علاوہ نامردی کی دوائیں اور طاقت کی گولیوں کے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔ جن سے یہاں کی تہذیب وتمدن کی رفعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا تانگے پر بیٹھی پائدان پر پاؤں رکھے اپنے حسن وجمال میں کھوئی ہوئی چلی جارہی ہے۔ اور پائدان پر لکھا تھا ''اصلی طاقت کی گولی انداسنگھ جلیبی والے کے یہاں سے خریدیے۔'' میں اس منظر کے بے پناہ طنز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں چاندنی چوک میں کھڑے ہوکر قہقہہ لگانے لگا۔ لوگ باگ چلتے چلتے رُک گئے اور ایک گدھے کو اس سڑک پر کھڑے ہوکر ہانک لگاتے ہوئے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ وہ بے چارے میری بے ہنگم آواز پر ہنس رہے تھے اور میں ان کی بے ہنگم تہذیب کا ماتم کررہا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہوا ایک پولیس کے سنتری نے مجھے ڈنڈے مار کے وہاں سے بھگا دیا اور مجھے ٹاؤن ہال کی طرف دھکیل دیا۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ کبھی کبھی گدھے بھی انسانوں پر ہنس سکتے ہیں۔

دلّی میں آنے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دلّی میں داخل ہونے کے لیے بہت سے دروازے ہیں۔ دلّی دروازہ، اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ، لیکن آپ دلّی میں ان میں سے کسی دروازے کے راستے اندر نہیں آسکتے۔ کیوں کہ دروازے کے اندر اکثر گائے بھینس بیل بیٹھے رہتے ہیں یا پولس والے چارپائیاں بچھائے اونگھتے رہتے ہیں۔ ہاں ان دروازوں کے دائیں بائیں بہت سی سڑکیں بنی ہوئی ہیں جن پر چل کر آپ دلّی میں داخل ہوسکتے ہیں۔ انگریزوں نے بھی دلی میں ایک انڈیا گیٹ بنایا ہے۔ لیکن اس گیٹ سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ دروازے کے اِردگرد گھوم کے جانا پڑتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ دلّی کے گھروں پر بھی تھوڑے دنوں میں ایسے دروازے لگ جائیں۔ شاید کھڑکیوں سے پھلانگ کر گھر میں داخل ہوا کریں گے۔

دلّی میں نئی دلّی اور نئی دلّی میں کناٹ پلیس ہے۔ کناٹ

پلیس بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ شام کے وقت میں نے دیکھا کہ لوگ لوہے کے گدھوں پر سوار ہو کر اس کی گول سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ یہ لوہے کا گدھا ہم سے تیز دوڑ سکتا ہے۔ مگر ہماری طرح آواز نہیں نکال سکتا۔ یہاں پر میں نے اکثر لوگوں کو بھیڑ کی کھال کے بالوں کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا۔ عورتیں اپنے منھ اور ناخن رنگتی ہیں اور وہ اپنے بالوں کو اس طرح اونچا کر کے باندھتی ہیں کہ وہ دور سے گدھے کے کان معلوم ہوتے ہیں۔ بھئی ان لوگوں کو گدھے بننے کا کتنا شوق ہے۔ یہ آج معلوم ہوا۔

کناٹ پلیس سے ٹہلتا ہوا میں انڈیا گیٹ چلا گیا۔ یہاں گھاس کے بڑے عمدہ عمدہ قطعے تھے جن کی دوب بڑی خوش ذائقہ تھی۔ میں تو دو تین دن سے بھوکا تھا ہی۔ بڑے مزے میں منہ مار کے چرنے لگا۔ اتنے میں ایک زور کا ڈنڈا میری پیٹھ پر پڑا۔ میں نے گھبرا کے دیکھا۔ ایک پولیس کا سپاہی تھا غصے سے کہہ رہا تھا۔''

''یہ کم بخت گدھا یہاں کیسے گھس آیا۔''

میں نے پلٹ کر کہا ''کیوں بھئی۔ کیا گدھوں کو نئی دلّی میں آنے کی ممانعت ہے۔'' مجھے بولتے دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا۔ غالباً اس نے آج تک کسی گدھے کو بولتے نہیں سنا تھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی حیرت کم ہوئی تو وہ مجھ کو رسّی سے کھینچ کر تھانے لے چلا۔ تھانے میں پہنچ کر اس نے مجھے اپنے ہیڈ کانسٹبل کے سامنے جا کھڑا کیا۔

ہیڈ کانسٹبل نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''اسے یہاں کیوں لائے ہو رام سنگھ۔''

رام سنگھ نے کہا ''حضور۔ یہ ایک گدھا ہے۔''

''گدھا تو ہے، یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، مگر تم اسے کیوں لائے ہو۔''

''حضور یہ انڈیا گیٹ پر گھاس چر رہا تھا۔''

''ارے گھاس چر رہا تھا۔ تو کیا ہوا۔ تمھاری عقل بھی گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی۔ اسے یہاں کیوں لائے۔ لے جا کے کسی مویشی خانے میں بند کر دیتے۔ اس بے زبان جانور کو تھانے میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔''

رام سنگھ نے رکتے رکتے میری طرف فتح مندی کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''حضور یہ بے زبان نہیں بولتا بھی ہے؟!''

اب کے ہیڈ کانسٹبل بہت حیران ہوا، مگر پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ بولا ''رام سنگھ تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' ''نہیں یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے ہیڈ کانسٹبل صاحب۔'' میں نے آہستہ سے سر ہلا کے کہا۔

ہیڈ کانسٹبل اپنی سیٹ سے اچھلا۔ یوں کہ اس نے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اصل میں اس کی حیرت بالکل حق بجانب تھی کیوں کہ نئی دلّی میں ایسے تو بہت لوگ ہوں گے جو انسان ہو کر گدھوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ایسا گدھا جو گدھا ہو کر انسانوں کی سی بات کرے۔ یہ کانسٹبل نے آج تک نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ اسی لیے بے چارہ چکرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ آخر سوچ سوچ کے اس نے روزنامچہ کھولا اور رپٹ درج کرنے لگا۔

اس نے مجھ سے پوچھا ''تمھارا نام''

''گدھا''

''باپ کا نام''

''گدھا''

''دادا کا نام''

''گدھا''

''یہ کیا!'' ہیڈ کانسٹبل نے تعجب سے کہا، سب کا ایک ہی نام ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا اب مجھے دیکھو۔ میرا نام جیوتی سنگھ ہے۔ میرے باپ کا نام پیارے لال تھا۔ میرے دادا کا نام جیون داس تھا۔ ہمارے ہاں نام بدلتے رہتے ہیں تم ضرور جھوٹ بولتے ہو۔''

جیوتی سنگھ مجھے شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''نہیں حضور، میں جھوٹ نہیں بولتا اور واقعہ یہی ہے کہ ہمارے یہاں نام نہیں بدلتے، جو باپ کا نام ہوتا ہے وہی بیٹے کا وہی پوتے کا۔''

''اس سے کیا فائدہ'' جیوتی سنگھ نے پوچھا۔

''اس سے شجرہ نسب ملانے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر۔ کیا آپ مجھے اپنے پردادا کے دادا کا نام بتا سکتے ہیں'' میں نے جیوتی سنگھ سے پوچھا۔

''نہیں۔'' جیوتی سنگھ نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مگر میں بتا سکتا ہوں۔ آپ کے ہاں وہ آدمی بڑا خاندانی سمجھا جاتا ہے جو آج سے چار سو، پانچ سو، چھ سو سال پہلے کے مورثِ اعلیٰ کا نام بتا سکے۔ دیکھیے میں آپ کو آج سے آٹھ ہزار کیا آٹھ لاکھ سال پہلے کے مورثِ اعلیٰ کا نام بتا سکتا ہوں۔ شری گدھا! بولیے پھر کیا ہم گدھے آپ سے بہتر خاندان کے ہوئے کہ نہیں؟''

جیوتی سنگھ نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس کا شبہ اور بڑھ گیا۔ اس نے آہستہ سے رام سنگھ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا ''مجھے یہ شخص بڑا خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ ہو نہ ہو۔ یہ کوئی غیر ملکی جاسوس ہے، جو گدھے کی لباس میں نئی دلّی کا چکر لگا رہا ہے۔''

رام سنگھ نے کہا ''حضور میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کی کھال اُترواکر دیکھنا چاہیے۔ اندر سے وہ خفیہ جاسوس باہر نکل آئے گا۔ پھر ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔''

جیوتی سنگھ نے کہا ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اس کے لیے سب انسپکٹر چانن رام کی منظوری لینا بہت ضروری ہے۔ چلو آؤ اسے ان کے سامنے لے چلیں۔''

میرے کان میں بھی کچھ بھنک پڑ چکی تھی، مگر میں کان لپیٹے خاموش رہا اور ان دونوں کے ساتھ اندر کے کمرے میں سب انسپکٹر چانن رام کے سامنے چلا گیا۔ چانن رام کی مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح کھڑی تھیں اور اس کے سرخ چہرے پر ہمیشہ غیظ و غضب کا جاہ و جلال رہتا تھا۔ چانن رام کو آج تک کسی نے ہنستے ہوئے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اسی لیے بہت لوگ اسے ایک اعلیٰ افسر سمجھتے تھے۔ چانن رام نے ان کی ساری بات سن کر میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا ''ہاں، تم تو پاکستان کے جاسوس ہو'' میں چپ رہا۔

چانن رام نے زور سے میز پر مکا مار کر کہا ''سمجھ گیا تم روس کے ایجنٹ ہو۔'' میں پھر بھی خاموش رہا۔ چانن رام نے دانت پیستے ہوئے کہا ''کم بخت بدمعاش، کمیونسٹ، میں تمھاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا ورنہ جلد بتاؤ کہ تم کون ہو۔'' یہ کہہ کر چانن رام مجھے مکوں، لاتوں، ٹھوکروں سے مارنے لگا۔ مارتے مارتے جب وہ بالکل بے دم ہو گیا تو میں نے ایک زور سے درد بھری ہانک لگائی۔ ہانک لگاتے ہی وہ رک گیا او رپہلے میری طرف حیرت سے دیکھ کر اور پھر نہایت ہی غصے سے جیوتی سنگھ اور رام سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا ''ارے یہ تو بالکل گدھا ہے، اک دم گدھا ہے اور تم کہتے ہو کہ کوئی غیر ملکی جاسوس ہے۔ تم مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ میں ابھی تم کو ڈسمس کراتا ہوں۔''

رام سنگھ اور جیوتی سنگھ دونوں ڈر سے تھر تھر کانپنے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے ''نہیں حضور! ابھی یہ باہر کے کمرے میں بول رہا تھا۔ صاف صاف بول رہا تھا انسانوں کی طرح۔''

''تم نے خواب دیکھا۔ یا کام کرتے کرتے تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہوگا۔ جاؤ اس گدھے کو ہمارے سامنے سے لے جاؤ اور کسی مویشی خانے میں بند کر کے رکھ دو اگر تین چار دن میں اس کا مالک نہ آئے تو اسے نیلام کر دو۔'' میں خوشی خوشی باہر آیا۔ میری چال کام کر گئی۔ اگر میں بولتا تو وہ لوگ ضرور میری کھال ادھیڑ کر دیکھتے کہ اندر کون ہے۔

اس کے بعد تین چار دن تو کیا جب ایک ہفتہ تک کوئی مالک نہ آیا تو مجھے نیلام کر دیا گیا۔ اب مجھے رامو دھوبی نے خرید لیا۔ جو جمنا پار کرشنا نگر میں رہتا تھا۔ ■

احمد امتیاز

مولانا آزاد کے یومِ پیدائش پر

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی خیالات

مولانا ابوالکلام آزاد تعلیم کی ایک ایسی طرحِ نو ڈالنا چاہتے تھے جس سے نفسیاتی وحدت اور مشترکہ شہریت کے خوابیدہ احساسات بیدار ہو جائیں اور اسی سبب وہ دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کے طرفدار تھے۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ دنیاوی تعلیم سے جہاں نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں وہیں مذہبی تعلیم کے ذریعے عوام کے دل و دماغ میں رواداری اور وسیع النظری کے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ علم و دانش کے عرفان و آگہی کے لیے مولانا آزاد نے مشرق و مغرب کے سرچشموں سے استفادہ کرنے کی پُرزور حمایت جس طرح کی تھی وہ اس قدر واضح اور مربوط الفاظ میں ہے کہ کوئی بھی ذی علم اُن کے تعلیمی خیالات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ امامِ علم و فن اور وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے جو تعلیمی پیغامات دیے ہیں اور جس بے باکی سے دیے ہیں ان کو زبانِ خامہ سے کسی ایک مضمون میں پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس مضمون میں حتی المقدور انھیں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا آزاد کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ وہ ہمارے سیاسی رہنما ہی نہیں تھے، ایک زیرک عالم اور ہمدردِ قوم بھی تھے۔ ان کے تبحرِ علمی اور دور اندیشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے دوست اور رفیقِ کار ان کی خداداد صلاحیتوں کا دم بھرتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ایک موقع پر کہا تھا کہ مولانا کے عناصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا نہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر ہیں۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات مولانا کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم دریا کے سامنے پانی کا قطرہ نظر آتا ہے۔ مولانا آزاد کے کارنامے ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھے۔ انھوں نے جن موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں مذہبی، علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی موضوعات بے حد اہم ہیں۔ مولانا کی دور بینی اور ہماری کوتاہ نظری میں جو فاصلہ رہا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ اُن کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے وسیع تر ہونے کے باوجود ہمیں جس قدر ان کی فکر سے استفادہ کرنا چاہیے تھا اور روشنی حاصل کرنی چاہیے تھی، ہم نہیں کر سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نظیر صدیقی کو یہ کہنا پڑا کہ ''مولانا آزاد کو حد درجہ غیر معمولی یا حد درجہ عظیم ہونے کا صلہ کم اور سزا زیادہ ملی۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، مشمولہ گزرگاہِ خیال، نظیر صدیقی، اسلام آباد، 1999)

مولانا آزاد کے ساتھ ہم نے جیسا رویہ اپنا رکھا تھا وہ بھی کم قابلِ افسوس نہیں ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اردو زبان میں کوئی ایسی گالی نہیں تھی جو انھیں نہ دی گئی ہو''۔ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے طلبا نے ٹرین روک کر اُن کے ساتھ جس قسم کی بدسلوکی اور بدتمیزی کی تھی، اُس سے تو سبھی واقف ہیں۔ شبلی نے خواہ انھیں 'عجائباتِ روزگار دماغ والا' کہا ہو، محمد علی جوہر نے انھیں 'ہندوستان میں گم شدہ اسلام کو دریافت کرنے والا عربی ذہانت اور عجمی فطانت کا شہ پارہ' بتایا ہو یا رشید احمد صدیقی نے انھیں 'علی گڑھ کا دوسرا سرسید' قرار دیا ہو لیکن حق تو یہ ہے کہ ہم نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ ہم نے ان کی فکر و فرزانگی سے فیض حاصل نہیں کیے اور اُن کے انتقال کے بعد جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوئی تھیں انھیں بھی ہم پورا کرنے سے قاصر ہی رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد 15 جنوری 1947 کو وزیر تعلیم بنائے گئے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے جو اقدام کیے وہ غیر معمولی تھے۔ اُس زمانے میں جبکہ ملک کی حالت دِگرگوں تھی، کسی بھی قسم کے تعلیمی نظام کو قائم کرنا آسان نہیں تھا۔ ہر سمت سے مخالفت کے بھنور قدموں سے لپٹتے تھے۔ ان صورتوں سے عہدہ برآ ہونا، ان مسائل کو حل کرنا اور 'انکار' کی شدید آندھیوں میں ثابت قدم رہنا، مولانا آزاد جیسے مصلحِ قوم اور ماہرِ تعلیم ہی کے بس میں تھا۔ وزیر تعلیم کی گیارہ سالہ مدت میں مولانا آزاد نے جس طرح قیادت کی، جس طرح ذہنی و فکری نظام کو درست کیا اور تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا، وہ اُن کی شخصیت کی ہمہ گیری، دور اندیشی اور دانشوری کا ہی نتیجہ ہے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے کو سمجھنے کے لیے ان کی وزارت سے قبل کے تعلیمی افکار پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کے تعلیمی خیالات وزارت کے عہدے پر فائز ہونے سے بہت پہلے وجود میں آ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون 'مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی' (مشمولہ 'الہلال' جلد نمبر 2، 4 جون 1913) میں بہت تفصیل سے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے اور یورپ کی نئی تعلیمی

اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے ادبیات کی تعلیم کو طبیعات کی تعلیم پر ترجیح دی ہے۔اُن کا خیال تھا کہ ''قومیں عموماً زبان کی ترقی اور تنزلی سے بنتی اور بگڑتی ہیں۔'' لہٰذا اس مقالے میں انھوں نے جغرافیہ، حساب اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زبان وادب اور تاریخ کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نیز گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے حکومت پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ حکومت اس قسم کی ناقص پالیسی سے نظامِ تعلیم کو قطعی طور پر فروغ نہیں دے سکتے۔اس مقالے میں مولانا آزاد نے یورپ کے فلسفۂ تعلیم، اس کے معیار اور نظامِ تعلیم پر بھی محققانہ اور عالمانہ نگاہ ڈالی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں یونیورسٹی کا کیا معیار ہونا چاہیے۔اس مقالے میں خصوصی طور پر 2 مئی 1913 کے اُس سرکلر کو بنیاد بنایا گیا ہے جسے اس وقت کی حکومت نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جاری کیا تھا۔مولانا آزاد نے اِس سرکلر کو مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اگر یہ تعلیمی منشور انھیں حالتوں میں نافذ العمل ہو گیا اور اصلی و اساسی قوتیں بہ دستور برقرار ہیں تو مسلمانوں کو صاف کہہ دینا چاہیے کہ یہ نام نہاد اصلاحی سرکلر اُن کے درد کی دوا نہیں ہے۔''

(مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی)

مولانا آزاد نے اس سرکلر کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اسے مایوس کُن قرار دیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں یورپ کے بیسویں صدی کے طریقۂ تعلیم کا تجزیہ کرتے ہوئے تعلیم کی اصل غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کا مقصد افراد کو ترقی یافتہ بنانا ہے تا کہ وہ اپنی عقلی مقدرت اور طبعی استعداد کے مطابق خاطر خواہ ترقی کر سکیں۔

مدرسۂ اسلامیہ، کلکتہ کی ایک تقریب میں جو 1920 میں منعقد ہوئی تھی، کے افتتاحی اجلاس میں بھی انھوں نے جو کچھ کہا وہ اگرچہ دینی تعلیمی نظام سے متعلق ہے لیکن اس کے پس منظر میں جو فکر کارفرما ہے، ہم اُن سے بھی مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات اور مستقبل کے امکانات دریافت کر سکتے ہیں۔اِس افتتاحیہ اجلاس میں انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔''

(امام الہند نمبر، روزنامہ نئی دنیا، دہلی)

اس زمانے میں تعلیمی بیداری کا کوئی بہتر نظام بھی موجود نہیں تھا اور عوام مغربی فکر کے دھارے میں بہنے کو بھی راضی نہیں تھے۔علومِ مشرقیہ کی حدود سے باہر قدم نکالنے سے ان کے پر جلتے تھے۔لہٰذا لوگ عوام، تعلیم کے فرسودہ نصاب ہی کو تحصیلِ علم کا ذریعہ سمجھتے رہے اور اسی کی خاطر نجورات، لوبان اور اگربتی سلگاتے رہے۔جس کے دھوئیں میں اصل مقصدِ حیات ہی دھندلا گیا۔اس تعلیمی دھند کا احساس مولانا کو شدید تھا۔غبارِ خاطر میں مولانا آزاد نے اس سلسلے میں یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ

''...خود اس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں، ایک ایسا فرسودہ نظام جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتا سر عقیم ہو چکا ہے۔طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخاب کتب کے اعتبار سے ناقص...''

(غبارِ خاطر، ص123)

گویا مولانا آزاد کو ناقص نظامِ تعلیم کا احساس اپنے ابتدائی زمانۂ تعلیم میں بھی رہا، اس کے بعد کے زمانے میں بھی اور وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وزارت ملنے کے بعد انھوں نے تعلیمی میدان میں جنگی پیمانے پر تبدیلیاں شروع کیں۔اسکول کی سطح سے لے کر جامعات تک کے تعلیمی اور نصابی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔وہ جدید وقدیم علوم کے سنگم سے ایک ایسا جمہوری نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے تھے جو مکہ اور سومنات دونوں کی فکر و آگہی میں معاون ہو۔

مولانا کی اس پیش قدمی پر محمد حسن نے لکھا ہے کہ

''مولانا نے ملک کو جو تعلیمی پالیسی دی بلا شبہ وہ ابھی تک ملک میں عام ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے میں تو کامیاب نہیں ہو سکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ آج ہمارا ملک اس پورے علاقے میں جاپان اور چین کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔''

(’ایوانِ اردو‘ آزاد نمبر، ص115، دسمبر 1988)

اس طرح دیکھا جائے تو مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات محض نظریات تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ بھی پہنایا اور اسے نافذ کرنے کی کوشش بھی کی۔

مولانا آزاد نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے تعلیمی موضوعات پر تقریباً 54 خطبات دیے ہیں جو نہ صرف حکومتِ ہند کی تعلیمی پالیسی کا اظہار ہے بلکہ وہ خطبے ان کی فکر کے ترجمان بھی ہیں۔مئی 1952 میں مولانا آزاد کو وزارتِ قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیق کی اضافی ذمے داری دی گئی تو انھوں نے سائنسی موضوعات پر متعدد خطبے دیے۔اس طرح 1947 تا 1956 تک انھوں نے تعلیمی مسائل کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ اور ازالہ کیا اور وزیر کی حیثیت سے بڑے اہم فیصلے لیے۔ ایسے تمام خطبات کو پبلی کیشن ڈویژن، وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہند نے جنوری 1956 میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ان خطبات سے مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان خطبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی نگاہ محض اسکول اور جامعاتی تعلیم پر نہیں تھی بلکہ ان کی تعلیمی فکر کا دائرہ فنونِ لطیفہ، زراعت، کھیل اور دیگر میدانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ان کے تعلیمی خیالات محض ہندوستانی سیاق ہی کا احاطہ نہیں کرتے ہیں بلکہ دیگر ممالک کی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے موازنے کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ کس قدر وسیع تھی۔ ہندوستان کی یونیورسٹیز کے وائس چانسلرس کی میٹنگ میں 3 نومبر 1951 کو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے زراعتی تعلیم کو فروغ دینے کی بات کی تھی اور یہ شکایت بھی کی تھی کہ ہندوستان میں زراعت اور صنعت میں معقول توازن نہیں ہے جس کا بہت گہرا اثر ہماری معاشی زندگی پر پڑتا ہے۔ہمیں زراعتی تعلیم کو فروغ دے کر زمینی پیداوار میں اضافہ کرنے کی سبیل ڈھونڈنی چاہیے تا کہ ہم مستقبل کے لیے ذخیرہ سازی کر سکیں اور اس بڑھتی ہوئی آبادی میں پیداوار کی کمی سے دو چار نہ ہونے پائیں۔

اسی طرح ان کے دیگر مقالوں سے بھی تعلیمی خیالات مترشح ہوتے ہیں۔جن میں انھوں نے مشرق و مغرب کے طریقۂ تعلیم پر سیر حاصل بحث کی ہے اور دونوں طریقۂ تعلیم کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور دونوں کے مابین اختلافات کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مغرب نے جہاں سائنسی علوم سے استفادہ کر کے اپنے

تعلیمی نظام کو ترقی دی ہے وہیں مشرق نے باطنی امور پر گہری نظر رکھی ہے اور اخلاقی اعتبار سے ترقی کی ہے۔ تاہم مولانا آزاد مشرق و مغرب کے تعلیمی طریقۂ کار کو ہم آہنگ کر کے ایک نئے قسم کے طریقۂ تعلیم کو فروغ دینا چاہتے تھے تا کہ ملک کے باشندے ترقی کی نئی منزلوں پر پہنچ سکیں۔ بغور دیکھیں تو مولانا آزاد محض تعلیم کے جدید طریقۂ کار کے حامی نہیں تھے بلکہ دینی علومِ مشرقیہ اور جدید مغربی تعلیم کے ارتباط سے ملک کے طالب علموں کی تربیت کرنا چاہتے تھے۔ ایسی تربیت جس سے ملک کے طلبا میں یگانگت، اتحاد اور مفاہمت کی فکر پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی نگاہ بنیادی تعلیم پر گہری رکھی۔ مولانا آزاد مدرسوں میں بھی تکنیکی تعلیم کے خواہش مند تھے۔ اسی غرض سے انھوں نے دارالعلوم دیو بند کے ذمہ داران اور دینی مدارس کے علما کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی اور جدید طرز کے نصاب کی پیروی پر زور دیا۔ اس حوالے سے مولانا آزاد کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ایک وزیر تعلیم کی حیثیت سے نصابات کے curriculam اور modules کو بہتر بنانے پر جتنا زور انھوں نے دیا اتنا کسی دوسرے وزیر تعلیم نے آج تک نہیں دیا۔ اس لیے ان کی اس پیش قدمی یا نیک نیتی کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔

اسے مولانا آزاد کی کشادہ قلبی کہیے یا تعلیمی خدمت گزاری کہ انھوں نے ملک میں اعلیٰ قسم کے سائنسی ادارے قائم کیے۔ علومِ مفیدہ سے رغبت پیدا کرنے کے لیے جہاں انھوں نے زور دیا وہیں فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لیے ادارے اور اکادمیاں بھی قائم کیں۔ تعلیم کو مولانا آزاد بلا تفریق ملت و مذہب تمام باشندگانِ ہند کا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی نگاہ میں مرد و زن کی تخصیص بھی نہیں تھی۔ وہ تعلیم کو جس قدر لڑکوں کے لیے ضروری خیال کرتے تھے اسی قدر لڑکیوں کے لیے بھی خیال کرتے تھے بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں اُن کا خیال یہ تھا کہ ’’ان کی تعلیم سے پوری نسل کی تربیت ہوتی ہے۔‘‘ اسی طرح مولانا آزاد تعلیم بالغان (Adult Education) کے بھی خواہش مند تھے۔ معمر اشخاص کی تعلیم کے لیے شبینہ اسکول کے قیام کے تعلق سے انھوں نے 5 فروری 1951 میں پارلیامنٹ میں جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ

’’یہ اسکول وہاں قائم کیے گئے ہیں جہاں ان کے لیے دوسری بنیادی سہولتیں مہیا ہیں اور یہ اسکول کسی مخصوص ذات کے لیے نہیں بلکہ سبھی قوم کے معمر اشخاص کے لیے ہیں... ایسے ایک سو پچاس اسکول دلی میں کھولے گئے ہیں ... آنے والے پانچ برسوں میں مزید اسکول دلی کے الگ الگ علاقوں میں کھولے جائیں گے... اس قسم کے اسکول کا قیام سماجی تعلیم کے اصول پر کیا گیا ہے جس کا مقصد اَن پڑھ لوگوں کو خواندہ بنانا اور ان کی معیارِ زندگی کو بہتر بنانا ہے۔‘‘

(پبلی کیشن ڈویزن، نئی دہلی کی مطبوعہ انگریزی کتب "Maulana Azad" سے ترجمہ)

مولانا آزاد سراپا نسل سازی کے جذبے سے معمور تھے۔ ان کی تعلیمی بصیرت کا اندازہ ان کے اس خیال سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ’’جنگ و جدل اور نفرت کے صحرا میں آرٹ، ادب، سائنس اور فلسفے نے مل کر ہی امن اور خیر سگالی کا نخلستان پیدا کیا ہے۔‘‘ (تذکرہ)

مولانا ابوالکلام آزاد مجاہدِ آزادی، ادیب، صحافی اور عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ قومی تعلیم کو صحیح سمت و رفتار دینے والے سچے ماہر تعلیم بھی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اتفاق و اتحاد اور تعلیمی بہتری کے لیے صرف ہوا۔ انھوں نے جس انداز سے مربوط تعلیمی نظام کا خاکہ پیش کیا ہے وہ ہمارے لیے کسی مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ ان کی نگاہ میں تعلیم تو زندگی کی تیاری کے مصداق تھی۔ وہ تعلیم کو محض ذہنی بیداری کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ جذبات و احساسات اور تہذیب و شائستگی کے over all development کو تعلیم کا نام دیتے تھے۔ وہ تعلیم کے ذریعے افراد کی ہمہ گیر ترقی کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں تعلیم، وسیلۂ معیشت نہیں تھا بلکہ مقصدِ حیات اور ایک مشن تھا جس کے ذریعے انسان کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان لانا، بھائی چارے کی ترغیب دینا، قومی ہم آہنگی اور انسانی مساوات کو فروغ دینا، ہی ان کے سامنے تعلیم کا اصل مقصد تھا۔ زندگی سے رخصت ہونے تک (22 فروری 1958) وہ تعلیمی مسائل کے سدّ باب ہی میں لگے رہے۔ ان کے تعلیمی خیالات کی بنیاد اس فکر پر تھی کہ ’’جہالت کا سدّ باب کیے بغیر کسی بھی قسم کی جمہوریت اور اس کے نظام کو قائم نہیں کیا جا سکتا۔‘‘ اسی بنیادی خیال کے ساتھ قومی تعلیم کے لیے وہ زندگی بھر جدو جہد کرتے رہے۔ 16 جنوری 1948 کو منعقد ہونے والی کل ہند تعلیمی کانفرنس میں خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ

’’ایک لمحے کے لیے بھی ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کم سے کم بنیادی تعلیم ہر ہندوستانی کا پیدائشی حق ہے اور جس کے بغیر وہ ہندوستانی باشندہ ہونے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔‘‘ (امام الہند نمبر، روزنامہ نئی دنیا، دہلی)

مولانا آزاد درسِ تعلیم میں قدیم طریقۂ تدریس کے قائل تھے لیکن نصابات کی تجدید پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور اسے وقت کی اہم ضرورت سمجھتے تھے۔ وہ چند موضوعی کتابوں کے مطالعے ہی کو علم کے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے اس لیے مختلف علوم سے ربط ضبط رکھنے کی اکثر تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو بھی وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے اس لیے 16 کتوبر 1951 کو انھوں نے دارالعلوم دیو بند کے استاد قاری طیب سے کہا تھا کہ

’’سائنس اور ٹکنالوجی، فلسفہ، سماجی علوم و معاشیات میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں انھیں بھی آپ اپنے نصاب میں شامل کریں تا کہ دینی و دنیاوی فکر کا سنگم ہو جائے۔‘‘ (امام الہند نمبر، روزنامہ نئی دنیا، دہلی)

مولانا آزاد انسان سازی کے عمل میں نصابات، کتب اور دیگر تکنیکی طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے رول کو بھی بہت اہم خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ’’تعلیم، تہذیب اور اخلاق کی بہتری میں استاد بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا حکومت پر فرض ہے۔‘‘ مولانا آزاد نے ملک کی تعمیر اور جمہوریت کے قیام کے لیے تعلیم سے زیادہ کسی دوسری چیز کو اہمیت نہیں دی۔ اس طرح مولانا آزاد نے اپنے تعلیمی خیالات سے امن و اتحاد کو فروغ دیا، مستقبل کے امکانات کو واضح اور وسیع کیا اور انسانی رشتوں کے استحکام کے لیے تعلیم ہی کو اولیت دی۔ آج ملک میں تعلیم کی جو بھی اور جیسی بھی سرگرمیاں ہیں ان کی بنیاد میں مولانا آزاد ہی کے تعلیمی خیالات رقصاں ہیں۔

دیگر کتب جن سے استفادہ کیا گیا:

- ابوالکلام آزاد: شورش کاشمیری
- ابوالکلام آزاد: عبدالقوی دسنوی
- ابوالکلام آزاد: عابد رضا بیدار
- سہ ماہی رسالہ ’صبح‘ دہلی، آزاد نمبر 1971

■

Dr. Ahmad Imteyaz, Department of Urdu, University of Delhi, Delhi-11007

ظہیر علی صدیقی

گنج غرائب-ایک مخطوطہ

گنجِ غرائب مخطوطہ مؤلفہ میر مہدی حسین مجروح، رامپور رضا لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ مخطوطے کے اختتام پر قطعۂ تاریخ سے، سنہ تالیف 1886 نکلتا ہے۔

مجروح غالب کے عزیز ترین شاگرد ہیں۔ ان کی پیدائش اپنی آبائی حویلی، واقع اردو بازار، دہلی میں 1833 میں ہوئی۔ اردو بازار بلاقی بیگم کے کوچے کے سامنے تھا۔ 1857 میں اردو بازار کو ڈھا دیا گیا، حویلیاں مکانات مسمار کردیے گئے۔ چنانچہ غالب نے مجروح کو اپنے ایک خط میں مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے۔''

مورخین نے لکھا ہے کہ اگر دہلی میں اردو بازار کے ملبے کو صاف کرادیا جاتا تو بہت دور تک صرف میدان نظر آتا۔ 1857 میں شعرا و ادیبوں پر بھی کم مظالم نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے عوام کے ذہن میں انقلاب پیدا کیا تھا، چنانچہ اردو کے پہلے اخبار کے بانی، مجتہد مولانا محمد باقر کو گولی سے اڑادیا گیا۔ موصوف مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ مولانا فضلِ حق کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ وہاں انھوں نے ایک عربی میں کتاب الثورۃ الہندی لکھی۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کو بھی جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ میر مہدی حسین مجروح کا بھی مکان ڈھا دیا گیا تھا۔ مجروح نے اپنے دیوان مظہر معانی کے دیباچے میں لکھا بھی ہے:

''گھر لٹ گیا وطن چھٹ گیا، تصنیف کا ذخیرہ خوانِ یغما ہوگیا۔''

پروفیسر محمد عزیز الدین حسین صاحب، ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری نے 1857 اور میر مہدی حسین مجروح کے بارے میں لکھا ہے:

''1857 کے بعد مسلمانوں نے دہلی کے قرب وجوار کے جن شہروں اور قصبات میں پناہ لی ان میں رامپور اور پانی پت قابلِ ذکر ہیں۔ رامپور اس اعتبار سے اہم ہے کہ 1857 کے ہنگامہ خیز حالات سے یہ ریاست محفوظ رہی۔ رامپور کے حسن عمل سے جو مسلمان بالخصوص اہلِ دانش مزید تباہی و گمنامی سے محفوظ رہے ان میں خود غالب اور ان کے چہیتے شاگرد میر مجروح بھی ہیں۔'' پروفیسر محمد عزیز الدین حسین صاحب، ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری کے اس قول کے بعد غالب کے تین خطوط کا تذکرہ نامناسب سمجھتا ہوں۔ ایک خط 6 جولائی 1860 کو غالب نے علی بخش خاں کے نام لکھا۔ جو والی رامپور نواب یوسف علی خاں کے دستِ راست تھے۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا تھا:

اس داستان میں ہندوستانی تہذیب اور فضا موجود ہے۔ نہ شراب کا گلاس ہے نہ برہنہ رقاصہ بلکہ عشق کی ہلکی ہلکی آنچ ملتی ہے۔ شہزادی مہربانو کو حاصل کرنے کے لیے شہزادہ کو کوئی جنگ نہیں کرنا پڑی ہے۔ بلکہ ایک بزرگ کی معرفت پیام گیا ہے۔ ابھی تک تحقیق کے مطابق یہ قصہ مجروح کا طبع زاد ہے اور داستانی فضا کو توڑتا ہوا قصے کے عبوری دور کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

''یہ دو صاحب برخوردار میر مہدی اور نور چشم میر سرفراز حسین نوکری کی جستجو کو نکلے ہیں... رامپور پہنچتے ہیں۔ اس خط کے ذریعے تم سے ملیں گے۔ ان کو کسی مناسب کام پر لگادو۔''

(راقم اسداللہ خاں)

میرزا غالب نے اس مضمون کا ایک خط رامپور میں آغا محمد حسین صاحب کو بھی لکھا تھا۔ خطوط کی اس طرح کی آمد سے نواب محمد یوسف علی خاں ناظم ناراض ہوئے۔ چنانچہ بعد میں غالب نے نواب یوسف علی خاں کو معذرت کے طور پر جو خط لکھا ہے وہ ایک طرح سے معذرت نامہ ہوتے ہوئے بھی سفارش نامہ تھا۔ اس لیے کہ اس میں میرن صاحب کی ذاکری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے مرثیے سننے کی سفارش کی گئی تھی۔

دراصل ریاست رامپور انگریز کے تحت تھی۔ جو ریاست وکٹورین راج کے ماتحت ہو وہ ایسے افراد یا فرد کی

مدد نہیں کرسکتی تھی جس کا گھر 1857 میں منہدم کر دیا گیا ہو۔ با قاعدہ اسے ملازمت میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ ریاست میں ذاتِ خاص کے بجٹ میں ایک مدّ مدّ معلوم تھی۔ اس میں کثیر رقم رہتی تھی۔ اس رقم میں سے رئیس وقت خفیہ طور پر مدد کرتا تھا۔ اس کی اطلاع صرف رئیسِ وقت یا خانِ سامان یا میرِ سامان کو ہوتی تھی۔ غالب بھی اس راز سے شاید واقف تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ غالب نے پہلا دستی خط لے کر میر مہدی کو علی بخش خاں خانساماں کے پاس بھیجا تھا۔ مجروح نے رامپور میں قیام بھی کیا ہے۔ غلام رسول مہر، حکیم عبدالحی اور مالک رام نے ریاست رامپور کی مدد کا ذکر کیا ہے۔

گنج غرائب میں چند روایات و حکایات جمع کی گئی ہیں۔ لیکن ان روایات و حکایات کے درمیان مجھے ایک داستان بعنوان 'حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز' ملی اس کے لیے میرا دعویٰ ہے کہ یہ داستان مجروح کی طبع زاد ہے، میری اس گفتگو میں مرکزی طور پر یہ داستان زیر بحث ہے۔

'حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز' کی فضا اس میں پائی جانے والی رسمیں، بازاروں کا ذکر، اور تہذیبی و تمدنی عناصر، رامپور اور گرد و نواح کی عکاسی کرتے ہیں۔ اغلب ہے کہ یہ قصہ مجروح کے ذہن میں قیام رامپور کے دوران مرتب ہوا ہو۔ عام طور پر داستانیں یا ابتدائی قصے ملک چین یا دوسرے ممالک سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن 'حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز' کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ملکِ ہندستان سے شروع ہوا ہے۔ ابتدا اس طرح ہے:

''راویانِ جادو تقریر ومحررانِ رنگین تحریر نے اس داستان ندرتِ بیان کو اس طرح صفحۂ قرطاس پر لکھا ہے کہ زمانہ گزشتہ میں اقصائے ممالک ہند میں بادشاہ والا جاہ تھا... غریب پرور اس کے زمانہ معدلت میں ہاتھی چونٹی کا نگہبان اور باز کبوتر کا پاسبان تھا۔ شیر آہو کے سر پر دستِ شفقت پھیرتا تھا۔ چرواہا اگر بکریوں کے ساتھ نہ جاتا تھا تو بھیڑیا راہ بتانے آتا تھا۔''

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے مصنف کے ذہن میں ہندوستان کی یہ تصویر تھی کہ بڑی طاقتیں کمزوروں کا استحصال نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کی نگہبانی کرتی تھیں۔ اکثر داستانوں میں شہزادہ شکار کے دوران ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے کسی آسیبی باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ طلسم ہوشربا میں جاموش ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے لشکر سے بچھڑ جاتا ہے اور جیسے ہی ہرن کو ہلاک کرتا ہے ایک صدائے مہیب پیدا ہوتی ہے:

''اے فرزند حمزہ غضب کیا کہ قتل کیا غزال جادو کو، یہ سرحد طلسم ہوشربا ہے یہاں سے اب بچ کر جانا تیرا دشوار ہے۔''

لیکن 'حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز' میں شہزادہ

1857 میں شعرا و ادیبوں پر بھی کم مظالم نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے قلم کی طاقت سے عوام کے ذہن میں انقلاب پیدا کیا تھا، چنانچہ اردو کے پہلے اخبار کے بانی، مجتہد مولانا محمد باقر کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ موصوف مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ مولانا فضل حق کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ وہاں انھوں نے ایک عربی میں کتاب الثورۃ الھندیہ لکھی۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کو بھی جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ میر مہدی حسین مجروح کا بھی مکان ڈھا دیا گیا تھا۔

شکار ماہی کے لیے جاتا ہے اور دریا کے کنارے سے بجرے میں ایک حسینہ کو بجرہ کھیتے دیکھتا ہے۔ شہزادہ اس پری رخ کو دیکھ، فریفتہ ہوکر دریا کے کنارے بیہوش ہوکر گر پڑتا ہے۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر داستانوں میں وزیر زادہ کو بھیجا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وزیر زادہ شہزادے کا دوست اور ہم سن ہوتا ہے۔ لیکن حکایت عشق انگیز میں وزیر کو بھیجا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ وہ وزیر زادے کی نسبت زیادہ تجربہ کار ہے۔ وزیر سے بادشاہ نے کہا کہ ''جس طرح ممکن ہو شہزادے کو یہاں لا۔''

اس موقعے پر وزیر کی جانب سے مکالمے نہیں ہیں یعنی قصے کا بنیادی عنصر اختصار موجود ہے۔ 'حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز' میں شادی سے پہلے با قاعدہ پیام بھیجنے کا ذکر ہے اور ان رسوم کے لیے تورہ بندی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ منگنی کی تاریخ ٹھہرائی جاتی ہے، سمدھنیں ایک دوسرے کے ساتھ پھلوں اور سبزیوں سے چوتھی کھیلتی ہیں اس کا ذکر اس طرح ہے:

''غرض جب سمدھنیں اتر چکیں دولہا دلہن میں چوتھی کی رسمیں ہوئیں۔ پھر سمدھنیں آپس میں چوتھی کھیلیں۔ ایک محشر بپا ہوا۔ کوئی پھولوں کی چھڑی لے کر خوب لڑی کسی کے جوگنبد کی چوٹ لگی لقو ہوکر گر پڑی۔ کسی کا رخسار رنگترہ لگنے سے لال ہوا۔ کسی نازنین کو کیلے کی چوٹ کا ملال ہوا۔

وزیر زادہ اور شہزادہ محبوب کی تلاش میں ایک شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں کے بازار کا ذکر ملاحظہ ہو جو رامپور اور گرد و نواح کے بازاروں کی طرح ہے:

''سوداگروں کے کوٹھوں میں اجناس، ہر دیار بزازوں کی دوکانیں پارچہ ہائے رنگ برنگ سے رشک کا زمانہ گوٹہ کناری والوں کی دوکانیں کسی طرف کباب بھن رہے تھے کسی طرف مٹھائی بک رہی تھی۔ تماشائیوں کا ہجوم خریداروں کی دھوم۔''

حکایت عشق انگیز میں شہزادہ طلسم ہوشربا کے امیر حمزہ کی طرح کم سنی میں مہیب طاقتوں سے نہیں لڑتا ایک عام انسان کی طرح زندگی کے مراحل سے گزرتا ہے۔ اس حکایت میں صرف ایک ایسے نجار کا ذکر ہے جو ایسا تخت بنانا جانتا ہے جو ہوا میں اڑ سکتا ہے۔ یا ایک ایسے بزرگ کا ذکر ہے جنھوں نے ایک گائے کو زندہ کر دیا تھا۔ حکایت عشق انگیز ومحبت ولولہ خیز 1869 میں مکمل ہوئی۔ اس کے کاتب مرزا حسین ہمدانی ہیں، جنھوں نے کوٹلہ قدم شریف میں اس کی کتابت مکمل کی۔

اس داستان میں ہندوستانی تہذیب اور فضا موجود ہے۔ نہ شراب کا گلاس ہے نہ برہنہ رقاصہ بلکہ عشق کی ہلکی ہلکی آنچ ملتی ہے۔ شہزادی مہربانو کو حاصل کرنے کے لیے شہزادہ کو کوئی جنگ نہیں کرنا پڑی ہے۔ بلکہ ایک بزرگ کی معرفت پیام گیا ہے۔ ابھی تک تحقیق کے مطابق یہ قصہ مجروح کا طبع زاد ہے اور داستانی فضا کو توڑتا ہوا قصے کے عبوری دور کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مختصر ترین داستان کل 90 صفحات پر مشتمل ہے۔

■

Dr. Zaheer Ali Siddiqui, Chowk Mohd Saeed Khan Langar Khana, Rampur - 244901 (UP)

پرویز اشرفی

اردو کے خادمِ قرآن
ابومحمد مصلح سہسرامی

صوبہ بہار کے تاریخی شہر سہسرام جسے عرف عام میں شیر شاہ سوری کی نگری بھی کہا جاتا ہے، ایسی سرزمین ہے جہاں کی مٹی میں ادب کی خوشبو ہے۔ بی بی سی لندن کے معروف صحافی رضا علی عابدی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'جرنیلی سڑک' میں سہسرام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ''اس شہر کے کنکر پتھر بھی شاعر و ادیب ہیں۔''

اِسی تاریخی شہر سہسرام کے محلّہ باڑہ کی مسجد کے متصل چراغ علی خاں صاحب المعروف چمرو خاں کے آنگن میں وزیر علی خاں نام کا پھول کھلا، جنھیں علمی دنیا ابومحمد مصلح کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ آپ کی پیدائش 1877 میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم مولوی حسن علی راحت سہسرامی کے فرزند مولوی شوکت علی خاں سہسرامی محلہ بارہ دری سے حاصل کی۔ اُس کے بعد جب سن شعور کو پہنچے تو مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام میں داخلہ لیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ (کولکتا) کے نصاب کے مطابق اسی خانقاہ کبیریہ میں پائی۔ 1900 میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل کیا اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

ابومحمد مصلح صاحب مولوی حسن جان سہسرامی ابوالعلائی سے بیعت تھے۔ کافی دنوں تک ان کی صحبت میں رہے جس کی وجہ سے قرآن کی خدمت ہی زندگی کا مقصد بن گیا۔

علمی کارنامے: علم کے دریا سے سیراب ہونے کے بعد ابومحمد مصلح صاحب نے متعدد اخبار و رسائل جاری کیے جن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

سب سے پہلے ماہنامہ 'حسن و عشق' ڈِہری آن سون سے 1924 میں جاری کیا جس کے مدیر اعلیٰ ابومحمد مصلح صاحب تھے۔ اس رسالے کے چند شمارے محلہ مَنڈئی کشور خان میں 'شیخ کرامت علی لائبریری' میں موجود ہیں۔ افسوس کہ جس عمارت میں لائبریری تھی اب اُس پر لائبریری کا بورڈ موجود نہیں ہے۔

ماہنامہ 'حسن و عشق' کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے شماروں میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، شاہ سید سلیمان پھلواروی اور نیاز فتح پوری جیسے بزرگوں کی نثریں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ معروف شاعر شاد عظیم آبادی اور معروف افسانہ نگار پریم چند کی تخلیقات بھی شائع ہوچکی ہیں۔ طرحی غزلیں بھی ماہنامہ حسن و عشق میں شائع ہوتی تھیں اسی وجہ سے رسالہ مقبول عام تھا۔

1926 میں ابومحمد مصلح ڈِہری آن سون سے سہسرام منتقل ہوگئے اور 'الاصلاح' نام سے ایک پریس قائم کیا اور اسی نام کا ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ اپنے پریس 'الاصلاح' سے ہی اپنی کئی کتابیں شائع کیں۔ خواتین کے لیے بھی ماہنامہ جاری کیا اور اُن کے لیے مضامین لکھے۔ اس کے بعد حیدرآباد (دکن) سے ایک مشہور رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا جسے بعد میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اُن سے خرید لیا۔

سہسرام میں قیام کے دوران مصلح صاحب رسائل اور اخبار کی اشاعت کے علاوہ مسجد میں درس قرآن بھی دیتے تھے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے ایک تنظیم بھی بنائی تھی اور بیت المال کا نظم بھی کیا تھا۔

تصانیف: مصلح صاحب کی متعدد تصانیف ہیں لیکن صحیح تعداد کا علم نہیں۔ چند تصانیف کا ذکر ذیل میں درج ہے۔

1. **تاریخ سہسرام:** ابومحمد مصلح صاحب کی یہ تصنیف اُن کے وطن کے علاوہ پہلی بار باہر بھی مقبول ہوئی۔ یہ کتاب دوبارہ شائع ہوچکی ہے۔ پہلی بار دیوبند سے چھپی تھی۔ اس کتاب میں قدیم سہسرام، اور قدیم ہندوستان سے اس شہر کا تعلق، قدیم عہد میں اس شہر کے متعدد نام۔ مسلم سلاطین خاص کر شیر شاہ سوری کے زمانے میں اس کا عروج، اکابرین سہسرام کے احوال، بعض مشائخ و بزرگوں کے آستانے، مقابر و مساجد کا تفصیلی و اجمالی تعارف شامل ہے۔ اس کتاب کی Authenticity کے متعلق جب راقم الحروف نے رامپور رضا لائبریری جو رامپور کا ادبی تاج محل کہلاتا ہے، اس کے سابق افسر بکار خاص جناب وقار الحسن صدیقی صاحب (مرحوم) سے بات کی تھی تو اُن کا کہنا تھا کہ تاریخ سہسرام کتاب تو ہے لیکن ماخذ کی کمی ہے اور بہت سی باتیں سنی سنائی ہیں۔ پھر بھی لائق مطالعہ ہے۔''

2. **مشاهیر شعرائے سہسرام:** مصلح صاحب کی یہ دوسری تصنیف ہے اسے 1926 میں اپنے ہی پریس الاصلاح سے طبع کی گئی۔ بہت سے تذکرہ نگار شعرائے بہار نے اس کتاب سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

3. **قرآن کا پیغام اهل سہسرام کے نام:** یہ کتابچہ ادارہ عالمگیر قرآن مجید حیدرآباد دکن سے چھپا ہے۔ مصلح صاحب کی یہ منظوم کاوش ہے۔

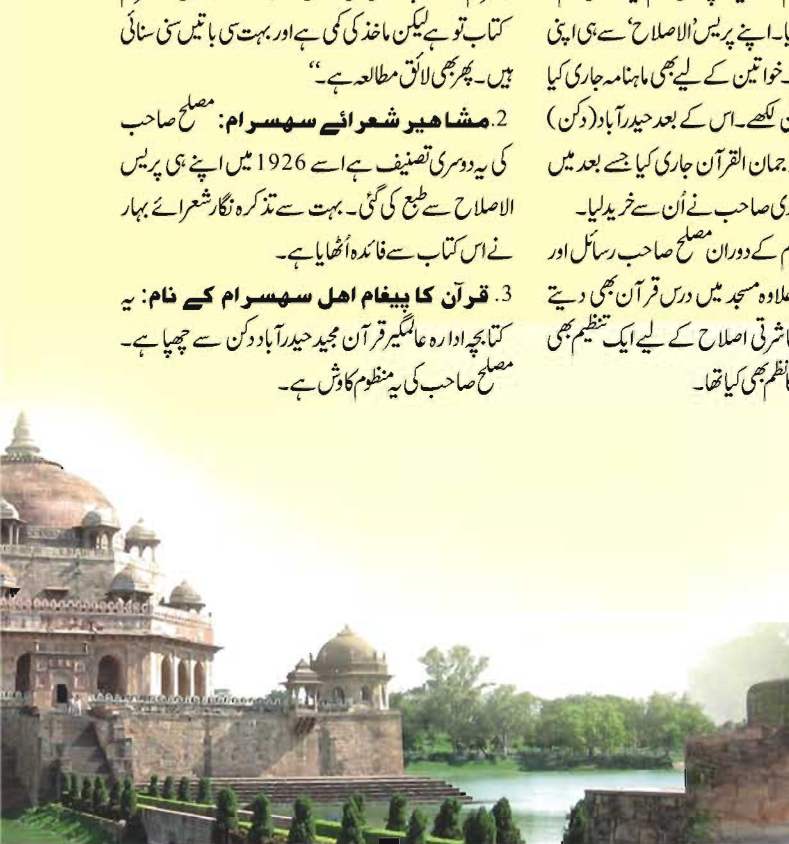

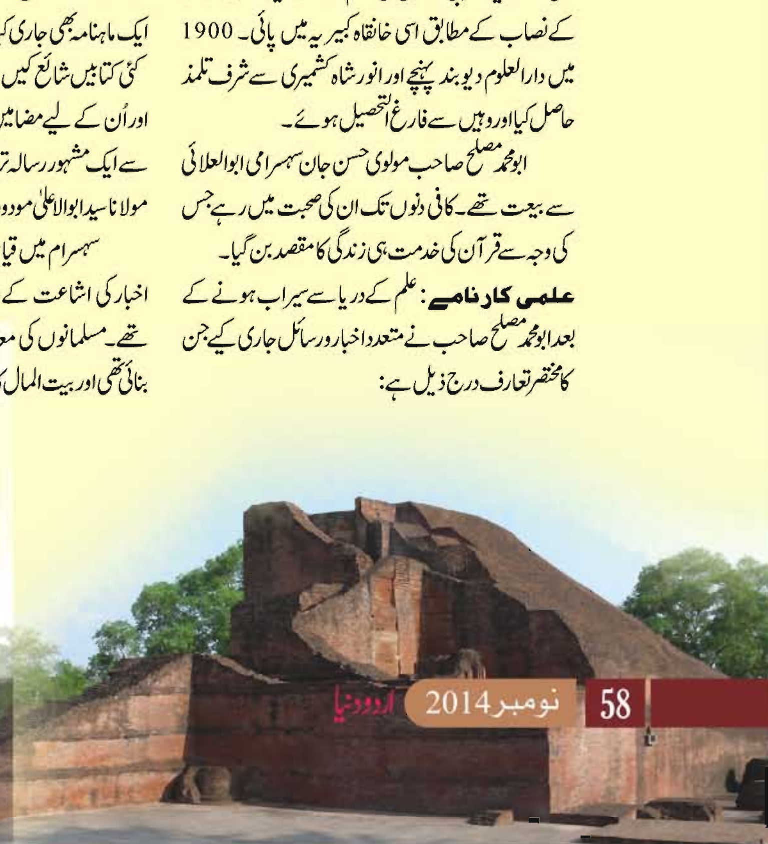

4. قرآن اور اقبال: **ابو محمد** مصلح کی یہ کتاب خالص ادبی ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے اشعار کا تجزیہ پہلی مرتبہ قرآنی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ وہ علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اسی کتاب میں وہ فرماتے ہیں: ’’میرا مقصد یہ ہے کہ کتاب اللہ کی ایک حقیر سی خدمت انجام پائے جو اس نا چیز کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ یہی سبب ہے کہ تالیف تصنیف کے لوازم کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ شعر نقل کردیے گئے ہیں اور استفادے کا حق قارئین کے لیے محفوظ ہے۔

مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ عام طور پر آج کوئی بھی انسانی زندگی کے اس مقصد پر نہیں جو اس پیدا کرنے والے کی طرف سے متعین کیا گیا ہے اور اس صحیح مرکز پر لانے کے لیے کہنے کی نہیں بلکہ کردینے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا کلام اس ضمن میں جو کچھ کرسکتا تھا، کرچکا اور اُس کے نتائج سامنے ہیں۔‘‘

بحوالہ مولانا ارتضاء الدین حاذق ضیائی کی تصنیف رجال سہسرام

یقیناً مصلح صاحب سچے خادم قرآن تھے۔ اسی وجہ سے بے جھجک اپنا مقصد لوگوں کے سامنے رکھ دیتے تھے۔

ابو محمد مصلح صاحب نے بچوں کے لیے تیسوں پاروں کی تفسیر قرآن نہایت سلیس زبان میں لکھی تھی۔ عم پارہ، سیقول، اور تلک الرسول راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پارہ ’عم‘ بہت مقبول ہوا۔ مصلح صاحب جس وقت قرآن کی تعلیم عام کررہے تھے اُن کا اسلوب اختصاری تھا۔

5. شہید کربلا اور توضیح القرآن: مصلح صاحب ایک خادم قرآن تھے انھوں نے کربلا کے واقعات کو مختلف نقطہ نظر سے دیکھا ہے اور عکسی توضیح القرآن جسے مالکان مطبع محمدی مجگاؤں ممبئی: 10 نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

شاعری: ابو محمد مصلح صاحب، خادم قرآن کے علاوہ اچھی شاعری بھی کرتے تھے نثر و نظم پر قدرت رکھتے تھے ان کی شائع شدہ تخلیقات کو اخبار و رسائل سے جمع کیا جائے تو ایک مجموعہ تیار ہوجائے گا۔ آغاز شاعری میں مولوی حسن خاں ابو العلائی حسن سہسرامی سے شرف تلمذ کے بعد میں جلال لکھنوی سے بھی اصلاح لی تھی نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

جینا انھیں کا تھا وہی کچھ کام کر گئے
مرنے سے پہلے راہ میں جو تیری مر گئے
غربت میں اب تو یاد بھی آتا نہیں وطن
مدت کی ہے یہ بات، زمانے گزر گئے
وہ اور اپنے بندوں پہ مصلح کرے عذاب
واعظ کے تو بیان سے ہم آج ڈر گئے

وفات: 18 ستمبر 1968 کو مصلح صاحب کی طبیعت بگڑی۔ کھانا پینا بند ہوگیا۔ دوائیں جاری تھیں افاقہ بھی ہوا۔ اس دوران میں وطن سہسرام کی یاد بہت آتی رہی وطن ہی میں مرنا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ نے دکن کی سرزمین ہی کو آخری آرام گاہ متعین کردیا تھا۔ آخر دم تک سہسرام لے چلنے کی خواہش کرتے رہے۔

آخرکار بروز پیر 6 رجب المرجب 1388ھ مطابق 30 ستمبر 1968 کو رات کے آخری حصے میں قرآن کا یہ سچا خادم اور سرزمین سہسرام کا عظیم فرزند اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

ایک مصنف، قرآن کا مبلغ، علم کا پیکر اور شاعر ابو محمد مصلح صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے عزیز وطن سہسرام کے بارے میں اپنے احساسات اشعار کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھالا کہ سہسرام سے اُن کی گہری محبت جھلکتی ہے:

آہ اے پیارے وطن اے سرزمین سہسرام
وہ ترقی یہ تنزل اُف رے عبرت کا مقام
فخر سارے ہند پر تجھ کو کبھی تھا تو وہ ہے
اپنے فرزندوں کو تاج و تخت بخشا تو وہ ہے
ہاں تیری آب و ہوا کچھ ایسی ہی تھی جاں فزا
آپ اپنا ہی تھا ثانی تیری گودوں کا پلا
روز روشن کی طرح روشن ہے اُس کا نیک نام
شیر شاہ عالی حشم، عالی اِسم، عالی مقام
ایک ہستی کیا سے کیا کرسکتی ہے دکھلا دیا
گر ترقی کا تمھیں اہل وطن بتلا دیا
چپّہ چپّہ پر ترے ہے یادگار اسلاف کی
ذرّہ ذرّہ میں تیرے ہے شان اسلامی چھپی
سر اُٹھا کر کہہ رہا ہے شیر شاہ کا مقبرہ
ہے تیری آغوش میں ہندی نپولین ترا
اے میرے پیارے وطن مصلح ترا تجھ پر نثار
ہیں تیرے کھنڈرات سے ظاہر ترے اگلے وقار

ماخوذ از تاریخ سہسرام

Parwez Alam, D-321, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar Okhla, New Delhi- 110025

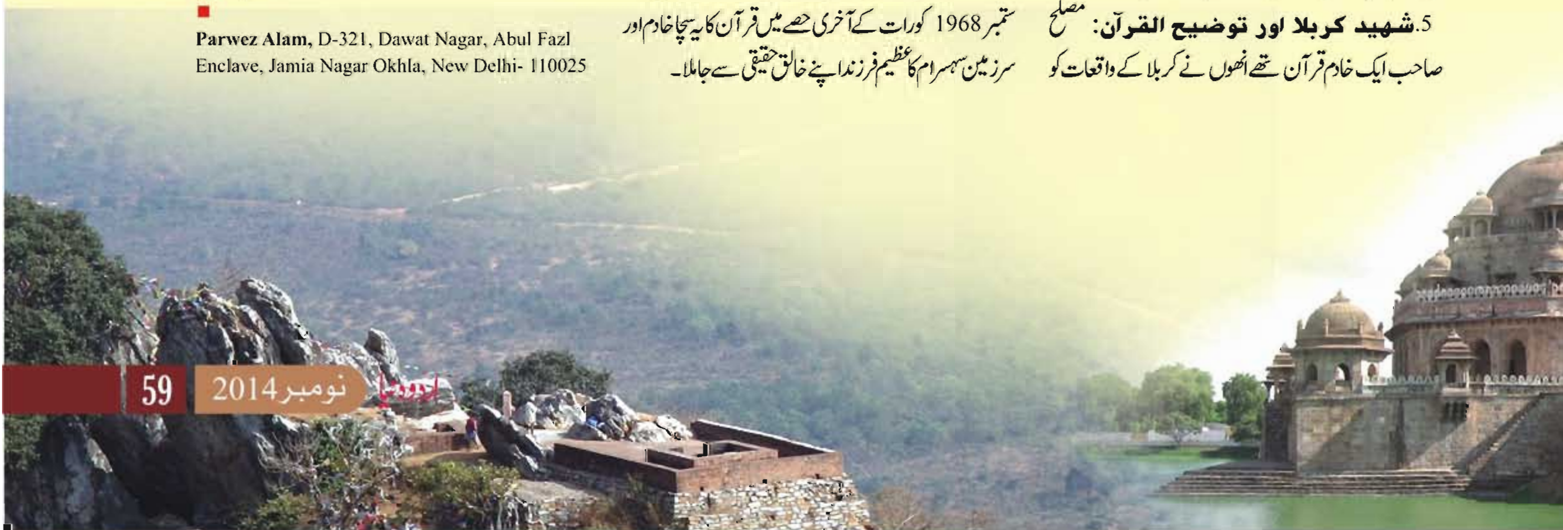

صدیق مجیبی کی شاعری میں استعاراتِ کربلا

حسن مثنیٰ

اردو ادب میں ریاست جھارکھنڈ کی شناخت الیاس احمد گدی، غیاث احمد گدی، وہاب دانش، پرکاش فکری اور صدیق مجیبی کے شستہ ادبی ذوق کی وجہ سے بھی ہے کہ ان سبھی کے دم سے یہاں شعر وادب کا چراغ روشن رہا ہے، بلکہ آخر الذکر تین شعرا یہاں ادب وشعر کا مثلث کہے جاتے ہیں لیکن اس قبیل کی آخری نشانی ڈاکٹر صدیق مجیبی (پیدائش 8 جولائی، 1931 وفات 6 مارچ 2014) تقریباً تراسی برس کی عمر میں دنیائے شعر وادب کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی شعر گوئی اور مشق سخن کوئی نصف صدی پر محیط ہے، اس درمیان ان کا صرف ایک شعری مجموعہ 'شجر ممنوعہ - 1996' پروفیسر جابر حسین کی کوششوں سے منظر عام پر آسکا اور بس۔ جیسا کہ اس مجموعے کے نام سے ظاہر ہے اس میں بھی ایک رمز، ایک اشارہ اور ایک استعارہ پوشیدہ ہے جو شاعر کا طرز فکر، اس کا ادبی نقطۂ نظر، اس کا رجحان اور ان سبھی سے بالاتر ان کے افتاد طبع کا سراغ دیتا ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکیت، رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت سبھی افکار و رجحانات کا بہترین رچاؤ اور ان اوصاف کا سنگم پایا جاتا تھا۔ وہ ایک آزاد منش انسان تھے جسے عہدہ و منصب اور صلے کی کبھی کوئی پروا نہیں ہوا کرتی۔ انھیں باطل کو پچھاڑنا تھا اور حق کی طرفداری کرنی تھی سو وہ کرتے رہے، اس کے لیے انھوں جو راستہ اختیار کیا وہ اہم تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے کہا تھا کہ:

سچ کے حق میں تو زمانے کی روایت ہے قدیم
زہر ہی دیتا ہے یا اس کی زباں کاٹتا ہے

اس شعر میں اگر ایک طرف تاریخی واقعہ (سقراط کو زہر کا پیالہ پلانے) کی طرف اشارہ ہے تو دوسری جانب میثم تمار کی زبان کاٹے جانے کا استعارہ بھی پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے یہ شعر غزل کا ہے لیکن لہجہ استعارتی ہے جس کی جانب اشارہ کیا گیا۔ مدعا یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری میں تاریخ اور مذہب دونوں ہی سے بخوبی فیض اٹھایا ہے۔ دیکھیں اسی قبیل کا ایک اور شعر کہ:

مسیح وقت اب آئے تو بس خدا آئے
پیمبروں کی زمیں اور عذاب چاروں طرف

یوں تو اس شعر میں مسیح وقت یعنی جناب عیسیٰ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور اس بات پر توجہ مرکوز کرائی گئی ہے کہ موجودہ عہد میں حالات اتنے ناگفتہ بہہ ہیں کہ اب کسی کی مسیحائی پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا یا پھر یہ کہ اب کسی کی مسیحائی میں وہ قوت بھی نہیں کہ عذاب دنیا سے نجات حاصل ہو سکے۔ میری نظر میں اس قسم کے ان کے سبھی اشعار عصر حاضر کی کشمکش کا بیان ہیں۔ انھوں نے مذکورہ اشعار میں خیر و شر کی جنگ کا اس قدر سپاٹ بیان کیا ہے کہ ایسا ان جیسا ہی کوئی شخص کر سکتا تھا یہ شعر دیکھیں جس میں کوفہ اور صبر کے دو بڑے ہی معنی خیز استعارات استعمال کیے گئے ہیں۔ بظاہر یہ شعر غزل کا شعر ہے جو اپنے عہد کی منافقتوں کا بیان ہے لیکن اسے کربلائی پیکر عطا کر دیا گیا ہے کہ اس کو سمجھے بغیر شعر کی تفہیم ممکن ہی نہیں:

جس کرب سے کوفے میں گذاری ہے الٰہی
اس صبر و شرافت کا صلہ تو ہی مجھے دے

کوفہ اور صبر دونوں ہی استعارے کربلا سے براہ راست وابستہ ہیں۔ کوفہ ایک ایسا مقام ہے جہاں صبر نے اپنے جوہر دکھائے ہیں اور باطل سے نبرد آزما ہونے کا ہنر بھی سکھایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائے آفرینش سے ہی حق و باطل اور خیر و شر کی طاقتیں متصادم رہی ہیں۔ جہاں تک صدیق مجیبی کی شخصیت اور شاعری کا سوال ہے ان کی افتاد طبع اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ وہ ان منفی عناصر سے ہمیشہ پاک رہے ہیں اور انھوں نے حق گوئی و بیباکی کو تادم مرگ اپنا شعار بنائے رکھا، وہ باطل کو یکلخت مسترد کرنے سے کبھی نہیں چوکے کہ اسی میں ان کی شاعرانہ عظمت بھی پوشیدہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی شعری کائنات میں ذکر کربلا اور استعارات کربلا اسی کا شاخسانہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ بقول شاعر:

اک مدرسہ تھا کربلا امت کے واسطے
بھولے ہوئے سبق سے سبق چاہتا ہوں میں

وہی کربلا جو تاریخ عالم کا اہم باب ہے۔ صدیق مجیبی نے بھی اسی سے سبق لینے کی بات کی ہے، ایسا کیونکر نہ ہو کہ دنیا کی عظیم ترین شاعری کی جڑیں مذہب اور تاریخ سے توانائی حاصل کرتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں اردو کوئی اچھوتی زبان نہیں کہ اس نے بھی مذہب اسلام اور تاریخ اسلام سے مواد اخذ کیا حتیٰ کہ اس زبان نے ہندوؤں اور عیسائیوں کی اساطیر (Mythology) اور علامات وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے،

فیضان حاصل کیے ہیں۔ اردو میں جس قدر مذہبی شخصیات کے متعلق شاعری کی گئی ہے اس قدر دیگر زبانوں میں ان کے ہیروز سے متعلق ذرا کم مواد دستیاب ہے لیکن اسے موضوع ضرور بنایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں رامائن ومہابھارت اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو تاریخ عالم کے باب میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے، اس کی ضوفشانیاں چہار سو پھیلی ہوئی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اس کا ذکر دنیا کے تمام ادب میں کم وبیش مل ہی جاتا ہے۔ خصوصاً واقعہ کربلا ایک ایسا موضوع ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی فکر نے ہر دور میں ذہنوں کے جالے دور کرنے کا کام کیا ہے۔ صدیق مجیبی کے یہاں اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ کریں جن میں شاعر اپنی فن کاری کے ساتھ جلوہ گر ہے:

فکر و دانش ہو شجاعت ہو وہ خیبر کہ حنین
جتنے دروازے ہیں سب سوئے نجف کھلتے ہیں
جو کربلا میں نہ آیا تو اس سے کیا امید
تباہ حال ہوں پروردگار دیکھتا ہے
اس نے جب دریا پہ پہرہ ڈال دیا
پیاس نے بھی صحرا میں ڈیرا ڈال دیا

ان شعار پر اگر غور کیا جائے تو کئی باتیں بیک وقت ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ پہلے شعر میں دو اہم ترین اسلامی جنگوں کا بیان ہے، اسی حوالے سے شاعر نے جنگ کربلا کے عظیم سورما امام حسین کے خاندانی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ یہاں شجاعت علی اور خیبر وحنین کی معرکہ آرائی کے پس منظر میں حق و باطل کے چہرے سے نقاب الٹی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ حق ہمیشہ ہی سے اس قبیلہ کے ساتھ رہا 'سوئے نجف' دروازوں کا کھلنا اسی جانب ایک ہلکا سا اشارہ ہے۔ دوسرے شعر میں امام مظلوم کی تنہائی اور بے بسی کا بیان ہے جبکہ آخری شعر فوج اشقیا کے ذریعے نہر پر جبراً قبضہ کر لینے اور اس پر پہرہ بٹھا دینے کی جانب اشارہ ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے اگر شجاعت کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے تو اس سے مراد جنگ خیبر وحنین میں حضرت علی کی شجاعت کا، بعینہٖ میدان کربلا میں ان کے جری بیٹے جناب عباس کی شجاعت تاریخ کا ایک اہم باب ہے، اسی طرح کربلا، دریا، پہرہ، پیاس، صحرا وغیرہ الفاظ ایسے استعارات ہیں جو واقعہ کربلا سے منسلک ہیں کہ ان کے بغیر کوئی 'کربل کتھا' لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

اسلامی تاریخ میں جنگ کربلا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو ہر زمانے میں شعرا نے اپنے اپنے طور پر استعمال کیا ہے، انھوں نے کبھی اسے استعارۃً استعمال کیا تو کبھی علامت کے طور پر برتا، کبھی اس سے پیکر تراشی کا عمل انجام دیا گیا تو کبھی مظلوم کی حمایت کی گئی، کبھی اس کے سہارے ظلم کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشا گیا تو کبھی اس کے ذریعے امن و آشتی کا پیغام عام کرنے کی سعی کی گئی۔ ظاہر ہے اس سے ان شعرا کے اشعار میں نہ صرف یک گونہ حسن آتا چلا گیا بلکہ اس کی لطافت وشیرینی میں بھی افزونی آتی گئی اور آج ان کی قدر وقیمت ادبی شہ پاروں کے طور پر ہو رہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میری نظر میں اس کی ایک بڑی وجہ ذکر مظلوم بھی ہے، یہ ان معنوں میں اہم ہے کہ ایسا سب کے مقدر میں نہیں ہوتا بلکہ ایسا کرنے والے اپنی خلقت کے ساتھ منتخب ہوا کرتے ہیں بلکہ اسے خالق بالارادہ خلق کرتا ہے۔ صدیق مجیبی ان ہی مخلوقات عالم میں سے ایک تھے۔ جب ہی تو انھوں اس قسم کے اشعار موزوں کیے:

جهاں تک صدیق مجیبی کی شخصیت اورشاعری کا سوال هے ان کی افتاد طبع اس بات کا ثبوت بهم پهنچاتی هے که وه ان منفی عناصر سے همیشه پاک رهے هیں اور انهوں نے حق گوئی و بیباکی کو تا دم مرگ اپنا شعار بنائے رکها، وه باطل کو یکلخت مسترد کرنے سے کبهی نهیں چوکے که اسی میں ان کی شاعرانه عظمت بهی پوشیده هے۔ اگر میں یه کهوں که ان کی شعری کائنات میں ذکر کربلا اور استعارات کربلا اسی کا شاخسانه هیں تو بے جانه هو گا۔

مقتل نہ بے چراغ رہے میرے بعد قتل
چہرے پہ اتنی خوں کی رمق چاہتا ہوں میں
اے شہر کم سواد تری آن کے لیے
دامن کو چاک سینے کو شق چاہتا ہوں میں
اک مدرسہ تھا کربلا امّت کے واسطے
بھولے ہوئے سبق سے سبق چاہتا ہوں میں
تائید حق میں سرخ ہو پھر خاک کربلا
پھر سے لہولہان شفق چاہتا ہوں میں

یہ اشعار صدیق مجیبی کی ایک ہی غزل سے لیے گئے ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انھوں نے کلاسیکی شعرا کا نہایت باریک بینی سے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ اسے انگیز بھی کیا تھا۔ ان چند اشعار کے ضمن میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ مستعار لیے ہوئے استعارے اور چندے کے طور پر جمع کی ہوئی علامتوں کے بل بوتے پر شاعری نہیں کرتے بلکہ وہ لفظ کو استعارہ، علامت اور پیکر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ ان کے فن کا کمال ہی ہے کہ وہ گھسے پٹے الفاظ میں ایک جہان معانی پوشیدہ رکھ چھوڑتے ہیں۔ دیکھیں یہ اشعار جو اس صداقت پر مہر ثبات ثبت کرتے ہیں کہ ان کا یہ فن اپنی منتہا کو پہنچ کر ہی دم لیتا ہے:

لرز کے پھینک دی قاتل نے ہاتھ سے تلوار
اٹھائے کون انی پہ زمیں سے سر میرا
اپنا سر کاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا

یہاں 'تلوار' اور 'انی' یا 'نیزہ' صرف الفاظ کے طور پر نہیں استعمال ہوئے ہیں بلکہ ان میں تلمیحاتی عناصر اور استعاراتی شان سبھی کچھ سمو دی گئیں ہیں کچھ اس انداز سے کہ واقعہ کربلا اور قتل حسین آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شمر بن ذی الجوشن کو اس کی تمام سفاکیوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ چہ جائیکہ دوسرے شعر کو شاعر کی 'انا' پر ہی محمول کیا جانا چاہیے لیکن یہاں بھی کربلائی استعارہ اپنے عروج پر ہے، جس میں بعد قتل حسین ان کا سر مبارک نوک نیزہ پر سجایا گیا تھا، اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے شاعر نے اپنی سربلندی وسرفرازی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ یزید وقت نے بظاہر تو اس کریہہ ترین فعل سے جشن کی کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کی تھی لیکن اسی میں اس کی شکست بھی مضمر تھی کہ تاریخ نے اس کی اس نازیبا حرکت کو بھی نفرت اور ملامت کے طور پر ہی پیش کیا۔ اور سر حسین نے بلند رہ کر یہ بات ثابت کر دی کہ سربلندی وسرفرازی شہید ابن شہید کی ہی وراثت ہے۔ اسی لیے تو کسی شاعر نے بلند لہجے میں ایک سچی بات یوں کہی تھی کہ:

تمھیں ہے سر کی ضرورت ہمیں شہادت کی
تم اپنا کام سنبھالو ہم اپنا کام کریں

تاریخ عالم جنگ کربلا کے نتائج چاہے جیسے بھی پیش کرے، سر حسین نے تو نوک نیزہ پر بلند ہو کر اپنا پیغام عام کر ہی دیا کہ فاتح کون تھا۔ بقول عرفان صدیقی:

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

اسی پیش منظر اور پس منظر میں تین اشعار اور ملاحظہ فرمائیں جو نہ صرف صدیق مجیبی کی شاعرانہ انفرادیت کا لوہا منوانے میں اہم کردار ادا کریں گے بلکہ کربلائی شاعری کے حوالے سے ان کی شعری کائنات کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کرائیں گے اور دعوت غور وفکر بھی دیں گے۔ پہلے شعر میں

جناب قاسم اور جناب علی اکبر کی شہادت پیش نظر رہے، دوسرے شعر میں کربلا میں جاں بلب بچے خصوصاً جناب علی اصغر اور سکینہ کے تصور کے ساتھ قرأۃ شعر کی جائے اور آخری شعر میں قاتل حسین کو اس کی تمام سفاکیوں کے ساتھ نظر میں رکھا جائے، جس نے کہا تھا کہ وقت قتل حسین اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی محمد مصطفیٰ کا چہرہ سامنے آجاتا تو کبھی علی مرتضیٰ کا لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ اشعار غزل کے اشعار ہیں تبھی ہم شاعر کی فنکاری سے لطف اندوز ہوسکیں گے:

جس طرح سے پامال ہوئے چاند سے چہرے
یوں روند کے لاشوں کو قضا بھی نہیں چلتی
کبھی صحرا میں بھی بارش کی ارزانی ہوئی ہوگی
سلگتی ریت مارے شرم کے پانی ہوئی ہوگی
قاتل ترے ہاتھوں میں جو لرزش ہے وہ تو ہے
ہر خوف مرے خوں کی روانی سے الگ ہے

ان اشعار کے حوالے سے ان کی شعری کائنات میں داخل ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن ان کی بے باکی اور حق کی طرفداری کی وجہ سے نمو پا سکا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی مصلحت کوشی، تصنع اور ریاکاری سے کوسوں دور رہے اور انھوں نے روشن ضمیری اور اصولوں پر جان کی بازی لگادینے کو ترجیح دی۔ مجیبی کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان افکار کو کافی اہمیت دیتے ہیں جو کہ انسانیت کی بقا کے ضامن ہوں۔ مجھے ان کی شاعری میں ظلم، جبر واستبداد کے خلاف اعلان بغاوت تو نظر آتا ہی ہے، ایک چیلنج بھی دکھائی دیتا ہے جو کہ ایک حساس شخص کا فرض اولین ہے، ورنہ وہ اس قدر بے باکی کا اظہار نہ کرتے کہ:

ان کوفیوں کے بیچ مجیبی کٹی اک عمر
اک پل بھی جن کے ساتھ گذارا نہ جائے گا

ادب غور وفکر کا نام ہو نہ ہو اسے وفور جذبات کا کرشمہ تو کہا ہی جائے گا کہ اس کے بغیر کوئی کھرا اور سچا شہ پارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ آیئے چند اشعار کے حوالے سے یہ پتہ لگایا جائے کہ کیا مجیبی کے یہاں بھی یہ مظاہر کارفرما ہیں، نیز یہ بھی کہ اردو ادب میں استعاروں پر مبنی کائنات شعر میں انھوں نے کس قدر فن کاری کا جوہر پیش کیا ہے:

مری جانب سلگتی ریت تھی پیاسوں کے لاشے تھے
جدھر دشمن تھے خیمہ زن ادھر دریا نکل آیا
ترے رونے سے اے ابر سیہ اب فائدہ کیا ہے
قیامت تک رہے گی پیاس دامن گیر پانی کی

ان اشعار میں کہیں بھی لفظ کربلا یا شہید کربلا امام حسین یا ان کے اصحاب کے نام درج نہیں ہیں لیکن شاعر نے 'دریا' کا لفظ اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ ہمارا ذہن فوراً حادثہ کربلا کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور نہر 'فرات' موجیں مارتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ یہاں 'سلگتی ریت' 'پیاسوں کے لاشے' 'دشمن کا خیمہ زن ہونا' ہمارے ذہن پر کربلا کا نقشہ ابھارتا ہے۔ چہ جائیکہ اس شعر میں 'دریا نکل آیا' جو کہ محاورۃً استعمال ہوا ہے پہلی نظر میں قابل قبول نہیں۔ کیونکہ تاریخی شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دریا تو موجود تھا ہی اس پر قابض ہونے کے لیے دشمن نکل آئے، اور جبراً خیمہ حسینی ہٹا کر خود خیمہ زن ہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اس بات میں یک

ادب غور وفکر کا نام ہو نہ ہو اسے وفور جذبات کا کرشمہ تو کہا ہی جائے گا کہ اس کے بغیر کوئی کھرا اور سچا شہ پارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ آیئے چند اشعار کے حوالے سے یہ پتہ لگایا جائے کہ کیا مجیبی کے یہاں بھی یہ مظاہر کارفرما ہیں، نیز یہ بھی کہ اردو ادب میں استعاروں پر مبنی کائنات شعر میں انھوں نے کس قدر فن کاری کا جوہر پیش کیا ہے:

گونہ طنز کی صورت پیدا کی ہے کہ جدھر پیاس تھی، سلگتی ریت تھی دریا اس طرف نہیں تھا کہ یہ دریا کی بدقسمتی تھی۔ بہرحال یہ شعر رثائی ادب یعنی کسی مرثیہ کا شعر نہیں کہ اس میں تاریخی صداقت کا بھی خیال رکھا جائے کہ فوج یزید نے خیمہ حسینی ہٹانے کی کارروائی کی تھی کہ نہر فرات پر اسی سے بلوے کا سماں تھا، اسے خالصتاً غزل کا شعر ہی کہا جانا چاہیے لیکن اس میں جو رمز پوشیدہ ہے اسے واقعہ کربلا کے پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں انھوں نے اپنے طور پر مختلف استعارات کو منفرد انداز میں برتتے ہوئے واقعہ کربلا کے اس بے رحم، وحشی اور سفاک چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کا مقصد اپنے زریں ماضی کی بازیافت تو ہے ہی شاید اپنے ایمان کی تازگی کا احساس کرانا بھی ہے۔

مندرجہ بالا اشعار میں واقعہ کربلا کا کوئی ذکر نہیں لیکن کرب وبلا کا سیل رواں ضرور ہے جو ہمارا ذہن اسی واقعہ کی طرف منعطف کراتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان اشعار کا مرکز ومحور کربلا ہے۔ یہ بھی اشعار صدیق صاحب کی کائنات شعر میں شاید زیادہ توانا اس لیے بھی ہیں کہ ان میں کیفیات کربلا موجود ہے اور اسے شاعر نے ہر عہد کا ترجمان بنا کر پیش کیا ہے۔ کیونکہ سرزمین کربلا پر تو صرف ایک بار یہ واقعہ رونما ہوا تھا وہاں صرف ایک یزید وقت تھا لیکن اب تو نہ جانے کتنی کربلائیں ہمارے سامنے ہیں اور انسانوں کی شکل میں نہ جانے کتنے یزید سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان اشعار میں صدیق مجیبی نے جو تخلیقی رویہ اختیار کیا ہے، اسے ان کے نوعیت فن اور اس کی باریکیوں سے عبارت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی قبیل کا آخری شعر نذر قرأۃ ہے کہ اس میں نہ تاریخ انسانیت بہ زبان بے زبانی بولتی ہوئی نظر آئے گی بلکہ یہ بھی کہ اسی درسگاہ نے ہمیں سب سے پہلے مساوات کا سبق سکھایا تھا، نابرابری کو یکسر مسترد کیا تھا:

شرافت کی سند اعلیٰ نسب شجرہ نہیں ہوتا
کوئی لمحہ کسی کو صاحب کردار کرتا ہے

پہلے اس شعر کے غزلیہ پہلو پر غور کیا جائے کہ اس میں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ اگر اسے موجودہ عہد پر منطبق کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ شاعر نے یہاں قوم قبیلہ، حسب ونسب کی تمام سرحدیں ٹوٹنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم پر یہ باور کرایا ہے آج کوئی بھی شخص کوئی بھی اعلیٰ مقام پا لینے کا مستحق ہے، بس اسے صاحب کردار ہونا چاہیے۔ اب اسی شعر کا موضوع کی مناسبت سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں صرف ایک لفظ 'لمحہ' نے شعر کو کربلائی شاعری کا رخ عطا کر دیا یہاں 'صاحب کردار' کرنا بھی اہم ہے جس سے ہمارا ذہن واقعہ کربلا کے دو اہم ترین کرداروں شہید اول جناب حر ابن ریاحی اور جون حبشی کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ پہلے اس عظیم ترین لمحہ کا بیان جس میں حر نے فوج یزید سے بغاوت کی تھی اور در حسین پر سر نیاز خم کر دیا تھا۔ یہاں 'اعلیٰ نسب شجرہ' بھی سرزمین کربلا کے ایک اہم کردار جون حبشی کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ انسانی شرافت رنگ ونسل یا قوم وقبیلہ میں نہیں ہوتی اگر ایسا ہوتا تو واقعہ کربلا میں جون حبشی جیسے غلام کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا خون، سرزمین کربلا میں خون حسین کے ساتھ مل جاتا۔ چہ جائیکہ اس شعر کا واقعہ کربلا سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن غزل کی ایمائیت کا کمال دیکھیے کہ اس ایک شعر میں کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صدیق مجیبی نے استعارات کربلا اور متعلقات کربلا سے جس قدر استفادہ کیا ہے، ان کے شعروں میں اسی قدر تہہ داری، معنویت اور رمزیت پیدا ہوتی چلی گئی ہے تو کیا اسے استعارات کربلا کا اعجاز نہ کہا جائے۔

■

Dr. Hasan Musanna, Ex-H.O.D. Dept of Urdu Ranchi College (R.U), G-2 Madhumati Apartment, Joda Talab Road, Bariatu, Ranchi, Jharkhand - 834009 (Jharkhand)

تبصرہ و تعارف

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی
صفحات: 410، قیمت: 129 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: حقانی القاسمی، ڈی 64 فلیٹ نمبر
10 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 110025

تحریکیں وقت کی پیداوار اور ضرورت ہوتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک بھی وقت اور حالات کی پیداوار ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا ایک وسیلہ بن گئی۔"

انسانی زندگی اور اجتماعیت کے تمام مسائل پر اس تحریک نے سنجیدگی سے سوچا مگر بعد میں دوسری تحریکوں کی طرح یہ بھی افراط و تفریط کی شکار ہوگئی، کچھ ادعائیت اور شدت پسندی بھی آگئی اس لیے کچھ لوگ اس سے منحرف بھی ہوتے گئے اور ردعمل کے طور پر دوسری تحریکیں وجود میں آتی گئیں مگر کوئی بھی تحریک اس کا نعم البدل نہیں بن سکی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اسی تحریک کا معروضی مطالعہ 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ یہ دراصل ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جو 1957 میں تحریر کیا گیا تھا اور ان کے نگراں شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس مقالے کے موضوع اور اسلوب کی خاص طور پر ستائش کی تھی۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں ترقی پسند تحریک کے آغاز، اثرات اور ارتقا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ 1935 میں لندن کے نان کنگ ریستوراں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر نے indian progressive writers association کے نام سے جس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کا مینی فسٹو تیار کیا تھا اس کا دائرہ ہندوستان کے مختلف شہروں الہ آباد، علی گڑھ، حیدرآباد، امرتسر پنجاب تک پھیلتا گیا اور منشی پریم چند، مولانا حسرت موہانی اور رابندر ناتھ ٹیگور، مولوی عبدالحق بھی اس تحریک کے مقاصد سے متاثر ہوئے۔ اس کے اعلان نامے کی حمایت کی اور اس کی کانفرنسوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ پریم چند نے تو اپنے مجلّہ 'ہنس' میں اس کی حمایت میں اداریہ تک لکھا اور اسے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان تمام کانفرنسوں الہ آباد، کلکتہ، دہلی، لکھنو اور بھیمڑی ممبئی کے اعلانیوں اور قراردادوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن پر کانفرنسوں میں بحثیں ہوئیں۔ حالات کے تحت ترقی پسند ادیبوں کے منشور میں جو تبدیلیاں آئیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ حصہ دوم ترقی پسند ادبی سرمایے کے جائزے پر محیط ہے۔ اس کے تحت شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، طنز و مزاح، تراجم، رپورتاژ، ڈائری، مکاتیب کے میدان میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس باب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اصناف ادب میں ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے ایسے اذہان تھے جن کی وجہ سے ان اصناف کو نہ صرف نئی وسعتیں ملیں بلکہ انہیں نئے خد و خال، افکار و موضوعات بھی ملے۔ شاعری میں فراق، فیض، مجاز، مخدوم، مجروح، سردار، ساحر، کیفی، اختر الایمان اور افسانہ میں بیدی، عصمت، منٹو، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیارتھی۔ کیا کوئی بھی ادبی تاریخ ان ناموں کی عظمت سے انکار کرسکتی ہے۔ تیسرا حصہ ترقی پسند تنقید سے متعلق ہے۔ یہ دیگر ابواب کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ ترقی پسند ادبی تصورات کے گہرے اثرات ادب پر پڑے ہیں اور ان تصورات کی موجودہ عہد میں بھی معنویت اور افادیت کم نہیں ہوئی ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند ناقدین کے فکری تضادات کو بھی واضح کیا ہے۔ جن تنقید نگاروں کے انداز نقد کا قدرے تفصیلی محاکمہ کیا ہے ان میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، عزیز احمد، ممتاز حسین اور سردار جعفری کے نام شامل ہیں۔

ترقی پسند ادبی تحریک پر وسیع المطالعہ اور باخبر ناقد خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کی یہ کتاب حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مشمولات سے اختلاف ممکن ہے مگر کتاب کے معروضات کو مکمل طور پر مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ترقی پسند تحریک کے تمام تر تناظرات کا احاطہ اس کتاب میں کیا گیا ہے اور مصنف کے بقول معروضی اور تحقیقی طریق کار اختیار کیا گیا ہے اور اہم تحریروں اور دستاویزات کی روشنی میں نتائج کا استخراج کیا گیا ہے۔"

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اس اہم کتاب کی دوبارہ اشاعت کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے اور پرانی کتابوں کا یہ اشاعتی سلسلہ مستحسن قدم ہے مگر اس کے ساتھ اگر متعلقہ کتاب میں پرانے مصنفین کے سوانحی کوائف یا تعارفی نوعیت کے مضمون کی شمولیت ہو جائے تو یہ نئی نسل کے حق میں ایک مفید عمل ہوگا۔ مصنفین سے ذہنی مناسبت قائم کرنے میں طلبا اور اساتذہ دونوں کو آسانی ہوگی۔

کلیات ملّا رموزی (جلد اول، حصہ اول و دوم)

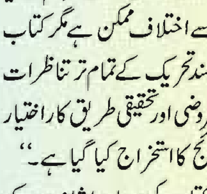

مرتب: پروفیسر خالد محمود
صفحات: 896، قیمت: 291، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ثوبان سعید ایسوسی ایٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی لکھنؤ

ملّا رموزی بیسویں صدی کے ایک اہم طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا نام محمد رشاد تھا اور 1896 میں بھوپال کے ایک معزز گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان کی شناخت ایک کالم نویس اور صاحب طرز انشاپرداز کے طور پر قائم ہوئی۔ 1917 سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور ان کے کالم اس وقت کے بہترین

اخبارات اخوت، حقیقت، خلافت، مدینہ، الجمعیۃ اور زمیندار میں مستقل شائع ہوتے رہتے تھے۔اسی طرح ملاپ، تیج اور پارس کے صفحات پر بھی ان کے کالم اور مضامین بہت اہتمام سے جگہ پاتے تھے۔زیرِتبصرہ کتاب انھی کے کلیات کی پہلی جلد ہے۔

کتاب کے مرتب پروفیسر خالد محمود ہیں۔سفرناموں پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ وہ خود طنز ومزاح کے تخلیق کار ہیں اور اس فن کے مختلف ابعاد سے واقف ہیں۔ان کے لفظوں میں ''ملاّ رموزی کا کلیات جو تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے...اس کلیات میں پانچ جلدیں ہیں۔'' جلد اول کو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے اور اس میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جو 'گلابی اردو' کے مضامین اور 'عورت ذات' کے عنوان سے قلم بند کی گئی تھیں، اس اعتراف کے ساتھ کہ ''ان کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کا دعوا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کلیات میں ان کی وہ تمام تخلیقات جن تک رسائی ممکن ہوسکی، یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ہمیں اپنی نارسائی کا احساس ہے۔''

کلیات کا حصہٴ اول گلابی اردو کی طرز خاص میں لکھی گئی مختلف تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں نہ صرف موضوعات کا رنگ جداگانہ ہے بلکہ ان کی پیش کش کا اسلوب بھی نرالا ہے۔ یہ وہی گلابی اردو والا اسلوب ہے جس کے لیے ملاّ رموزی خاص شہرت رکھتے تھے اور کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں تھا۔''گلابی اردو دراصل طرزِ قدیم میں عربی زبان کی قدیم کتب خصوصاً آسمانی صحیفوں کے لفظی اردو ترجموں کی پیروڈی ہے۔''پس جاننا چاہیے کہ رکھتے ہیں تعلق مضامین اس حصے کے موضوعاتِ سیاسی کے بیشتر۔ پہنچاتے ہیں اطلاع بہم جو بارے میں ملاّ رموزی کے کہ رکھتے تھے وہ کیسی نظر گہری بارے میں حالاتِ عالمی کے۔ پھیلا ہوا ہے دائرہ موضوعات کے ان کا تک سیاست، مذہب، عالمی سیاست، کانگریس و مسلم لیگ، عبادات، سیاسی واقعات، بین الاقوامیت، ہندو مسلم اتفاق۔اور وہ کرتے ہیں تبصرہ پر سب موضوعات رنگ میں اپنے کے۔ تحقیق کہ استعمال کرتے تھے وہ عنوانات کے لیے رنگوں مختلف کا نیچ اپنے مضامین کے۔اس حصے کے بیشتر مضامین سیاسی نوعیت کے ہیں جو ملاّ رموزی کی سیاسی بصیرت کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ان مضامین میں ملاّ رموزی کا اصلاحی نقطہٴ نظر غالب رجحان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ان کی انشا پردازی کے اس طرز سے شاید وہ لوگ کم محظوظ ہوسکیں جو قدیم عربی فارسی تخلیقات اور ان کے ترجموں کے اسلوب سے آشنا نہ ہوں گے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں 'عورت ذات' سے متعلق تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔اس کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے کیوں کہ ملاّ رموزی نے 1922 میں گلابی اردو چھوڑ کر سادہ تحریر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ دونوں حصے دو مختلف رویوں کی نشان دہی کرتے ہیں یعنی پہلے حصے کے بیشتر مضامین سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔دوسرے حصے میں مختلف ممالک اور مختلف طبقات کی عورتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، چند عناوین سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ''دوسری قوموں کی بیوی، ایشیا کی بیوی، بیوہ بیوی، مہاجن بیوی، تمبولی کی بیوی، حلوائی کی بیوی، مالی کی بیوی وغیرہ'' اس فہرست میں بھٹیارے، دھوبی، بھنگی، تیلی، جلاہے، چمار، رنڈی، مشاطہ، عالم، فاضل، گداگر بیویوں کا اضافہ کر لیجیے۔ غیر مطبوعہ تحریروں میں بھی ایسی ہی بیویوں کا ذکر ہے مثلاً نرس، بنجارہ، دایہ، استانی، ڈومنی، ڈاکٹر اور رضا کار بیویاں بھی اپنے تہذیبی مظاہر کے ساتھ جلوہ فروشیاں کرتی نظر آرہی ہیں۔اس طرح سے یہ حصہ تہذیبی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اس پیش کش سے ملاّ رموزی کی باریک بینی، ژرف نگاہی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جزئیات نگاری کے فن سے کس قدر آشنا تھے، اور مختلف طبقات کی سماجی اور تہذیبی زندگی اور نفسیات پر ان کی نگاہ کتنی گہری ہے۔

کتاب کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔اس میں ملاّ رموزی کے حالاتِ زندگی، تصانیف، ادبی خدمات اور ان کے ادبی مرتبے کا تعین مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے، اور پس منظر کے طور پر شہر بھوپال کے علمی ماحول، شاعرانہ اور تہذیبی فضا کے نقوش کو ابھارا ہے۔ عام طور سے ملاّ رموزی کے بارے میں علمی مواد آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا، یہ مقدمہ بڑی حد تک اس کمی کو پورا کرتا ہے لیکن تدوین کے اصولوں اور طریقہٴ کار کی عدمِ وضاحت ایک قسم کی تشنگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔کونسل نے یہ کتاب شائع کر کے ماضی میں خاص شہرت اور شناخت کی حامل گلابی اردو کو محفوظ کرنے اور اس کے نمونوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

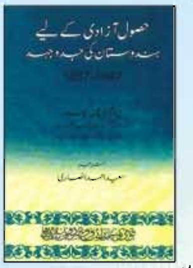

حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد (1857-1947)

مصنف: پروفیسر بپن چندر، مترجم: سعید احمد انصاری

صفحات: 716 قیمت: 234 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 110025

مبصر: ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی N/139-B قادری مسجد گلی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

تحریک آزادیٴ ہند پروفیسر بپن چندر اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے لکھی گئی شہرہٴ آفاق کتاب "Struggle for India's Independance" کا اردو ترجمہ سعید انصاری نے کیا ہے۔

'حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد' مصنف اور اس کے ساتھیوں وشاگردوں کے ذریعے بنائے گئے فریم ورک ومنصوبہ کے تحت قومی تحریک پر لکھی گئی ہے۔ جس پر اب بھی تحقیقی مطالعے کا سلسلہ جاری ہے۔اس کے لکھنے میں مصنف نے شائع اور غیر شائع شدہ رسالوں، محافظ خانوں سے حاصل دستاویزوں، ذاتی کاغذوں اور اخباروں کا پورا پورا استعمال کیا ہے۔اس میں بپن چندر کی معلومات کی بنیاد ان 1500 سے زائد مجاہدین آزادی سے قلم بند بات چیت بھی ہے جنھوں نے 1918 سے اس تحریک میں حصہ لیا تھا۔لیکن اس مواد کا استعمال محدود دائرہ میں کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں مصنف نے اپنے کو انھیں حوالوں تک محدود رکھا ہے جو اچھی لائبریریوں میں آسانی سے دستیاب ہیں۔

بنیادی طور پر اس کتاب کے لکھنے کا مقصد مارکسی روایات کے تحت رہ کر مندرجہ ذیل نقطوں کا پتہ لگانا تھا۔ جیسے کالونیائی بھارت میں تضاد کی شکل، بنیادی اور ثانوی تضاد کا آپسی تعلق، انڈین نیشنل کانگریس اور اس کی قیادت یعنی قیادت کا طبقہ اور پارٹی سے رشتہ، تحریک کی مختلف شکلیں (اس میں اہنسائی شکل بھی شامل ہے) اور طبقاتی کردار، نظریہ، حکمت عملی اور تحریک کا عوامی کردار وغیرہ کو ایسے ڈھانچے میں رکھ کر جانچا گیا ہے جو 'رجنی پام دت اور اے۔آر دیسائی' مع دوسرے موجودہ قدیم مارکسی نظریہ سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔

اس کتاب میں مختلف تحریکوں کے تعلق سے بحث کی گئی ہے مثلاً کانگریس کے وجود کے پہلے کسان اور قبائلی تحریکیں، 1920 میں اکای اور مندر رفارم تحریکیں، پریس اور قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعے چلائی گئی تحریکیں، کسانوں اور مزدوروں کی کاوشیں، کانگریس کے اندر اور باہر بائیں بازو (Leftists) کا ابھار، صوبائی عوام کی تحریکیں، سرمایہ داروں کی سیاست، انڈین نیشنل آرمی (I.N.A.) اور رائل انڈین نیوی (RIN) کی بغاوت وغیرہ۔

عوامی تحریک کی حیثیت سے ہندوستانی تحریک نے بے شمار لوگوں کی مختلف قابلیت، صلاحیت اور قوت کا استعمال کیا۔ اس میں سب کے لیے جگہ تھی۔ضعیف، نوجوان، امیر وغریب، عورت ومرد، عاقل وجاہل سبھی اس میں شامل تھے۔لوگوں نے کئی طرح سے اس میں حصہ لیا تھا، مثلاً جیل جانا، ستیہ گرہ کرنا، دھرنا دینا، عوامی جلسوں میں شرکت کرنا، جلوسوں میں حصہ لینا، ہڑتال کرنا، راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہوکر کانگریس رضا کار جتھوں کی حوصلہ افزائی کرنا، کارپوریشن ضلع کمیٹیوں، صوبائی اور مرکزی انتخابات میں

کانگریس امیدوار کو ووٹ دینا، تعمیری کاموں میں حصہ لینا، کانگریس کو ایک چوّنی (پچیس پیسے) دے کر اس کا ممبر بننا، کھادی اور گاندھی ٹوپی پہننا، کانگریس کے فنڈ میں چندہ جمع کرنا اور کانگریسی تحریک میں حصہ لینے والے لوگوں کو کھانا کھلانا اور پناہ دینا، ینگ انڈیا (Young India) اور ہریجن پرچوں، پمفلٹوں اور رسالوں کو پڑھنا، حب الوطنی سے بھرے ڈرامے کھیلنا، نظمیں پڑھنا، جلسے کرنا، ناولیں، کہانیاں اور نظمیں لکھنا اور بھارت پھیریوں میں ان کو گانا وغیرہ گونا گوں طریقے تھے۔

عوامی تحریک بذات خود اور عوام کو متحرک کرنے کی اس کی کوششیں ہندوستانیوں کی بے پناہ قوت کا مظہر تھیں۔ اس کے ذریعے لوگوں نے اپنی جدت پسندی اور پہل کرنے کی صلاحیت کا پوری طرح اظہار کیا۔ اس تحریک میں بے مثل لیڈروں اور بے نظیر پیرووں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے ہزاروں شہید پیدا کیے۔ کتنے بہادر تھے وہ لوگ جنھوں نے سالہا سال انتھک محنت کی اپنے عزم پر صبر وسکون سے جمے رہے، گھر بار چھوڑا، روزی روٹی سے بے پروا ہوکر کے زمین وجائداد اور کاروبار گنوایا اور جن کے خاندان والوں کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی اور جن کے بچّے مناسب تعلیم اور حفظان صحت سے بھی محروم تھے۔

'حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد' قومی کونسل کے ذریعے شائع ہوئی بہترین کتابوں میں سے ہے۔ جس کا ترجمہ سعید انصاری نے بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے۔ انھوں نے ہر طبقے کی قربانیوں کو پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب قوم کے لیے ایک نایاب تحفہ کے مانند ہے۔ جس سے ملک کی آزادی کے سلسلے میں تاریخی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ امید ہے کہ موجودہ نسل کے ادیب اس سے بھرپور استفادہ کریں گے اور یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

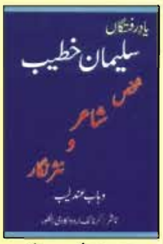

سلیمان خطیب: شخص، شاعر، و نثرنگار

مصنف : وہاب عندلیب

صفحات : 282، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر : کرناٹک اردو اکادمی بنگلور

مبصر : ڈاکٹر فرحین بیگم، گلبرگہ شریف

'وہاب عندلیب' کا نام اردو دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ ادب میں بحیثیت خاکہ نگار، محقق، ناقد ومبصر معروف ہیں۔ 'سلیمان خطیب-شخص، شاعر ونثر نگار' ان کی چوتھی تصنیف ہے جو کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کی جانب سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ سلیمان خطیب کی شخصیت، شاعری ونثر نگاری پر مبنی یہ کتاب کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے 'شروع کیے گئے 'یادرفتگاں' سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سرورق عنوان سے مزیّن سیدھا سادہ جاذب نظر ہے۔ بیک پیج پر سلیمان خطیب کی یادگار تصویر کے ساتھ ان ہی کے اشعار درج ہیں۔

مذکورہ کتاب دکنی کے سدابہار شاعر سلیمان خطیب کی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کا مکمل تجزیہ ہے۔ سلیمان خطیب کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں۔ سلیمان خطیب کو بحیثیت شاعر ہر خاص و عام شخص جانتا ہے لیکن سلیمان خطیب بحیثیت نثر نگار بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مذکورہ کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ پہلی بار سلیمان خطیب کی نثر نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب سلیمان خطیب کی شخصیت اور فن پر مبنی مضامین، خاکے، منظوم خراج تحسین، منظوم خراج عقیدت اور منتخب کلام اور مضامین پر مشتمل مکمل اور جامع ہے۔ سلیمان خطیب نے دکنی زبان میں عوامی شاعری کرتے ہوئے اس زبان کو معراج بخشی۔ اُن کی شاعری کے موضوعات زندگی کے عام معاشی اور گھریلو مسائل ہیں۔ ان کی نظموں کے بیشتر اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ اُن کی شخصیت وفن پر تحقیقی کام بھی ہو چکا ہے۔ اُن کے شاعرانہ فن کا تجزیہ کئی نقادوں نے کیا ہے لیکن اُن کی نثر نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے وہاب عندلیب کی یہ کاوش قابل تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے مرحوم دوست کو بحیثیت نثر نگار ادب میں ایک نئی پہچان کرانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

سلیمان خطیب کے واحد مجموعہ کلام 'کیوڑے کا بن' کا ترجمہ ملکی وغیر ملکی زبانوں جیسے انگریزی، روسی، کنڑی، ہندی اور تلگو میں ہو چکا ہے۔ کتاب میں شامل مواد کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ کتاب کا انتساب، عنوان کے تحت فہرست مشمولات، عرض ناشر کے بعد 'پیش گفت' کے تحت مصنف نے کتاب کی اشاعت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت سلیمان خطیب مرحوم کی شخصیت وفن مع منتخب کلام پیش ہے۔

پہلا عنوان 'حیات وشخصیت' ہے جس کے تحت سلیمان خطیب کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگلا عنوان 'سلیمان خطیب بحیثیت شاعر' کے تحت ممدوح کی شاعرانہ خصوصیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'منتخب کلام' کے تحت نبی خانہ ﷺ، نذرانہ عقیدت کو اوّلیت دی گئی ہے اس کے بعد مختلف ذیلی عناوین کے تحت منتخبہ نظمیں شامل کتاب ہیں۔ اگلا عنوان 'سلیمان خطیب بحیثیت نثر نگار' میں وہاب عندلیب نے ممدوح کی نثر نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت ذیلی عنوان 'منتخب مضامین' ہے جو سلیمان خطیب کے نثری نمونوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد بعنوان 'خاکے' سلیمان خطیب کی شخصیت پر ہم عصر ادیبوں کے تحریر کردہ چار خاکوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'منظوم خراج تحسین' میں شعرا نے سلیمان خطیب کی شخصیت اور فن کو خراج تحسین پیش کی ہے اور 'منظوم خراج عقیدت' میں مختلف شعرا نے سلیمان خطیب کی شخصیت وفن کو خراج عقیدت پیش کی ہے۔ اس کے بعد 'سلیمان خطیب ناقدین ومعاصرین کی نظر میں' کے تحت سلیمان خطیب کی شخصیت وفن پر ادبی وعلمی شخصیات کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ آخری عنوان 'سلیمان خطیب کی حاضر جوابی' کے تحت چند یادگار واقعات شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں 'دکنی الفاظ کی فرہنگ' اور مصنف کی کتابوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

مصنف نے سلیمان خطیب کی نثری تخلیقات میں اُن کے تحریر کردہ ڈراموں، افسانوں، مضامین، انشائیوں اور خطوط کو شامل کیا ہے۔ جو ممدوح کے اچھے نثر نگار ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ سلیمان خطیب کی شاعری کی طرح اُن کے مضامین بھی موقر رسائل میں جگہ پا چکے ہیں لیکن اُن کی تمام نثری تحریریں دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے مصنف نے دستیاب شدہ منتخبہ نثری نمونوں کو شامل کتاب کرتے ہوئے ممدوح کی نثر نگاری کا قدرے تفصیلی جائزے کے بعد بعنوان 'منتخب مضامین' سلیمان خطیب کے مضامین یادگار مشاعرے، کتاب پڑھنے کی تکنیک، آنکھیں، ماضی پر ایک نظر اور خیریت کو کتاب میں شامل کیا ہے۔

بہرحال 'سلیمان خطیب شخص شاعر ونثر نگار' اپنے مواد، ترتیب اور تزئین کے اعتبار سے مکمل اور جامع ہے۔ اس کے علاوہ سلیمان خطیب کو ادب میں بحیثیت نثر گار متعارف کرانے میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے کرناٹک اردو اکادمی اور خود مصنف کی سعی جمیلہ قابل تحسین ہے۔

نفرت کے دنوں میں

مصنف: مشرف عالم ذوقی

صفحات: 464، قیمت: 490 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد نظام الدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف دہلی 7

اردو ادب اور خصوصاً فکشن کی آبیاری اور اس کے گیسو سنوارنے میں جن تخلیق کاروں اور قلمکاروں نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے، ان میں ایک اہم اور معتبر نام مشرف عالم ذوقی کا ہے۔

زیرتبصرہ کتاب 'نفرت کے دنوں میں' ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ جو تحفے کے طور پر محبان اردو ادب اور قارئین کی نذر ہے۔ اس مجموعے میں کل 25 افسانے شامل ہیں۔ اصل واقعہ کی زیراکس کاپی، باپ اور بیٹا، دادا اور پوتا، انکیوبیٹر، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، فزکس، کیمسٹری، الجبرا، فریج میں عورت، بارش میں ایک لڑکی سے بات چیت، کاتیائن بہنیں، مرد، صدی کو الوداع کہتے ہوئے، مادام ایلیا کو جاننا ضروری نہیں، وارین ہسٹینگس، ڈراکیولا، لیبارٹری، بیٹی، امام بخاری کی نیپکن، بازار کی ایک رات، بھنور میں ایلس، غلام بخش، آپ اس شہر کا مذاق نہیں اڑا سکتے، بوڑھے جاگ سکتے ہیں، واپس لوٹتے ہوئے، نفرت کے دنوں میں اور شاہی گلدان۔ یہ وہ افسانے ہیں جو اپنے نام اور موضوع کے اعتبار سے بالکل انوکھے اور اچھوتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کے افسانے موجودہ دور کے تمام مسائل اور معاشرتی نشیب و فراز کے عکاس اور آئینہ دار ہیں۔ گویا ذوقی صاحب نے افسانے کی روایتی بھول بھلیاں سے نکل کر معمولی مگر اہم موضوعات کو ضبط تحریر میں لانے اور قاری تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور یہی وہ جرأت مندانہ قدم اور افسانہ کی فنی سلیقگی ہے جس نے انھیں شہرت عوام اور بقائے دوام بنا دیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے 'نفرت کے دنوں میں' میں قومی اور بین الاقوامی سلگتے ہوئے مسائل، ہندو پاک کے درمیان کبھی کبھی باہمی کشیدگی، غربت، افلاس، لوٹ مار، قتل و غارت اور آئے دن ہونے والے فسادات کے علاوہ صنعتی اور مشینی معاشرے میں انسان کے اس المیے کو موضوع بنایا ہے جو اس کی داخلی شخصیت کی اضطرابی کیفیت، تہذیب و تمدن کی پامالی، اخلاق و اقدار کا زوال، اور ہر لمحہ غیر یقینی کے ماحول میں جینے کی مجبوری کے اذیت آمیز اس کے ردعمل میں نمایاں ہوا ہے۔ معاشرتی گراوٹ نے ایک ایسی دہشت انگیز فضا پیدا کردی ہے کہ انسان خود اپنی شناخت کھو چکا ہے، کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ اگر اس افسانوی مجموعے کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ مجموعہ دور حاضر کی آپ بیتی ہے۔

ذوقی کے افسانوی مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ افسانے کے روایتی تصور میں محصور نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ اپنے عہد کے تجربات اور مشاہدات کو افسانوں کا اصل رنگ و روپ دینے کے لیے انھوں نے اپنی تخلیقی بصیرت کی رہنمائی اختیار کی ہے، جو کچھ بھی ان کے دل و دماغ میں کھٹکتا ہے۔ اسے افسانوی روپ دینے کی سعی کی ہے۔

مجموعے میں شامل تمام افسانے اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ افسانہ نگار ایک حساس اور غیر معمولی ذہن کا مالک ہے — تبھی اس نے حیرت انگیز اور دردناک موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور یہی موضوعات ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ اٹھو دنیا کے انسانوں کو جگا دو اور نئی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کرو تاکہ صحت مند معاشرے کی تعمیر اور تشکیل ہو سکے۔

افسانوی مجموعہ 'نفرت کے دنوں میں' کا اسلوب اور بیان کی دلکشی نے قارئین کی نظر اپنی طرف کھینچ لی ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کے باذوق حضرات اور سنجیدہ قارئین ان افسانوں کو دلجمعی سے پڑھیں گے اور مصنف کو داد و تحسین سے نوازیں گے۔

ادبی تحریکات ورجحانات (جلد اول)

مرتب: انور پاشا

صفحات: 734، قیمت: 376 روپے، سنہ اشاعت 2014

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، لودھی روڈ، نئی دہلی 3

کسی بھی زبان کی ادبی تخلیقات کی ترویج و اشاعت میں ادبی تحریکات و رجحانات کا بڑا حصہ رہا ہے۔ چنانچہ زیر نظر مضامین کا مجموعہ 'ادبی تحریکات و رجحانات' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، جس کے مرتب اردو کے معروف نقاد اور دانشور پروفیسر انور پاشا ہیں۔ تحریکات و رجحانات سے متعلق بعض اہم اور نایاب مضامین کو کتابی شکل دینے کا مقصد یہ ہے کہ عام اردو قاری، طلبا اور اسکالرز کو ایک جگہ تمام مضامین مل جائیں اور انھیں تحریکات و رجحانات سے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

کتاب دو جلدوں میں منقسم ہے۔ جلد اول 734 صفحات اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مرتب نے انھیں تحریکات و رجحانات کو شامل کیا ہے، جس نے ادب سازی میں عالمی و مقامی ہر سطح پر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

انور پاشا نے کتاب کے پہلے باب میں سانت بیو، ٹی ایس ایلیٹ، امین الرحمٰن، انور سدید اور ظہور الدین کے مضامین شامل کیے ہیں تاکہ ان نقادوں کی دانشورانہ تحریروں سے کلاسیک اور کلاسیکی تحریک کی نئی گزرگاہیں منکشف ہوسکیں۔ دوسرا باب 'رومانویت' ہے جس میں محمد حسن، ریاض الحسن، یونس حسنی، انور سدید اور ظہور الدین کے مضامین ہیں جنھوں نے اپنے اپنے طور پر رومانویت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حسن نے اپنے مقالہ میں رومانوی تحریک کی روایت، مزاج اور اردو میں رومانوی طرز نگارش کا اعلیٰ تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں رومانوی تحریک کو مغربی تحریک کی دین سے انکار کیا ہے۔ اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ رومانویت سے اردو ادب کو کس حد تک فائدہ اور نقصان پہنچا۔ انور سدید نے اردو میں رومانوی تحریک کی ابتدا علی گڑھ تحریک سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے چند ایسے نثر نگاروں اور شاعروں کے یہاں رومانوی تحریک کی کھوج کی ہے جنھوں نے رومانویت کے مختلف زاویے اپنی تخلیقات میں پیش کیے۔ یونس حسنی نے یوروپ میں رومانیت کا آغاز اور اس کے تصورات اور انسلاکات کا جائزہ لیا ہے۔ ریاض الحسن کا مضمون 'مغرب میں رومانی تحریک' ہے۔ ظہور الدین نے مضمون 'رومانویت' میں رومانی تحریک کے آغاز اور اس کے فروغ کا جائزہ لیا ہے۔ رومانیت کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رومانی اور کلاسیکی ادیبوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ چونکہ رومانوی تحریک کلاسیکیت کے خلاف ایک ردعمل قرار دیا جاتا ہے لہٰذا اردو کے جن شاعروں اور ادیبوں نے اس خیال کو اپنی تخلیقات میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے، ایسے بعض شاعروں کے اشعار کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب 'علی گڑھ تحریک' کے تحت چار مضامین کتاب میں شامل ہیں۔ علی گڑھ تحریک کیا ہے؟ اسے ہم سرسید اور ان کے رفقا کے گوناگوں خیالات کا ایک مجموعہ کہہ سکتے ہیں، جس کی بنیاد پر اس تحریک نے عصری معاشرے پر انقلابی اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس باب میں علی گڑھ تحریک کا پس منظر، سرسید کی فکری بنیادیں، ان کی تعلیمی، علمی اور ادبی خدمات، قومی، سیاسی، مذہبی اور معاشی شعور نیز انگلستان کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں شامل مضمون نگار سید احتشام حسین، سید عبداللہ، آل احمد سرور اور انور پاشا ہیں۔ چوتھا باب 'ترقی پسند تحریک' ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بعد یہ اردو کی دوسری اہم، باضابطہ اور توانا تحریک ہے۔ ہمارے یہاں ادب عالیہ کی شناخت ان دونوں تحریکوں کی مرہون منت ہے۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ ادب اور زندگی کے تعلق سے آگہی ہے۔ تنقید کو خالص جمالیاتی اور رومانی دائرے سے نکال کر سماجی اور تاریخی مطالعہ پر زور دینا اسی تحریک کا کام ہے۔ اس باب میں خلیل الرحمٰن اعظمی، قمر رئیس، اصغر علی انجینئر، صدیق الرحمٰن قدوائی اور انور پاشا کے مضامین شامل ہیں۔ دراصل ادبی تحریک کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جبکہ رجحان حالات کے تقاضے کے تحت جنم لیتا ہے۔ رجحانات کا تعلق ذہنی رویہ سے بھی ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد 'جدیدیت' کا رجحان ترقی پسندی سے انحراف کی شکل میں وجود میں آیا تھا۔ لیکن ثقیل علامت پسندی اور داخلی و انفرادی پہلوؤں پر حد سے زیادہ زور دیے جانے کے سبب قاری نے اس سے بے تعلقی اختیار

کر لی۔ اس طرح جدیدیت اپنا توازن کھوبیٹھی۔ پھر بھی اردو ادب میں جدیدیت کی مثبت دین سے انکار ممکن نہیں۔ پانچویں باب میں جدیدیت سے انحراف اور اعتراف سے متعلق جن نقادوں کی تحریریں شامل ہیں ان میں وحید اختر، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، لطف الرحمٰن، ناصر بغدادی اور شمیم حنفی کے نام قابل ذکر ہیں۔

'مابعد جدیدیت' کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ یہ جدید تر عصری تصورات پر مبنی ہے اس لیے یہ رجحان گزشتہ ڈیڑھ دہائیوں سے موضوع بحث ہے۔ 80 کی دہائی کے بعد مابعد جدیدیت کا رجحان کم ہی مدت میں ایک اہم آواز بن کر ہمارے سامنے آیا۔ مابعد جدیدیت کو جہاں بعض نقادوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے وہیں اس کی حمایت میں مضامین اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ انور پاشا نے اپنے پیش لفظ میں مابعد جدیدیت سے متعلق اپنا خیال یوں ظاہر کیا ہے۔ 'مابعد جدیدیت' ایک کثیر الجہات ادبی رویے سے عبارت رجحان ہے، جس کی بعض جہتوں سے اختلاف تو ممکن ہے لیکن اسے یکسر خارج از بحث قرار دینا یا اس سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں۔'' مابعد جدیدیت سے متعلق تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ اس باب کے تحت گوپی چند نارنگ، دیوندر اسر، شہزاد منظر، سید خورشید عالم، ریاض صدیقی اور مہدی جعفر کے مضامین شامل ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زیر نظر کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مرتب کا ایک بڑا کارنامہ کہا جائے گا کہ تحریکات و رجحانات سے متعلق بکھرے ہوئے مضامین کو کتابی شکل دے کر اردو اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور قارئین کے لیے تحریکات و رجحانات پر ایک انسائیکلو پیڈیا فراہم کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے قاری کو ادبی تحریکات و رجحانات اور ان سے وابستہ مختلف نظریات کو سمجھنے اور ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ گرچہ اس کتاب کے بعض حصے کتابی شکل میں شائع ہو کر 2007 میں ہی منظر عام پر آ گئے تھے لیکن اس کی نوعیت اتنی جامع اور مکمل کتاب کی نہیں تھی، یہ کتاب دو جلدوں میں جس طرح دیدہ زیب شکل میں شائع ہوئی ہے اس سے کتاب کی کشش میں اضافہ ہوا ہے۔ تحریکات و رجحانات پر کام کرنے والے کسی بھی محقق کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

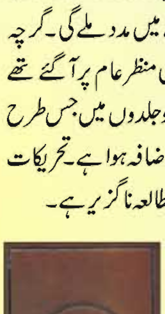

دکنی زبان کی قواعد

مصنفہ: ڈاکٹر حبیب ضیا
صفحات: 344، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: تابش مہدی، G-5/A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

کسی خطہ، علاقے یا سماج کی تعیینِ قدر میں اُن بولیوں ٹھولیوں کا بھی اہم کردار ہوتا ہے، جو وہاں کے رہنے بسنے والوں میں رائج ہوتی ہیں۔ ہندوستان کا وہ حصہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، وہ دکن کہلاتا ہے۔ اِس علاقے میں جو زبان بولی جاتی ہے، بنیادی طور پر وہ بھی اردو ہی ہے، لیکن اپنے لہجے اور بعض ادائی رویوں کی وجہ سے اس کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے نہ الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ جدا۔

میرے ناقص علم اور مطالعے کے مطابق دکنی زبان کی نحوی وصرفی خصوصیات یا اُس کے اردو زبان سے کسی قدر اختلاف پر اب تک کوئی مستقل یا اطمینان بخش کام نہیں ہو سکا ہے۔ غالباً اس موضوع پر سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے 'ہندوستانی لسانیات' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اس زبان کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالی تھی۔ ہمارے عہد کی نامور خاتون اہلِ قلم ڈاکٹر حبیب ضیا علمی اور تحقیقی کاموں سے دل چسپی رکھنے والوں کی طرف سے تحسین وتشکر کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اِس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی حد تک اس کا حق ادا کیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیا ہندوستان کی ان معدودے چند اہلِ قلم خواتین میں ہیں، جنھوں نے اپنی علمی و ادبی تحریروں اور فنی ولسانی تحقیقات اور دریافتوں کے ذریعے سے علمی دنیا کے ایک بڑے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کی تحریریں اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں اور جامعات کے طلبہ وطالبات ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیا ایک طویل مدت تک حیدرآباد کی عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہی ہیں اور اس کے ایک کالج کے اردو شعبے کی سربراہی بھی کر چکی ہیں۔ اب وہ ملازمتی زندگی سے سبک دوش ہو کر پورے طور پر تصنیف وتحقیق کے لیے یک سو ہیں۔ اب تک ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو کر علم وادب کی دنیا میں پزیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں تنقید وتحقیق سے متعلق کتابیں بھی ہیں اور انشائیوں اور طنز وظرافت سے متعلق بھی۔ 'بڑے گھر کی بیٹی' ان کی ایسی خودنوشت ہے، جسے ہر طبقے میں توجہ سے پڑھا گیا۔

ڈاکٹر حبیب ضیا دکن کی مٹی سے تعلق رکھتی ہیں، وہیں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی، وہاں کا ماحول، ان کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ وہاں کی زبان اور تہذیب وثقافت سے انھیں فطری لگاؤ ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتی ہیں، ان کی تحریروں سے دکن کی زبان اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے ان کا رشتہ اُستوار رہتا ہے۔ ان کی زیرنظر کتاب 'دکنی زبان کی قواعد' بھی ان کی اسی دل چسپی کا مظہر ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی موضوع یا صنف سے خصوصی دل چسپی کے بغیر اس میں قابلِ ذکر کارنامہ نہیں انجام دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر حبیب ضیا کی یہ کتاب دراصل ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جو انھوں نے اردو کے نامور استاذ اور ادیب ومحقق ڈاکٹر حفیظ قتیل کی رہ نمائی میں لکھا تھا اور اس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ یہ سب سے پہلے 1969 میں شائع ہوئی تھی۔ اب مصنفہ کی نظر ثانی کے بعد یہ دوبارہ شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے موضوع سے اپنی خصوصی دل چسپی، اپنی فطری ذہانت وفطانت اور غیر معمولی پیشہ ورانہ ومحققانہ توجہ وانہماک کے باعث اِسے ایک دستاویزی حیثیت دے دی ہے۔ اُنھوں نے دکنی زبان کے جملہ قواعد، اس کے اسما، صفات، ضمائر، افعال، متعلقاتِ افعال، حروف اور نحوی وصرفی مسائل پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے یہ تمام بحثیں دکنی زبان کے شعرا کے اشعار کو سامنے رکھ کر کی ہیں۔ انھی سے انھوں نے مثالوں کا استخراج کیا ہے۔ محمد قلی، غواصی، ابن نشاطی، ہاشمی اور وجہی کے بہ کثرت اشعار پڑھنے کو ملے۔ جہاں ضرورت محسوس کی ہے، انھوں نے زبان وقواعد کی مستند ومعتبر کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران میں یہ بات شدت کے ساتھ کھٹکی کہ مصنفہ نے لفظِ 'قواعد' کو ہر جگہ مونث استعمال کیا ہے۔ حتیٰ کہ کتاب کے نام میں بھی مونث ہے۔ 'دکنی زبان کی قواعد' جب کہ 'قاعدہ' کی جمع 'قواعد' لغات میں مذکر ہے۔ جو لفظ 'قواعد' مونث ہے، وہ اسم جامد ہے۔ اس کے معنیٰ پریڈ، فوجیوں کی ورزش اور اصول جنگ کے ہیں۔ حاصل تبصرہ یہ کہ ڈاکٹر حبیب ضیا کی یہ کتاب طلبہ واساتذہ کے لیے بھی مفید وکارآمد ہے اور مصنفین ومحققین کے لیے بھی۔ بلاشبہ اپنے اس تحقیقی کارنامے کی وجہ سے ڈاکٹر حبیب ضیا علم وتحقیق کی دنیا میں دیر یاد کی جاتی رہیں گی۔

ایک بوند اجالا (ناول)

مصنف: احمد صغیر
صفحات: 280، قیمت: 132 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز
مبصر: شجاع الدین خان، 113، نئی بستی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی

احمد صغیر کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول اور افسانوں

کے علاوہ افسانے کی تنقید پر دو کتابیں 'اردو افسانے میں احتجاج' (تحقیقی مقالہ) 2002 اور 'اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (1980 کے بعد)' 2009 میں شائع ہوچکی ہیں۔ احمد صغیر نے نظم اور نثر میں اردو سے ہندی میں تراجم بھی کیے۔ احمد صغیر کی کئی اعزازات و انعامات سے بھی قدر افزائی کی گئی ہے، جس میں 'بہار اردو اکادمی اور اتر پردیش' اردو اکادمی ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

زیر تبصرہ ناول، گلنار نامی لڑکی کی کہانی پیش کرتا ہے۔ مشہور ٹی وی اینکر تبریز ہاشمی اور گلنار ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کا اظہار کرنے سے پہلے ہی گلنار کی شادی آفاق سے ہوجاتی ہے جو کہ دبئی میں نوکری کرتا ہے اور ایک مہینے کی چھٹی پر ہندوستان آیا ہوا ہے۔ دیگر ہندوستانی لڑکیوں کی طرح گلنار بھی اپنے شوہر سے محبت کرنے لگتی ہے۔ چھٹیوں کے اختتام پر آفاق واپس دبئی چلا جاتا ہے۔ اس بار آفاق نے اپنی نئی نویلی دلہن کو بتائے بغیر کمپنی سے چار سال کا معاہدہ کرلیا۔ اس بات سے گلنار کو دکھ ہوا۔ اس طرح ایک ایسی لڑکی کا کرب ابھر کر سامنے آتا ہے جو آتش فراق سے پل پل جلتی ہے۔ شوہر سے دوری کی ٹیس اور تنہائی کے کرب کو ناول نگار نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو گلنار سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ لیکن بار بار ایک ہی قبیل کے جملے دہرانے اور ہر دوسرے تیسرے صفحے پر گلنار کی تنہائی کا صریح ذکر اکتاہٹ میں مبتلا کردیتا ہے۔

گلنار اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے شوہر کو بتائے بغیر تبریز ہاشمی کے ساتھ ٹی وی چینل میں کام کرنے لگتی ہے۔ اس رفاقت نے دل میں دبی محبت کی پرانی چنگاری کو ہوا دی اور شعلہ اٹھا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کرلیا کہ آفاق سے طلاق لے کر تبریز سے شادی کرے گی۔ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گلنار نے آفاق کو طلاق نامہ بھجوایا۔ ناول کا اختتام گلنار اور تبریز ہاشمی کی شادی پر ہوتا ہے۔ یہ منظر بڑا ڈرامائی ہے، آفاق ہاتھ میں بندوق لیے عین اس وقت گلنار کے گھر پہنچتا ہے جب تبریز اور گلنار کا نکاح ہونے والا ہے۔ آفاق، تبریز کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن گلنار بیچ میں آکر لمبی تقریر کرتی ہے۔ اس تقریر سے متاثر ہوکر آفاق نے نہ صرف گلنار کو طلاق دی بلکہ نئے جوڑے کے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ڈالا۔ اس موقع پر آفاق کا مکالمہ درج ذیل ہے:

''میں تمھیں طلاق... طلاق... طلاق دیتا ہوں۔ آج سے تم آزاد ہو اور تبریز کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتی ہو''

ناول کے اختتام پر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں:

ناول ایک مسلم متوسط طبقے کے لوگوں پر لکھا گیا ہے۔ آفاق سے طلاق لیے بغیر گلنار کا تبریز سے نکاح ہوجانا کیسے ممکن ہے، یہ تو مانا جاسکتا ہے کہ انسان کا ذہن اتنا باغی ہوسکتا ہے کہ وہ عدت نہ کرے اور بنا عدت کے دوسرا نکاح کرلے۔ لیکن ایسے باغیانہ رویے کے لیے ماحول بنانا پڑتا ہے جو کہ گلنار کے حوالے سے ناول میں مفقود ہے۔ یہ بات تو بالکل ہی ناقابل قبول ہے کہ ایک عورت کا دوسرا نکاح بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ اب تک نہ تو مسلم معاشرہ اس بات کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی ہندوستانی قانون میں اس کی گنجائش ہے۔ ظاہر ہے یہ عجیب و غریب واقعہ اس وقت کا ہے جب تبریز اور گلنار کے نکاح کی تیاریاں چل رہی تھیں اور گلنار طلاق لیے بغیر ہی تبریز سے نکاح کرکے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار تھی۔

یہ ناول ایسے نو بیاہتا جوڑوں کا المیہ ہے جن کے شوہر غمِ روزگار کے سبب وطن سے دور روپیہ کمانے چلے جاتے ہیں۔ ہجر کے مارے ایسے افراد کی بیویاں بھی وطن میں آتش فراق میں مبتلا رہتی ہیں۔ یہ ایک سنگین اور غیر اخلاقی صورت حال ہے، جس سے نپٹنے کے لیے ناول نگار نے غالباً یہ پیغام دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو بے باکی کے ساتھ اپنے رشتے کو فسخ کرکے نئی قرابت قائم کرنی چاہیے۔ کہانی بالکل سیدھے سادے خطوط پر چلتی ہے کشمکش اور تصادم کا احساس کم از کم قاری کو نہیں ہوتا۔

ناول میں انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ ایسے انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں جن کا متبادل اردو میں نہ صرف موجود ہے بلکہ رائج بھی ہے۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ کرداروں نے نہیں بلکہ راوی نے استعمال کیے ہیں اس لیے ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔ مثال کے طور پر انگیجمینٹ، ہسبینڈ، ہنکی، اکزام، اپ سیٹ وغیرہ۔ تذکیر و تانیث اور واحد جمع کی لغزشیں بھی نظر آتی ہیں۔ چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

''یہ دس دن اسے دس سال لگنے لگتا ہے'' (ص: 59)

''جمنا سورج کی لہروں میں خود کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے یا جمنا ڈوب رہا ہے۔'' (209)

''بات کرنے سے دل کو راحت پہنچتی تھی اور ساتھ رہنے سے دل کو تسکین ملتا تھا۔'' (258)

''میں نے اس کے والدہ سے بات کی'' (54)

ناول کے معاون کردار، عبدالرحمٰن (گلنار کے والد)، شاذیہ، شمامہ، شائقہ، طارق اور عصمت بانو قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ مسائل اور موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اچھا ناول ہے۔ امید ہے کہ ناول کا یہ عنصر ادب کے باذوق قارئین کو ضرور متوجہ کرے گا۔ احمد صغیر اس بات کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی نظر مسلم متوسط طبقے کے سلگتے ہوئے مسائل پر رہتی ہے اور وہ جہان دیگر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

نامی انصاری: فن اور شخصیت

مرتب/ ناشر: جاوید ہاشم، پیشکش: محمد محمود ہاشم
صفحات: 184، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014
مبصر: ڈاکٹر رخسانہ جمیل، کمہر ولی، کمتھول، دربھنگہ (بہار)

نامی انصاری کا نام ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کا اصلی نام رحمت اللہ تھا۔ وہ ضلع رائے بریلی (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے، صد افسوس کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ انھوں نے تقریباً 80 برس کی عمر پائی۔ ان کی وفات کے 4 سال بعد آئی یہ کتاب ان کو خراجِ عقیدت تو پیش کرتی ہی ہے، نامی انصاری کے فن اور شخصیت پر بھرپور روشنی بھی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کو ان کے صاحب زادے جناب جاوید ہاشم نے مرتب کیا ہے اور پیشکش محمد محمود ہاشمی کی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

باب 'مشاہیر کی نظر میں' کے تحت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ (مرحوم)، مخمور سعیدی، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، قیصر نجفی، لاہور، پروفیسر صغریٰ مہدی، یوسف ناظم (ممبئی)، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر قمر رئیس، نند کشور وکرم کے علاوہ ڈاکٹر ابرار رحمانی (سابق مدیر ماہنامہ آجکل) نے نامی انصاری کی شاعری پر اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

مضامین کو تین اہم گوشوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ شخصیت، تنقید اور شاعری کے تحت لکھے گئے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ شخصیت کے حوالے سے قطعہ و نظم پیش ہے اسے جمیل قدوائی کانپوری نے تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ ہے جس کے لکھنے والوں میں پروفیسر ظفر نظامی، مجتبیٰ حسین، عشرت ظفر، فاروق ارگلی، تسکین زیدی اور جناب جاوید ہاشم نے بالترتیب نامی انصاری: ایک لفظی خاکہ، اردو طنز و مزاح، شاعر و تنقید نگار، شاعر ادیب اور ناقد، نامی انصاری اور آخری مضمون عنوان 'ابو کی شخصیت کے چند پہلو' شامل اشاعت ہیں آخری مضمون ان کے صاحبزادے جناب جاوید ہاشم کا تحریر کردہ ہے۔ کل سات مضامین پر مشتمل یہ گوشہ مرحوم نامی انصاری کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگلا باب تنقید کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس کے تحت کل 15 مضامین ہیں۔ اسی گوشے کے تحت نامی انصاری کا تنقیدی زاویۂ نظر جیسا مضمون ڈاکٹر انور سدید (پاکستان) کا تحریر کردہ

ہے۔ دوسرا مضمون بعنوان ایک سچا ادیب جسے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے تحریر کیا ہے۔ مضامین کی کڑی میں دسواں مضمون 'نامی انصاری کی ناقدانہ حیثیت' از ڈاکٹر خان حفیظ اور تیرہواں مضمون 'نامی انصاری اور شاعری کی تنقید' جسے ڈاکٹر محمد ارشد حسین ارشد نے تحریر کیے ہیں۔ خاص طور پر حاصلِ باب ہے۔ دراصل گوشۂ تنقید کے سبھی مضامین مرحوم نامی انصاری کی ادبی تنقید پر ان کی گہری نظر و واقفیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ نامی انصاری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ لہٰذا باب سوم جس میں 9 مضامین شامل ہیں وہ ان کی شاعرانہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے جہاں نامی انصاری کو 'ایک خوش گو شاعر' قرار دیا ہے وہیں دوسری طرف پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے 'باتیں چند' میں ان کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے احباب نے بھی نامی انصاری کی شاعری کے حوالے سے مضامین لکھے ہیں ان میں چند کے نام یوں ہیں عشرت ظفر، یوسف ناظم، ارمان نجمی، منظر اعجاز، وغیرہ۔

نامی انصاری بہ یک وقت شاعر، ناقد، مضمون نگار، طنز و مزاح نگار، اور اس سے بڑھ کر بقول ڈاکٹر علی احمد فاطمی ایک سچا ادیب تھا۔ لہٰذا اس کتاب میں شائع شدہ مضامین کہیں نہ کہیں نامی انصاری کی شخصیت، تنقید نگاری و شاعری کا محاسبہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان مضامین میں نامی انصاری کی تحریروں کے اقتباسات و اشعار بھی جا بہ جا مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

184 صفحات پر مشتمل یہ کتاب جاذب نظر و خوبصورت ٹائٹل لیے ہوئے ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ نامی شناسی میں یہ کتاب بہت خاص ثابت ہوگی اور نئی نسل نامی انصاری سے متعارف بھی ہوگی۔

کشمیر کے تیرہ اردو افسانے

مرتب: ڈاکٹر شمیم احمد و محمد مطہر امین
صفحات: 180، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی
تبصرہ نگار: خالد اشرف، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو شعر و ادب میں کشمیر کے حوالے علامہ اقبال، عزیز احمد، منٹو اور کرشن چندر کے نام سے وابستہ رہے ہیں یا پھر ہم اس کشمیر سے واقف ہیں جس کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ، بخشی غلام اور صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ ہوا کرتے تھے اور جہاں لمبے عرصے تک سیاسی و نسلی تشدد جاری رہا۔

لیکن سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی کے اقبال شناس استاد شمیم احمد اور ان کے کشمیری شاگرد مطہر امین نے 'کشمیر کے تیرہ اردو افسانے' مرتب کر کے وادی کشمیر کو فوکس کر کے کچھ بنیادی حقائق کی طرف قارئین کو متوجہ کرنے کی نئی کوشش کی ہے، جو مستحسن ہے۔ آتش چنار کے ٹائٹل سے آراستہ اس کتاب میں پریم ناتھ، نور شاہ، عمر مجید، وریندر پٹواری، دیپک کنول، ترنم ریاض، دیپک بدکی اور غلام نبی شاہد کے طویل و مختصر افسانے شامل کر کے ہر طبقے کو دیانتدارانہ نمائندگی دی گئی ہے۔ کتاب کے دیباچے سے قاری کو علم ہوتا ہے کہ کشمیر کے دور افتادہ ہونے کی بنا پر افسانے کی صنف وہاں ذرا دیر میں پہنچی اور وہاں اردو کا اولین افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کو تسلیم کیا جاتا ہے، گو کہ چند نقاد تیرتھ کاشمیری اور چراغ حسن حسرت کو اولیت کا مقام عطا کرتے ہیں۔ جب ریاست میں مہاراجہ کے خلاف آزادی کی تحریک چلی تو فکشن اور شاعری میں بھی جدید افکار اور انسان دوستی کے جذبات فروغ پانے لگے۔ لیکن 1947 میں اردو ادب کو اس وقت نقصان پہنچا جب ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور یہی صورت حال آج بھی ہے۔

کتاب میں شامل اولین افسانہ پریم ناتھ پردیسی کا 'ڈھول' ہے۔ اس میں ایک ایسی غریب عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ماں بننے کے لیے ایک فوٹوگرافر سے فوٹو کھنچوا کر پانچ روپے وصول کرتی ہے۔ لیکن پسماندہ معاشرے میں اسے عصمت فروش سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پریم ناتھ کا شاہکار افسانہ 'کاغذ کا واسدیو' شامل انتخاب ہے جس میں غریبی کو ایک کھیل سمجھ کر خوش رہنے والے دو بچوں کی جذباتی محرومی کو پیچیدہ نفسیاتی اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ وریندر پٹواری کا افسانہ 'لالہ رخ' ایک ایسے سیکولر کشمیری کلچر کا اعادہ کرتا ہے جہاں ہندو اور مسلمان کئی صدیوں سے مل جل کر ساتھ رہتے آئے ہیں، لیکن آج یہ کلچر فرقہ پرستی کی بنا پر خطرے میں پڑ چکا ہے۔ پشکر ناتھ کا افسانہ 'درد کا مارا' پڑھ کر اوپیندر ناتھ اشک کی کہانی 'افسانہ نگار خاتون اور جہلم کے سات پل' یاد آ جاتی ہے کہ سیاح کس طرح کشمیریوں کو دھوکے باز سمجھتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ نور شاہ کا افسانہ 'کہانی ایک علیا کی' بھی اسی نوعیت کی ہے جہاں کشمیر جنت نظیر کے باشندوں کے افلاس اور لاچاری کو کرشن چندر کی طرح ایک حساس ادیب کی نظر سے دکھایا گیا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کی کہانی 'ننھلی' دو معصوم بچوں کی یگانگت کی کہانی ہے جو مذہب اور ملت کی تفریق سے ناواقف ہیں۔ اختر محی الدین کی کہانی 'پانڈرچ' اور علی محمد لون کا افسانہ 'پاپی پجاریوں کی سنتان' دونوں تجرباتی نوعیت کی ہیں۔ عمر مجید کا افسانہ 'گونگے گلاب' محبت اور آسائش سے محروم ایک بچے کی نفسیات پر مبنی ہے۔ 'لال پل کا دیوانہ' محبت کرنے والوں کے درمیان سیاست کی پیدا کردہ دیوار کی روداد ہے۔ دیپک بدکی کا افسانہ 'شیر اور بکرا' سیاسی نوعیت کا ہے، جہاں محبت اور سیاست ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ ترنم ریاض کا افسانہ 'برف گرنے والی ہے' ان ناداروں کی کہانی ہے جن کو کچھ جنونی لوگ تشدد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور خود ان کے بچے اس آگ سے محفوظ رہتے ہیں۔ 'آجادی' بھی سیاسی نوعیت کا افسانہ ہے یہ وہ مسئلہ ہے جو بچوں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

مجموعی طور پر 'کشمیر کے تیرہ اردو افسانے' ایک خوبصورت اور معلوماتی نوعیت کا تجربہ ہے۔

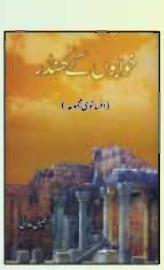

خوابوں کے کھنڈر

مصنف: شکیل علائی
صفحات: 148، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ 4
مبصر: افسانہ خاتون، صدر شعبۂ اردو، جے ڈی ویمنس کالج، پٹنہ

'خوابوں کے کھنڈر' جو اس سال افسانہ نگار شکیل علائی کا تازہ ترین مجموعہ ہے، غالباً یہ اُن کے افسانوں کا پہلا انتخاب ہے۔ شکیل علائی پچھلے دس بارہ برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں اُن کے افسانے چھپتے رہتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ شکیل علائی قومی، ملی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل پر مضامین کے ذریعے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے گوناگوں مسائل پر غور و فکر کے عادی ہیں اور معروضی انداز میں اپنی سوچ کو سامنے لاتے ہیں۔

شکیل علائی کے اس افسانوی مجموعے میں کل 20 افسانے ہیں۔ کچھ افسانے قاری کو موجودہ معاشرے کا کریہہ چہرہ دکھاتے ہیں تو کچھ افسانوں میں آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ 'خوابوں کا کھنڈر' انسانی جذبوں اور احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ 'ایگریمنٹ پیپر' ایک بے بس خاتون کی داستان حیات ہے۔ 'شریک غم' ملک کی سیاست پر ضرب کاری ہے۔ 'زہریلی مسکراہٹ' کا موضوع بھی عورت ہے لیکن یہاں عورت مجبور اور لاچار نہیں ہے بلکہ ایک خطرناک اور شاطر روپ لیے ہوئے اور جب وہ انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے تو کس

درجے تک جاسکتی ہے۔ 'گوتر' بھی اچھی کہانی کے زمرے میں رکھی جاسکتی ہے۔

شکیل علائی ریاست بہار کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ان کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں لیکن ان میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہے۔ اسلوب رواں دواں ہے۔ بیانیہ متاثر کن ہے۔ان کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بلاوجہ افسانے کو طویل نہیں کرتے بلکہ منطقی طور پر جہاں افسانے کا انجام ہوتا وہیں اسے ختم کرتے ہیں۔ امید قوی ہے کہ مستقبل میں ان کے قلم سے مزید اچھے افسانے پڑھنے کو ملیں گے۔

شکیل علائی کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مثبت سوچ رکھتے ہیں۔اپنی ملی اور قومی وراثت کی اہمیت سے وہ واقف ہیں۔انسانی اقدار کی حفاظت کو وہ انسانیت کا سب سے بڑا فریضہ تسلیم کرتے ہیں۔شکیل علائی جس سماج میں رہتے ہیں، اُس کے گوناگوں مسائل سے بھی وہ واقف ہیں اور ان مسائل کی کوکھ سے جو مزید مسائل جنم لیتے ہیں، اُن کے حل کے لیے کوشاں ہیں۔لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایک افسانہ نگار ہیں، مصلح قوم نہیں، اس لیے وہ مسائل کا حل سیدھے طور پر نہیں پیش کردیتے بلکہ اپنے فن اور اپنی سوچ کے زاویے سے مسائل کی سنگینی کو ذہن نشیں کرا دیتے ہیں اور ایک حساس ذہن تلملا کر ان کے حل کے لیے سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

شکیل علائی کے فن کی جڑیں سماج اور زمین میں پیوست ہیں۔ وہ ماورائی گفتگو نہیں کرتے، نہ خوابوں کی حسین وادیوں میں گھومتے ہیں، بنیادی طور پر وہ اپنی زمین ہی پر رہنے والے ایک حساس افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی آنکھیں کھلی ہیں اور بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کا شعور بیدار ہے۔ دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جا بجا ان خصوصیات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

شکیل علائی کو اپنی زبان اور بیان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کمپوزنگ غنیمت ہے۔ مگر جگہ جگہ پروف ریڈنگ کے تئیں عدم توجہی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شکیل علائی اپنے فن پر مزید محنت کریں تو وہ یقیناً اردو کو اچھے افسانے دے سکیں گے۔

مجموعہ اردو اکادمی بہار کے جزوی مالی تعاون سے چھپا ہے۔ ارم پبلشنگ ہاؤس نے اس کی اشاعت پر خاصی محنت کی ہے۔صاحب تصنیف کے ساتھ ساتھ وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

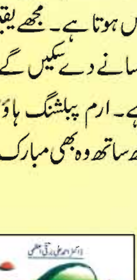

روح سخن

مصنف: ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

صفحات: 464، قیمت: 205 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: مصنف

مبصر: شاکر علی صدیقی ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کا شمار ان ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی روایت اور ادبی میراث کی حفاظت اور اس کو پروان چڑھانے میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ برقی اعظمی کے والد محترم رحمت الٰہی برق اعظمی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی فیض صحبت اور تربیت پدرانہ کے باعث برقی اعظمی پندرہ سال کی عمر سے ہی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔ان کا مخصوص میدان شاعری 'غزل' ہے۔ انھوں نے غزل مسلسل اور موضوعاتی نظمیں لکھ کر اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کیا ہے۔ ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ 'روح سخن' فکر و فن اور مشق سخن کا عمدہ نمونہ ہے، جسے انھوں نے اپنے والد کو انتساب کرکے منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔

'روح سخن' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے یہ بظاہر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کم و بیش پندرہ مضامین شامل ہیں جس میں متعدد ادبا نے احمد علی برقی اعظمی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کو موضوع بحث بنایا ہے۔

دوسرے حصے میں کلام کا آغاز منظوم تعارف اور منظوم پیش لفظ سے شروع ہوتا ہے۔اس کے بعد کلاسیکی طرز پہ حمد اور نعت کو بھی شامل مجموعہ کیا گیا ہے۔تین حمد باری تعالیٰ، پانچ اردو اور ایک فارسی نعت پاک کو شامل کلام کرکے بارگاہ الٰہی اور بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

'یادرفتگاں' کے عنوان سے انھوں نے متعدد شعرا اور ادبا کو منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ برقی اعظمی کا محبوب مشغلۂ سخن موضوعاتی شاعری ہے۔ان کے یہاں اگر ایک طرف موضوع کا اختصاص ہے تو دوسری طرف برق رفتار کمال فکر و فن کا تصرف بھی۔ یاد رفتگاں میں تو انھوں نے جوش عقیدت اور وفور جذبات کا ایسا دریا بہایا کہ مرحوم تخلیق کاروں کی روحیں بےصبری سے پکار اٹھیں! کہ:

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　　اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

یادرفتگاں میں علامہ اقبال، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری، الطاف حسین حالی، ابن انشا، جگر مرادآبادی، ابن صفی، جوش ملیح آبادی، کیفی اعظمی، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، ناصر کاظمی، نظیر اکبرآبادی، پروین شاکر، شاد عظیم آبادی، شکیل بدایونی اور شبلی نعمانی وغیرہ پر تعزیتی یا اعتراف فکر و فن کا منظوم نذرانۂ محبت پیش کیا ہے۔ انھوں نے جس خلوص سے مرحومین کی روحوں کو خوش کیا ہے اس سے ان کی بے پناہ وسعت قلبی، اقدار شعر و فن، درد مندی انسانیت اور انسان نواز شاعر ہونے کی مستحکم دلیل فراہم ہوتی ہے۔

برقی اعظمی نے غزل گوئی کو مختلف تجربات کے وسیلے سے منظر عام پر لانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں کا محور حسن و عشق ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں موضوع کا دائرۂ فکر محدود ہے، لیکن پھر بھی اظہار بیان کی وسعت، لفظوں کا انتخاب، الفاظ کے در و بست اور گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھنے کی قدرت تنگیِ فکر کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی ہے۔ برقی اعظمی کی زود گوئی اور بسیار گوئی کی صلاحیت غزلوں پر بھی غالب ہے، جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں تکرار مضامین اور یکسانیت کا عیب پیدا ہوگیا ہے۔ عرب ناقدین کے نزدیک آورد کی شاعری بہ نسبت آمد کی شاعری سے کسی درجہ فوقیت رکھتی ہے۔ اگر شعرا اپنے کلام کو بےساختہ اور من و عن بغیر کسی غور و خوض کے منظر عام پر لاتے ہیں، تو وہ عیب ہے۔ ناقدین ادب کا اصرار ہے کہ کلام کے اولین مسودے کو حرف آخر سمجھنا صریح غلطی ہے۔ شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنے کلام کی تنقیح کرے اور غور و خوض کرکے کلام کے عیوب کو درست کرے، جس سے کلام میں مزید حسن اور نکھار پیدا ہو۔ بقول حالی:

ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور و خوض کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔

(مقدمہ شعر و شاعری، ص 65، 1996، مرتبہ عبادت بریلوی)

روح سخن کی بیشتر غزلوں کو پڑھیے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی مضمون ہے اور نہ ہی کوئی ارتباط، بلکہ قافیہ اور ردیف کے سہارے شعر نظم ہوتے چلے گئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے مثالوں سے گریز کرتے ہوئے محض چند اشارات آپ کے پیش نظر ہیں ،غزل صفحہ نمبر 265، 271، 277، 287، 297، 299، 302، 305، 309، 322، 429، وغیرہ ایسی غزلیں ہیں جن کا مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ فکر شعر کی اساس قافیہ اور ردیف کی تال میل پر مبنی ہے، مثلاً صفحہ نمبر 265 کی غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے، جس میں مطلع، دو حسن مطلع اور مقطع شامل ہیں۔ اس غزل کی ردیف 'کیوں' اور قوافی "1/ جھکاؤں، مناؤں 2/ بلاؤں، اٹھاؤں 3/ آؤں، جاؤں، 4/ بناؤں، 5/ ستاؤں، 6/ کھاؤں، دکھاؤں، 7/ لگاؤں، 8/ مٹاؤں، 9/ بھلاؤں، 10/ کھاؤں، 11/ بساؤں'

ہیں۔ دو شعر بطور مثال ملاحظہ ہوں:

میں سر نیاز جھکاؤں کیا — نہیں مانتا تو مناؤں کیا
میں ہوں برق تیرا مزاج داں — تری یاد دل میں بساؤں کیا

بطور مثال مذکورہ چند اشارات پیش کیے گئے ہیں، جب کہ زیرتبصرہ مجموعے میں کثیر تعداد اس نوع کی موجود ہیں، جس میں سطحیت اور افتراق نظم کا خاصا دخل ہے۔ اگر ایک خاص معیار و منہاج کا تعین کر کے غزلوں کو منتخب کیا جاتا تو ایک وقیع اور عمدہ سرمایہ دستیاب ہو سکتا تھا، جو فکر و فن کے لحاظ سے معیار نقد پر کھرا ہی نہیں بلکہ مثالی ثابت ہوتا۔ امید ہے کہ صاحب کلام کی نظر اس طرف ضرور مرتکز ہوگی۔

مجموعے کی وہ غزلیں جو فکر و فن کے لحاظ معیار نقد پر پوری اترتی ہیں، ان میں ایک خاص جاذبیت بھی ہے اور حسن بھی، مترنم بحور کا انتخاب بھی ہے اور محاورات و تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال بھی ہے اور محاسن شعری کا انطباق بھی۔ مثلاً غزل صفحہ نمبر 139، 141، 143، 147، 157، 159، 213، 215، 434 وغیرہ۔ اسی طرح بہت سی ایسی غزلیں ہیں جن کا ایک خاص لہجہ ہے ایک خاص فکر ہے اور ایک خاص مضمون ہے، جن میں استاد شعرا کا تتبع بھی ہے اور اکتسابی تفوق بھی۔ بہرکیف بحیثیت مجموعی 'روح سخن' اپنے تمام نقائص کے باوجود ایک انفرادی شعری مجموعہ ہے جس کو یقیناً محفل ادب خوش دلی سے قبول کرے گی۔

نیا دور (خمار بارہ بنکوی نمبر) فروری مارچ 2013

مدیر: وضاحت حسین رضوی

جلد: 68، شمارہ: 12-11

صفحات: 200، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: مئی 2014

ناشر: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اتر پردیش

مبصر: عبدالرشید اعظمی، دوسری منزل، A/187/3، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی

ماہنامہ 'نیا دور' شمارہ فروری مارچ 2013 خمار نمبر کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایک سال تاخیر سے مئی 2014 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس شمارے نے دفعتاً عہد طفلی میں پہنچا دیا۔ میں صرف مشاعرے کا نام سنا کرتا تھا گرچہ چھوٹی چھوٹی محفلیں ہمارے قصبے بلریا گنج میں کثرت سے سجائی جاتی تھیں جن کو حفیظ میرٹھی، ابوالمجاہد زاہد، عزیز بگھروی، شبنم سبحانی اور مائل خیرآبادی زینت بخشتے تھے 'کل ہند مشاعرے' کے شعرا کو گاہے بہ گاہے ریڈیو پر سننے کا موقع ملتا۔

شبلی کالج میں منعقدہ مشاعرہ سننے کا موقع ملا، جس میں پہلی بار شہریار، کیفی اعظمی، کیف بھوپالی، بشیر بدر، وسیم بریلوی، راحت اندوری، نور اندوری، عادل لکھنوی، حبیب ہاشمی، ساغر اعظمی اور خمار بارہ بنکوی کا شرف دیدار نصیب ہوا۔

بات خمار بارہ بنکوی کی ہو رہی تھی۔ عمر قریشی فرض نظامت ادا کر رہے ہیں، جب خمار صاحب کا نمبر آیا اور وہ مائک پر آئے اور جوئے غیر مستقیم کی لہروں جیسے فسوں کار ترنم میں مصرع:

اکیلے ہیں وہ اور جھنجھلا رہے ہیں — مری یاد سے جنگ فرما رہے ہیں

چھیڑا کہ مجمع مستی و بے خودی میں جھوم اٹھا۔ آفرین و تحسین اور سبحان اللہ کی صدا سے فضا گونج اٹھی۔ اس کے بعد خمار صاحب سے کئی غزلیں سنی گئیں۔

وضاحت صاحب نے خمار نمبر شائع کر کے مندمل زخم کو ہرا کر دیا۔

جگر اسکول کے آخری شاعر خمار بارہ بنکوی پر اشاعت پذیر ماہنامہ 'نیا دور' 204 صفحات پر مشتمل سرورق مع خمار دیگر فنکاران ادب وتہذیب نیز سخنوران غزل کا مرقع پیش کر رہا ہے۔ یہ مرقع ماضی قریب کے طرز تہذیب کا غماز ہے۔ بعد ازاں ایک صفحے پر محیط مدیر رسالہ وضاحت حسین رضوی کی تحریر ہے جسے خمار کا مکمل تعارف نامہ کہہ لیجیے۔ پھر کیے بعد دیگرے پانچ صفحات پر مشتمل وزیر اعلیٰ اتر پردیش اکھلیش یادو کے چار دست راست کے پیغامات ثبت ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پانچ میں سے تین اکھلیش یادو، اعظم خاں، اور نونیت سہگل کے دستخط اردو رسم الخط میں ہیں۔ باقی دو، جاوید عثمانی اور پربھات متل نے انگریزی میں دستخط کیے ہیں۔ بعد ازاں پہلے مضمون نگار الہ آباد سے پروفیسر سید مجاور حسین رضوی ہیں۔ رضوی صاحب نے خمار کے ترنم و نغمگی کے وصف پر خامہ فرسائی کی ہے اور خمار کا منتخبہ کلام پیش کیا ہے نیز مختلف اوقات میں پیش آئے واقعات و منعقد مشاعروں اور محفلوں کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ مضمون خمار بارہ بنکوی کی غنائیت و غنائی شاعری پر مربوط انداز میں تحریر کیا گیا ہے اور چھ صفحات کو محیط ہے۔

پونہ سے حسن عباس فطرت نے 'خمار بارہ بنکوی، دیدہ وشنیدہ' کے عنوان سے چھ صفحے کی، ذکر خمار، خمار کی سیرت، دل کی شاعری، غزل کی مخالفت کا دور، خمار کی دردمندی، خلاصۂ شاعری، پر مشتمل تحریر پیش کی ہے۔ فطرت صاحب کی بیشتر تحریر ان کی یادداشت پر مبنی ہے۔ تیسرا مضمون جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے سبکدوش استاذ ڈاکٹر شارب ردولوی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے مقبول استاد رہے ہیں۔ انھوں نے خمار کی شاعری پر ناقدانہ انداز میں فنون لطیفہ واصناف سخن پر تاریخی وتہذیبی اور استدلال سے مملو اپنی بحث چار صفحات میں مکمل کی ہے۔

تیسرا مضمون 'کافر تغزل' کے عنوان سے پروفیسر سید فضل امام رضوی نے مفتی گنج لکھنؤ سے رقم کیا ہے۔ رضوی صاحب نے خمار کی شاعری کے ایک وصف تغزل سے اپنی بات شروع کی ہے۔ اولاً خمار کا ایک شعر نقل کیا ہے:

نہیں اے خمار ایسا کوئی کافر تغزل
مجھے یاد تو کریں کے مرے بعد آنے والے

پروفیسر صاحب نے منجملہ غزل اور غزل کی زبان اور اس کی تاثیر پر اپنی تحریروں سے بصراحت روشنی ڈالی ہے۔ شعری وسائل ولوازمات کو اظہار شعور و جذبہ کے لیے غزل کو خاص مقام دیا ہے اور ہر دور میں غزل اپنے وفور تغزل سے مقبول رہی ہے۔ انھوں نے خمار کو تند و تیز آندھی میں بھی غزل کی نغمگی اور کیفیت بکھیرنے والا شاعر کہا ہے اور ایسے اشعار نقل کیے ہیں جو خالص کلاسیکی ہوتے ہوئے عصر حاضر کے مسائل سے نظر ملاتے ہیں اور موجودہ عہد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

اگلا مضمون مشہور صحافی وافسانہ نگار عابد سہیل صاحب کا ہے۔ یہ تحریر چار صفحات کو محیط ہے۔ نیز حافظاً اساس مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف پروگراموں و محفلوں میں شرکت اور خمار صاحب سے ملاقات کا اظہاریہ ہے جس میں کہیں عابد سہیل صاحب کو تو کہیں خمار صاحب کو خفت ورنج پہنچا ہے۔ تاہم پھر بھی عابد سہیل صاحب نے خمار بارہ بنکوی کو بحیثیت انسان عظیم تسلیم کیا ہے اور ان کے شاعرانہ وقار و مرتبے کی تحسین کی ہے۔ بعد ازاں 'تہذیب غزل اور خمار' کے موضوع پر بھوپال سے اقبال مجید صاحب نے ساڑھے چار صفحات پر محیط مضمون رقم کیا ہے۔ یہ مضمون بھی اپنے اندر کافی تاثیر لیے ہوئے ہے۔ اقبال مجید صاحب نے تہذیب غزل کے ضمن میں بہت سارے ہم عصر اور سینئر ہم عصر شعرا کا ذکر کیا ہے جس میں خمار کی شمولیت و مقبولیت بھی محل نظر ہے اور خمار کی عشقیہ و خمریہ شاعری پر بحث کی ہے۔ مضمون نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ فرداً فرداً سب پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔

دو سو صفحات میں ساٹھ قلم کاروں کو جگہ دی گئی ہے۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور ان کا عملہ قابل مبارکباد ہے کہ انھوں نے ہمارے پسندیدہ شاعر خمار بارہ بنکوی کو 'نیا دور' کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شعر وادب کے حلقے میں حاضر نمبر کی خلاف توقع پذیرائی ہوگی۔ ایسی امید ہے۔ صفحہ نمبر 25 اور 179 پر نام اور پتہ مختلف ہے مگر تصویر ایک شخص کی چھپی ہے۔ یا تو ہم شکل دو اشخاص ہیں یا پھر سہو ہو گیا ہے۔

کامران غنی

خاص گفتگو

اردو کا رسم الخط مکمل اور بہت خوبصورت ہے
خلیل طوق آر

ڈاکٹر خلیل طوق آر نسلاً ترک ہیں۔ ان کی پیدائش استنبول (ترکی) میں ہوئی۔ ترکی میں ہی انہوں نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فی الوقت وہ استنبول یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ڈاکٹر طوقار کی تقریباً دو درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ ترکی سے شائع ہونے والے اردو کے واحد ادبی مجلہ 'ارتباط' کے مدیر بھی ہیں۔ یورپین اردو رائٹرس سوسائٹی، لندن نے سنہ 2000 میں انہیں 'علامہ اقبال' ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ عالمی اردو مرکز، لاس انجلس اور دیگر قومی وبین الاقوامی اداروں کی جانب سے انہیں اعزاز سے نوازا جا چکا ہے۔ پیش ہے ڈاکٹر خلیل طوق آر سے اردو نیٹ جاپان کے مدیر اعزازی برائے ہندوستان کامران غنی کا 'اردو دنیا' کے لیے لیا گیا انٹرویو:

کامران غنی صبا: اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا آغاز کس طرح ہوا؟

خلیل طوق آر: بچپن ہی سے مجھے بہت خواہش تھی کہ مختلف ملکوں اور زبانوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ اس لیے شروع شروع میں جب مجھے پڑھنا لکھنا آ گیا تو جہاں کہیں سے مجھے مختلف ملکوں، تہذیبوں اور زبانوں کے متعلق معلومات ملتی تھیں میں اسے فوراً پڑھنا شروع کرتا تھا۔ اس طرح بچپن میں ہی میں نے مختلف زبانوں کے الف بے سیکھے اور جب میں مڈل اسکول میں جارہا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب کی مدد سے خود سے ہی پرانی ترکی یعنی عثمانی زبان (عربی رسم خط میں لکھی جانے والی ترکی زبان) کے حروف تہجی کو سیکھ لیا تھا اور ترکی زبان کی پرانی کتابیں پڑھنے لگا تھا پھر عمر کے ساتھ ساتھ لسانیات اور ادب کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ خلیل کی زبان سیکھنے کی خواہش دیوانگی کی حد سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے۔ اسی دیوانگی نے مجھے اردو زبان میں دلچسپی لینے اور اسے سیکھنے پر مجبور کیا۔

ک غ: آپ کے لیے اردو بالکل نئی زبان تھی۔ اردو زبان سیکھنے کے عمل میں کیا دشواریاں اور چیلنجز پیش آئے؟

خلیل طوق آر: شروع میں تو اردو میرے لیے بالکل نئی زبان تھی، نہ ہی اردو کے صرف ونحو سے متعلق مجھے کچھ علم تھا مگر یہاں تک مجھے معلوم تھا کہ اردو برصغیر پاک و ہند کی اور ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ جب انسان کسی سے پیار کرے تو اُس کو حاصل کرنے میں اُس کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی۔ اردو سے مجھے محبت تھی اور ہے بھی لہٰذا میں ہر قیمت پر اس کو سیکھنے میں مصر رہا، یہاں تک کہ میں ترکی وزارت خارجہ کے تمام تر امتحانات پاس کر کے اس وزارت کے لیے منتخب ہوا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر وزارت خارجہ میں جاؤں گا تو اردو کو خیر باد کہنا ہوگا اسی لیے میں نے اردو ہی کے لیے یونیورسٹی سے منسلک ہونے کو ترجیح دی۔

ک غ: ترکی میں اردو کی کیا صورت حال ہے؟

خلیل طوق آر: ترکی میں اردو کی صورت حال کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان ترکی میں ایک اجنبی زبان ہے اور اسے اجنبی زبان کی حیثیت سے سکھایا جاتا ہے جس طرح انگریزی یا فرانسیسی کو سکھایا جاتا ہے۔ ترکی میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے وہ بھی پاکستانی یا ہندوستانی النسل لوگ ہیں جو اعلیٰ تعلیم یا کاروباری سلسلے میں موجود ہیں۔ اسی سبب ترکی میں اردو اخبارات یا ویب سائٹ تقریباً مفقود ہے۔ ایک میرا ادبی اور علمی مجلہ 'سہ ماہی ارتباط۔ استنبول' اردو میں شائع ہورہا ہے۔ وہ بھی پچھلے سال میری طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے تعطل کا شکار ہوگیا ہے مگر ذرا طبیعت بحال ہونے پر اس کی طرف پھر سے توجہ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں ارتباط کی بات آئی تو مجھے بالخصوص پشاور کے دو دوست محمد ظہور سیٹھی اور نسیم خواجہ صاحبان اور کراچی کے معراج جامی صاحب کا ذکر خیر کرنا چاہیے کیوں کہ ان تینوں ادب دوست اور ادب پرور ہستیوں نے ارتباط کی

اشاعت میں میری ہر طرح کی مدد کی ہے۔ میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں وہ ناکافی ہے۔

ک غ: کیا ترک اردو زبان کے تعلق سے دلچسپی رکھتے ہیں؟

خلیل طوق آر: جی ہاں، ترکی میں اردو زبان کے متعلق دلچسپی موجود ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ترکی کی تین یونیورسٹیوں میں یعنی استنبول، انقرہ اور قونیہ سلجوق یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبہ جات ہیں اور میں اپنے شعبے کے بارے میں بات کروں تو ہر سال ہماری بی اے کی کلاسوں میں تیس کے قریب طالبعلم باقاعدہ امتحانات پاس کرکے داخلہ لیتے ہیں اور وہ سب کے سب ترک النسل ہیں، اسی طرح ہماری چار سالہ بی اے کی کلاسوں میں کم و بیش ایک سو کے قریب طلبہ و طالبات اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ک غ: آپ کے نزدیک اردو اور ترکی زبان میں کس حد تک مماثلت ہے؟

خلیل طوق آر: دونوں زبانیں الگ الگ زبانی خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود بالخصوص نحو کے لحاظ سے بہت ساری مماثلت رکھتی ہیں اور دونوں زبانوں کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں کئی پہلوؤں سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہاں یہ تو آشکار بات ہے کہ دونوں زبانوں کا صرف بالکل مختلف ہے۔

ک غ: آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ آپ کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اپنی شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں؟

خلیل طوق آر: جی شاعری میں طبع آزمائی کرتا ہوں اور میرے دو شعری مجموعوں کی اشاعت ہو چکی ہے اور تیسرا بھی 'پردیسی' کے عنوان سے ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوگا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران شاعری کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ بات تو سب کو عجیب لگتی ہے لیکن میں سب سے پہلے فارسی میں شاعری کرنے لگا اور پھر اردو کی طرف آیا اور اپنی زبان ترکی میں ایک شعر تک نہیں کہا۔ اس کی وجوہات مجھے بھی معلوم نہیں ہیں۔ شاید تحت الشعور میں کچھ گڑبڑ ہے۔

ک غ: اردو کے کن شعرا سے آپ متاثر ہیں؟

خلیل طوق آر: اردو کے شعرا میں سے مجھ پر اثر چھوڑنے والوں میں میر تقی میر، مرزا غالب اور محمد اقبال کے نام سر فہرست ہیں۔ جدید شعراء میں فیض احمد فیض اور احمد فراز ہیں۔

ک غ: اردو کی کون سی صنف آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

خلیل طوق آر: ظاہر ہے کہ شاعری، کیونکہ شاعری میری طبیعت کو راس آتی ہے۔ ساتھ ساتھ افسانہ اور مزاحیہ ادب بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ آج کل میں امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی، ترنم ریاض اور پاپولر میرٹھی کی شاعری کو توجہ سے سنتا اور پڑھتا ہوں۔

ک غ: قدیم ترکی زبان میں بے شمار الفاظ عربی و فارسی کے تھے، اب عربی و فارسی کے الفاظ تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔ رسم خط بھی رومن ہے۔ اردو کے تعلق سے بھی اکثر یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ اس کا رسم خط بدل کر رومن یا دیوناگری کر دینا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

خلیل طوق آر: اس موضوع پر تو میرا ایک طویل مضمون ہے جسے میں نے ایکسپریس میڈیا گروپ کی دوسری عالمی اردو کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ میں رسم الخط بدلنے والوں سے یہ سوال کرتا ہوں کہ ترکی میں ترکی زبان کا رسم الخط بدل دینے سے ہمارا چھ سو سال کا ادبی، تہذیبی، مذہبی اور علمی سرمایہ کالعدم ہو گیا اور ہم ترکی میں اسی نوے سال سے اس سرمایے کی بازیابی کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں آج تک کامیاب نہیں ہو پائے ہیں۔ کیا آپ بھی اپنے آباواجداد کے چار پانچ سو سال کے تہذیبی، ثقافتی اور دینی سرمایہ سے ہاتھ دھونا چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو رسم الخط بدل دیں جس طرح ترکی میں کیا گیا تھا اور اگر نہیں چاہتے ہیں تو اردو کے رسم الخط کو ہاتھ تک نہ لگائیں کیونکہ یہ رسم الخط مکمل اور بہت خوبصورت ہے۔ مزید برآں اردو رسم الخط کو مشکل کہنے والوں سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جبکہ جاپانی بچے تین مشکل سے مشکل رسم الخط سیکھ سکتے ہیں اور چین کے بچے ایک اخبار پڑھنے کے لیے چار سو سے لے کر ایک ہزار تک کی شکلیں یاد کر پاتے ہیں تو پاک و ہند کے بچے اس قدر سلیس اور سہل الفہم رسم الخط کو یاد نہیں کر سکیں گے؟ اگر جواب نفی میں ہوگا تو میرے خیال میں یہ رسم الخط کی غلطی نہیں اس کو نہ سیکھنے والوں کی سہل پسندی ہے۔

ک غ: اردو کے مستقبل کے حوالے سے آپ کتنے مطمئن ہیں؟

خلیل طوق آر: دل تو 'مطمئن ہوں' کہنا چاہتا ہے مگر دماغ سے رجوع کرتا ہوں تو وہ انکار کرتا ہے۔ جبکہ پاک و ہند میں والدین بالخصوص مائیں اپنے بچوں سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کریں گے، ان کی انگریزی دانی کو بہتر بنانے کی خاطر ہر چیز حتیٰ کہ اپنی شناخت کھونے پر تیار ہوں گی، لوگ انگریزی دانی کو علم و فضل سمجھتے رہیں گے اور مجھ جیسے ایک اجنبی اردو داں سے بھی اردو کے بجائے انگریزی میں بات کرنے کی ضد کریں گے تو میں اردو کے مستقبل سے کس طرح مطمئن ہو سکتا ہوں؟ ہاں پر امید تو ہوں کیونکہ دنیا امید پر قائم ہے۔

ک غ: محبان اردو کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

خلیل طوق آر: جی ہاں، میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو اردو جیسی خوبصورت، شیریں اور باصلاحیت زبان عطا کی ہے تو اس کی اہمیت جانیے۔ اردو دنیا کی واحد زبان ہے جس کی پیدائش بین الاقوامی اور بین المذاہبی گہوارہ میں ہوئی ہے اور مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگوں کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔ اگر اردو ہے تو آپ سب کا تہذیبی اور ثقافتی اتحاد اور رابطہ ہے۔ اس لیے اردو بولتے ہوئے فخر محسوس کیجیے اور اپنے بچوں کو بھی اردو بولنے پر فخر کرنا سکھائیے!

■

Kamran Ghani, Honorary Editor Urdu Net Japan, C/o Hakeem Alimuddin Balkhi, Mainroad Alamganj, Saqqa Toli, Post : Gulzarbagh, Patna 800 007 (Bihar)

پروفیسر خلیل طوق آر: ایک تعارف

نام : پروفیسر خلیل طوق آر

والد کا نام : صلاح الدین طوقار

تاریخ پیدائش : 13 اپریل 1967

مقام پیدائش : باقر کوئے، استنبول (ترکی)

تعلیم :
- بی اے، شعبہ فارسی، استنبول یونیورسٹی 1989
- ایم اے، شعبہ اردو استنبول یونیورسٹی 1992
- پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی 1995

خدمات
- اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی 1990 سے 1999
- اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو 1999 سے 2001
- ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو 2001 سے 2006
- پروفیسر شعبہ اردو 2006 سے تاحال
- صدر شعبہ اردو 1999 سے تاحال

اہم تصانیف
- اردو گرامر کی ابتدائی کتاب
- کشمیر فائل (مسئلہ کشمیر پر ایک کتاب)
- ایک قطرہ آنسو (شاعری)
- آخری فریاد (شاعری)
- اقبال اور ترک (ایک تحقیقی جائزہ)
- جدید ترکی شاعری

اعزازات
- علامہ اقبال ایوارڈ۔ یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی، لندن 2000
- فخر اردو ایوارڈ، اردو مرکز انٹرنیشنل، لاس اینجلس 2009

ان کے علاوہ دیگر قومی و بین الاقوامی ایوارڈز

وزارت برائے اطلاعات ونشریات
حکومت ہند
گاندھی جینتی پر بابائے قوم کو
ہزاروں سلام
مہاتما
davp 22202/13/0046/1415

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

'صاف ستھرا بھارت مشن' کے تحت بابائے قوم مہاتما گاندھی کو قومی اردو کونسل کا خراج عقیدت

نئی دھلی: 2 اکتوبر، 2014. بابائے قوم مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش کے موقع پر ملک بھر میں صاف ستھرے بھارت مہم کے تحت صفائی ستھرائی جاری ہے۔ مرکزی حکومت کے سب سے بڑے اردو ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں بھی اس مشن کے تحت صفائی ستھرائی کا اہتمام کیا گیا اور گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ صبح ساڑھے نو بجے دفتر کھلا اور کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ

کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کونسل کے عملے کو صاف ستھرے بھارت مشن کا حلف دلاتے ہوئے

محمد اکرام الدین نے دفتر اور دفتر کے اطراف صفائی کر کے اپنے جملہ اسٹاف کو ہدایت کی کہ وہ روزانہ صفائی کا اہتمام کریں اور بحیثیت ڈائرکٹر وہ خود بھی اس کا اہتمام کریں گے۔ لہٰذا آپ بھی اپنے کام کرنے کی جگہ بالخصوص ٹیبل، میز، فائل کمپیوٹر اور دیگر اشیاء کو آلودگی، گرد، دھول، گندگی سے محفوظ رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ بابائے قوم مہاتما گاندھی کا خواب صرف آزادی نہیں تھا بلکہ صاف ستھرا اور شفاف ہندوستان بھی تھا۔ اسی لیے وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے سوچھ بھارت مشن کا آغاز کیا تاکہ ملک کے عوام میں صفائی ستھرائی کے تئیں ایک نئی بیداری آسکے۔ اس موقع پر جملہ اسٹاف نے صفائی ستھرائی کر کے صفائی کا حلف بھی لیا حلف اس بات کا کہ وہ اپنے کام کرنے کی جگہ بالخصوص دفتر سے لے کر اپنے رہائشی علاقہ، محلّہ کو بھی صاف ستھرا رکھیں گے، دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیں گے اور ہر سال 100 گھنٹے یعنی ہفتہ میں 2 گھنٹے اپنی رضاکارانہ خدمات ادا کر کے اس صفائی کے عہد کو پورا کریں گے، تاکہ حکومت ہند کے مشن کو کامیاب بنایا جاسکے۔

صاف ستھرے بھارت مشن کے تحت پورے ہفتے کونسل کے مختلف شعبوں میں صفائی ستھرائی پر خصوصی توجہ دی گئی اور یہ عہد کیا گیا کہ کونسل کے جملہ اسٹاف پورے سال صفائی ستھرائی کا بھرپور خیال رکھیں گے اور اس مشن کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور تعاون پیش کرتے رہیں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2 اکتوبر 2014

قوم کا مستقبل اساتذہ کے ہاتھوں سنورتا ہے: خواجہ محمد اکرام الدین

قومی اردو کونسل میں اردو اساتذہ کو استقبالیہ

نئی دھلی: مورخہ 26 ستمبر 2014، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریفریشر کورس کر رہے ملک کی مختلف جامعات سے آئے یونیورسٹی اساتذہ کو قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں شاندار استقبالیہ دیا گیا، اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر نے مہمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ آپ سے نئی نسل کو کافی امیدیں ہیں اور قوم کا مستقبل آپ کے ہاتھوں سنورتا ہے مجھے امید ہے کہ آپ سب اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے مشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ قومی اردو کونسل یہ چاہتی ہے کہ آپ اپنے علاقے میں اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس کوشش میں کونسل ہر طرح کا تعاون دینے کو تیار ہے۔ تقریب کی صدارت کر رہے دہلی اردو اکادمی کے وائس چیرمین پروفیسر خالد محمود نے فروغ اردو کی کوششوں

میں کونسل کے رول کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل آج ہندوستان میں اردو کے فروغ کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے نے نادر و نایاب کتابیں شائع کی ہیں۔ انھوں نے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کونسل ان کی سربراہی میں ترقی کی نئی منازل طے کر رہی ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے تمام اساتذہ کو قومی اردو کونسل کا جریدہ ماہنامہ 'اردو دنیا' اور کونسل کی کچھ کتابیں تحفے میں پیش کیں۔

اس موقعے پر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے آئے اساتذہ نے اپنا تعارف پیش کیا اور کونسل کے حوالے سے گفت و شنید کی۔ اس تقریب میں کونسل کے دیگر عہدے داران اور ملازمین بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 ستمبر 2014

کونسل کے مالی تعاون سے

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ اسکالرز کا بین الاقوامی سیمینار

نئی دهلی: ریسرچ اسکالرز کی تربیت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے ریسرچ اسکالرز کو عالمی معیاری تحقیق پر ابھارا اور اردو زبان وادب کے تحفظ اور وقار کو بلند کرنے کی تلقین کی۔ قبل ازیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے عالمی سطح پر تحقیقی رجحان کے حالیہ تناظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس ریسرچ اسکالرز سیمینار کی منفرد نوعیت ہے کیونکہ اس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا تعاون شامل ہے۔ آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ریسرچ اسکالرز کو اپنے طریقۂ کار تبدیل کرنے کی صلاح دی۔ پہلے دن دو اجلاس منعقد ہوئے، پہلے اجلاس کی صدارت شاہد ماہلی، پروفیسر وہاج الدین علوی اور پروفیسر علی احمد فاطمی اور نظامت عبدالسمیع نے کی۔ ابوہریرہ، شیبا حیدر، ضیاء الرحمٰن اور دھرم ویر سنگھ مقالات اچھے تھے اور مجھے خوشی ہے کہ جس محفل کی آبیاری ہم لوگوں نے کی اس کے محافظ ہمارے بعد بھی موجود رہیں گے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ نئی نسل کو مزید محنت ولگن سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ موضوع منتخب کیے جانے کا طریقۂ کار تبدیل نہیں کیا جارہا ہے جس سے اسکالروں کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے اجلاس میں حیدر علی، محمد احتشام الحسن، رحمت یونس اور لاہور کے گورنمنٹ کالج سے آئیں

سیمینار کے افتتاحی اور اختتامی اجلاس کا منظر

تحقیق کے حوالے سے نئی نسل کے اندر دلچسپی پیدا کرنے کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ یہی نسل ہماری زبان کا مستقبل ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وسیع ہوتی دنیا میں اپنی زبان تہذیب، ثقافت کا تحفظ ایک بڑا چیلنج ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے ریسرچ اسکالرز سیمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کو سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے زبان و ادب کا موازنہ کرتے ہوئے فارسی اور اردو کی قدامت اور فارسی زبان و ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پاکستان کے کارگزار ہائی کمشنر منصور علی خاں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کے حوالے سے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ اردو کے معاملے میں ہم لوگوں کو بھی فکر لاحق ہے کہ نئی نسل اردو سے دور ہوتی جارہی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے انسٹی ٹیوٹ کی خدمات پر نے مقالے پیش کیے جبکہ بحث میں محمد یوسف، نوشاد منظر، شمس الدین اور سفینہ نے حصہ لیا۔ دوسرے اجلاس میں محمد عاشق ملک، شاہنواز احمد، اجے کمار اور کہکشاں فلک نے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن میں مقالوں پر کمیل ترابی، محمد صادق، شبیر احمد وانی اور فرحہ ادیبہ نے بحث کیا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر صادق، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر بلقیس اور فاطمہ حسینی نے کی اور نظامت کے فرائض سید عینین علی حق نے انجام دیے۔

دوسرے دن چار اور تیسرے دن تین اجلاس ہوئے۔ ان کے دوران شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے ریسرچ اسکالر کو اردو کی نئی شمع بتاتے ہوئے کہا کہ اتنی تعداد میں اردو والوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو اپنے تلفظ پر ضرور توجہ دینی چاہیے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ سبھی اسکالر صائمہ ارم نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے سیشن میں رفعت مہدی رضوی، عزیر احمد، زیبا فاروقی اور سعد الدین نے مقالے پیش کیے، اس اجلاس کی نظامت محضر رضا نے کی۔ تیسرے اجلاس میں محمد ایوب، جمیلہ بی بی، منہاج الدین، منت اللہ صدیقی اور زبیر احمد نے مقالے پیش کیے اور نوشاد منظر نے نظامت کی۔

اس سہ روزہ سیمینار میں خود ریسرچ اسکالرز نے نظامت کی، پرچے پیش کیے اور ان پر اظہارِ خیال بھی کیا۔ صدارت کے لیے اساتذہ کرام کی ایک ٹیم موجود ہوتی تھی۔ آخری دن تین سیشن ہوئے اور سہ پہر چار بجے اس کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام اسکالرز کو کتابوں کا ایک سیٹ اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر ثروت خان اور پروفیسر انور پاشا نے کی اور نظامت افسانہ حیات نے کی۔ ذاکر حسین، سعدیہ جعفری، جناب عبدالکریم، سفینہ،

فاطمہ پروین نے مقالے پیش کیے۔ شرکائے بحث میں خورشید احمد، محمد رضا، شہنواز عالم اور محمد مقیم نے گفتگو کی۔ پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ریسرچ اسکالروں کا یہ تشکیلی دور ہے اور ایک مقام پر جاکر ان کے اندر پختگی اور بالیدگی ضرور پیدا ہوگی لیکن ابھی ان کے اندر جس طرح کا اعتماد ہے وہ روشن مستقبل کا غماز ہے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اسکالروں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اپنے مقالے کے اندر ریسرچ کے درمیان پیش آنے والی دشواریوں کا بھی ذکر کریں تاکہ ان کے عمل سے دوسروں کو بھی مدد مل سکے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم نے کی، جبکہ رفعت مہدی رضوی نے نظامت کی۔ مقالہ نگاروں میں سعدیہ سرور، یاسر عباس، ارسا کوکب، عرشِ منیر، شفیق انور شامل تھے۔ بحث میں نورین علی حق، ایس ایم قنبر، جناب سلمان فیصل، صدف پرویز اور نظام الدین نے شرکت کی۔ مقالات کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر عین الحسن، پروفیسر معین الدین جینابڑے نے جبکہ نظامت شہنواز فیاض نے کی۔ مقالہ نگاروں میں نغمہ نگار، علی ابراہیم آرزو، عندلیب عمر نے مقالے پیش کیے۔ اختتامی تقریب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر صائمہ ارم اور پروفیسر ابن کنول نے خطاب کیا اور نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔

این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اصلاح بڑی نعمت ہے اور اس کو نعمت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔ انھوں نے خوش خبری دی کہ کونسل آئندہ چار مہینہ کے اندر تقریباً 1200 کتابوں پر مشتمل ایک اپلیکیشن متعارف کرانے جارہی ہے ساتھ ہی پاکستانی ادیبوں اور اداروں کے اشتراک سے وہاں کے مصنّفین کی کتابوں کو ہندوستان میں شائع کرنے کا وعدہ کیا۔ شاہد ماہلی نے ریسرچ اسکالرز سیمینار کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی خصوصیت بیان کی اور حالیہ اردو منظرنامے پر تفصیلی گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27، 28، 29 ستمبر 2014

اکیسویں صدی کی ادبی صحافت

'اکیسویں صدی کی ادبی صحافت' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

سنبھل: 27 ستمبر 2014 کو شعبۂ اردو ایم جی ایم (پی جی) کالج سنبھل کی طرف سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک قومی سیمینار بعنوان 'اکیسویں صدی کی ادبی صحافت' کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح نینوٹکنالوجی کے مشہور سائنسٹ روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے وائس چانسلر پروفیسر مشاہد حسین نے شمع روشن کرکے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ارون کمار گپتا نے کی۔ افتتاحی سیمینار کے کنوینر صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کی ادبی صحافت کو ہمیشہ بڑے چیلنجز کا سامنا رہا ہے لیکن اس نے بدلتے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی اور آج بھی یہ وقت سے آنکھیں ملانے کی جرأت رکھتی ہے۔ کالج کی مجلس انتظامیہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب سنجے اگروال نے وائس چانسلر پروفیسر مشاہد حسین، مقرر خصوصی پروفیسر علی احمد فاطمی اور مختلف صوبہ جات سے تشریف لانے والے مقالہ نگاروں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ادبی صحافت کی بنیاد قومی یکجہتی اور گنگا جمنی اقدار پر رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور ہی سے اردو کے ادبی رسائل کے مدیر ہندو و مسلمان دونوں تھے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور ترقی پسند ناقد اور صحافی پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ گذشتہ صدی تک جو ادیب تھے وہ صحافی تھے اور جو صحافی تھے وہ ادیب تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادب اور صحافت کا بنیادی کام انسانیت کا فروغ ہے۔ افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی اور نینوٹیکنالوجی کے ماہر سائنس داں وائس چانسلر پروفیسر مشاہد حسین نے کہا کہ اردو اخبارات و رسائل کا سرکولیشن بھلے ہی کم ہو لیکن معیار بہت بلند ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں خود اردو کے ادبی رسائل کو انٹرنیٹ کے سہارے دیکھتا ہوں خاص کر 'اردو دنیا' میرا پسندیدہ ادبی رسالہ ہے۔ آخر میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ارون کمار گپتا نے کہا کہ ادبی رسائل پر یہ سیمینار نئے مباحث کی راہیں ہموار کرے گا۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر عابد حسین حیدری اور رضاء الرحمٰن عاکف نے مشترکہ طور پر انجام دی۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر صداقت علی خاں پرنسپل بی ایڈ کالج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (سنبھل کیمپس) جناب لئیق رضوی ڈپٹی ایڈیٹر عالمی سہارا نوئیڈا اور پروفیسر ثوبان سعید (ایسوسی ایٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی عربی فارسی اردو یونیورسٹی لکھنؤ) نے مشترکہ طور پر کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا محمد میاں قاسمی موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم (بیورو چیف رپورٹر روزنامہ انقلاب دہلی) نے کی۔ اس سیشن میں فرحینہ ناز، صبا ناز، غلام سرور، غلام غوث، عاقب کمال، ڈاکٹر علی عباس (چنڈی گڑھ) ڈاکٹر عبدالحی (دہلی) ڈاکٹر زیبا ناز (مرادآباد) نے مقالات پیش کیے۔ ان مقالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ثوبان سعید نے کہا کہ ان مقالات کو سن کر یہ احساس ہوا کہ ادبی صحافت اکیسویں صدی میں بھی اپنے روشن مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔ مولانا محمد میاں قاسمی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد طاہر (اعظم گڑھ) اور ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے مشترکہ طور پر کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر علی احمد فاطمی موجود تھے۔ اس اجلاس میں جناب لئیق رضوی (نوئیڈا) ڈاکٹر ممتاز عالم (دہلی) ڈاکٹر ارشاد احمد (سیوان) ڈاکٹر محمد ارشد (کانپور) ڈاکٹر ریاض احمد (سنبھل) اور ڈاکٹر راشد عزیز (سری نگر کشمیر) نے مقالات پیش کیے اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ریحان حسن (امرتسر) نے انجام دی۔ ڈاکٹر محمد طاہر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ اجلاس ایک کامیاب اجلاس ہے جس میں ادبی رسائل کے مسائل، ادبی رسائل میں تعلیمی مسائل اور انٹرنیٹ کی صحافت پر خاطر خواہ گفتگو ہوئی۔

سیمینار کا آخری اجلاس سہ پہر 4 بجے شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر راشد عزیز (سری نگر) اور ڈاکٹر ریاض احمد نے مشترکہ طور پر انجام دی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب گیان پرکاش گپتا جی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رامپور) انجینئر فرقان سنبھلی (علی گڑھ) ڈاکٹر ریحان حسن (امرتسر) جناب شیخ نگینوی (میڈیا پوسٹ دہلی) ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے مقالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایم جی ایم کالج کے

شعبۂ اردو کے سر براہ ڈاکٹر عابد حیدری نے اس حساس موضوع پر سیمینار منعقد کر کے ادبی صحافت کے نئے گوشوں پر بحث کی راہ ہموار کی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدری کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل اور مجلس انتظامیہ کو بھی مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر راشد عزیز نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس اہم موضوع پر ابھی تک بڑی بڑی دانشگاہوں میں سیمینار نہیں ہوا ہے۔ شعبۂ اردو نے یہ سیمینار منعقد کر کے ہمیں یہ احساس کرایا کہ ہم اردو والے کہاں کھڑے ہیں اور اردو کی ادبی صحافت کا کیا معیار ہے۔ اس سیمینار کی نظامت سیمینار کے کنویز ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے کی جبکہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ارون کمار گپتا نے تمام اسکالرس، محبان اردو، معززین شہر، اساتذہ، طلبا و طالبات کے ساتھ ساتھ صحافیوں کا بھی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، کنویز سیمینار، سنبھل، 29 ستمبر 2014

گری راج کالج نظام آباد میں بین الاقوامی اردو سیمینار کا انعقاد

گری راج کالج نظام آباد میں بین الاقوامی اردو سیمینار کا منظر

نظام آباد: اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس زبان نے ہندوستان میں شاندار تہذیبی روایات قائم کی ہیں۔ جس سے ملک میں مذہبی رواداری' آپسی بھائی چارہ، اتحاد، محبت، خلوص ہمدردی جیسے جذبات پروان چڑھے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار محقق و نقاد ماہر اقبالیات وانیس ڈاکٹر تقی عابدی نے گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ ایک روزہ قومی و بین الاقوامی اردو سمینار سے بذریعے ویڈیو کانفرنس براہ راست کناڈا سے اپنے خطاب میں کیا۔ اس ایک روزہ سمینار کا موضوع اردو ادب تہذیبی قدریں ماضی حال اور مستقبل تھا۔ اس سیمینار میں پروفیسر خالد سعید انچارج ڈائرکٹر مرکز برائے اردو زبان تہذیب و ثقافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بہ طور مہمان خصوصی شرکت کی اور کلیدی خطبہ دیا جس میں انھوں نے کہا کہ تہذیبوں کے بننے میں جغرافیائی حالات، زبان، لباس اور رہن سہن اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے سیمینار کے کنویز ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کو ٹیکنالوجی کے استعمال کے ساتھ شاندار اردو سمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی اور کہا کہ ویڈیو کانفرنس کے ذریعے دنیا کے کسی بھی حصے سے دانشوروں کے لیکچر منعقد کرنے کا تجربہ دوسروں کو بھی سیکھنا چاہیے۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض محمد عابد علی لیکچرر کامرس واکیڈیمک کوآرڈینیٹر نے انجام دی۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے سمینار میں شرکت کے لیے آئے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے سیمینار کا خطبہ استقبالیہ دیا جس میں انھوں نے سیمینار کی منظوری کے لیے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اس کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام سے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ کالج کے پرنسپل پروفیسر ایس لمبا گوڑ نے فروغ اردو کے پروگراموں کی منظوری دیتے ہوئے اپنے محبّ اردو ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے کہا کہ تہذیب کی تعمیر میں زبان کا اہم رول ہوتا ہے اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں اردو زبان نے اتحاد و بھائی چارے کے فروغ کا رول ادا کیا ہے۔ پروفیسر ایس لمبا گوڑ نے کامیاب سیمینار کے انعقاد پر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی اور ان کے رفقا کو مبارک باد پیش کی۔ سید مجیب علی ڈائرکٹر کریسنٹ گروپ آف اسکولس نظام آباد نے نظام آباد میں بین الاقوامی اردو سمینار کے انعقاد کے لئے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی و دیگر کو مبارک باد پیش کی۔ جناب محمد نصیر الدین سابق صدر شعبہ تاریخ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کلچر شائستگی اور نفاست سے پیدا ہوتا ہے یہ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے کلچر داخلی پہلو ہے اور تہذیب خارجی پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ تعلیم گاہ دراصل تربیت گاہ ہے لہٰذا تعلیم کے زریعے تہذیب اقدار طلبا وطالبات میں پیدا کیے جائیں۔ جناب جمیل نظام آبادی، ڈاکٹر صفدر عسکری پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج آرمور نے بھی سیمینار سے خطاب کیا۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالوں پر مبنی سوونیر اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی تیسری تصنیف سائنس نامہ کی رسم اجرا پرنسپل کالج اور مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کنویز سمینار نے تمام مہمانوں اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، راغب دیشمکھ، نظام آباد، 21 ستمبر 2014

کونسل کی کتاب گاڑی الٰہ آباد میں

الٰہ آباد: الٰہ آباد یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی گشتی وین جلوہ افروز رہی۔ اس موقعے پر اردو ادب کے شائقین نے معیاری کتابیں خریدیں۔ فروغ اردو کونسل کی گشتی وین الٰہ آباد یونیورسٹی میں چار ستمبر کو آگئی تھی اور دو دن تک یونیورسٹی میں رہی۔ دوسرے دن شہر کی معروف شخصیات نے بھی کتابیں خریدیں جس میں سینئر نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر نوشابہ سردار، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر علی حیدر، ڈاکٹر ظفر انصاری، رضوانہ، گیانویندر سنگھ،

عارفہ، نیلوفر، نورالاسلام، عرفان، نفیس عبدالحکیم، محمد فہیم راعی، ڈاکٹر نشاط فاطمہ، سید مددگار حسین رجویا ور فرح ہاشم وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اطلاع کے مطابق الٰہ آباد یونیورسٹی میں چار ستمبر سے پانچ ستمبر تک تقریباً 50 ہزار روپے سے زیادہ کی کتابیں خریدی گئی ہیں۔ تیسرے دن 6 ستمبر کو بھی بڑی تعداد میں کتابوں کی فروخت ہوئی۔ الٰہ آباد شہر میں تین دنوں میں تقریباً 70 ہزار روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' الٰہ آباد، 6، 7 ستمبر 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

قومی کمیشن برائے اقلیت کا سالانہ لیکچر

نئی دهلی: اردو زبان کے سلسلے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ اس کا جائز حق دلانے کی سمت میں پہلا قدم ہے، جو قابل خیر مقدم ہے۔ اس فیصلے کی روشنی میں ہندی کی طرح اردو کو بھی قومی سرکاری زبان کے زمرے میں لایا جاسکتا ہے۔ سابق ایڈیشنل سالیسٹر جنرل فالی سیم نریمن نے کانسٹی ٹیوشن کلب میں 'قومی کمیشن برائے اقلیت کے ساتویں سالانہ لیکچر' میں اس خیال کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی آئین میں تمام اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی ہے، جس میں مذہبی اقلیت، لسانی اقلیت اور علاقائی اقلیت شامل ہے۔ پدم بھوشن ایوارڈ یافتہ مسٹر نریمن نے کہا کہ عوام نے وزیر اعظم نریندر مودی کی زیر قیادت قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) کی حکومت کو غالب اکثریت کے ساتھ ملک کا اقتدار سونپا ہے اب ملک اور خاص طور پر اقلیتوں کو سماجی، اقتصادی اور تعلیمی تحفظ فراہم کرانا مودی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مسٹر فالی سیم نریمن نے کہا کہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے اور ملک کو شورش سے پاک رکھنے کی صورت میں ہی ملک تیز رفتار ترقی کرسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایسے کثیر الجہات ملک میں رہتے ہیں جہاں کے ہر علاقے کی زبانیں الگ الگ ہیں، لباس الگ ہیں، رہن سہن کا انداز الگ ہے اور عبادت کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔ اس کے باوجود یہاں کے عوام ایک ساتھ رہ کر کثرت میں وحدت کے اصول اور فلسفے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ مسٹر فالی نریمن نے کہا کہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے اقلیتی کمیشن کا قیام ہندوستانی جمہوریت کا مثالی قدم ہے، جس کو مضبوط اور بااختیار بنانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کے خلاف حملوں کو روکنے کا راستہ تلاش کرنا کمیشن کی ذمے داری ہے۔ اسی طرح اقلیتوں کے خلاف اشتعال انگیز زبان کے استعمال کو بھی قابل گرفت جرم میں شامل کیے جانے کی ضرورت ہے۔

مرکزی وزیر نجمہ ہبت اللہ، فالی سیم نریمن کو مومنٹو پیش کرتے ہوئے

مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور نجمہ ہیبت اللہ نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت میں ہر کسی کو اظہار رائے اور پسند و ناپسند کا اظہار کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس لیے ہر طبقے کو اپنے مسائل اور اپنے حقوق کے تحفظ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق ہے۔ اقلیتوں کے تحفظ کی گارنٹی دینا ہندوستانی جمہوریت کا مستحسن قدم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک کے عوام کو برابری کا حق دلانے کے تعلق سے وزیر اعظم نریندر مودی نے 'سب کا ساتھ سب کا وکاس' کا نعرہ دے کر اس کی بہترین تشریح پیش کی ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13 ستمبر 2014

لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن کی پچاسویں رپورٹ

نئی دهلی: آئین ہند نے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی ہدایت دی ہے لیکن ملک کی آزادی کے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود بیشتر اسکول نہ صرف اس کی ان دیکھی کر رہے ہیں بلکہ بچوں پر زیادتی کرتے ہوئے ان پر اپنی مرضی کی زبان پڑھنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن نے اپنی پچاسویں رپورٹ میں واضح لفظوں میں کہا ہے کہ آئین ہند کی دفعہ 350 اے میں یوں تو تمام ریاستی حکومتوں اور مقامی انتظامیہ سے توقع کی گئی ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی پرائمری سطح پر تعلیم ان کی مادری زبان میں فراہم کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں گی۔ کمیشن کے چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کے دستخط سے جاری اس رپورٹ میں، جسے پچھلے دنوں اقلیتی امور کی وزیر نجمہ ہپت اللہ نے پارلیمنٹ میں پیش کیا، سفارش کی گئی ہے کہ اسکولوں میں ایڈمیشن فارم میں بچوں کی مادری زبان، جس زبان میں وہ پڑھنا چاہیں اور سہ لسانی فارمولہ کے تحت دوسری زبان اختیار کرنے کے سلسلے میں واضح کالم ہونے چاہئیں تاکہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کی سہولت کو یقینی بنایا جاسکے۔ بیشتر اسکول دستور ہند کی اس ہدایت کو نظر انداز کرنے کے لیے مختلف بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ قومی دارالحکومت دہلی میں ایک این جی او کی طرف

سے دائر کردہ آر ٹی آئی کے جواب سے بھی ہوتا ہے جس کے مطابق دہلی کے تقریباً 100 سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ نوائے حق ویلفیئر ایسوسی ایشن، نئی دہلی نے دہلی حکومت کے ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن سے حق اطلاعات کے تحت جب یہ معلوم کیا کہ کتنے سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو اردو پڑھائی جارہی ہے تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ

دارالحکومت کے 100 سرکاری اسکولوں میں مسلم بچوں کو اردو کے بجائے سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ آر ٹی آئی کے جواب سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے 100 سرکاری اسکولوں میں 14800 سے زائد مسلم بچے زیرتعلیم ہیں لیکن انھیں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور ان بچوں کو درجہ چھ سے دس کے درمیان تیسری زبان کے طور پر مجبوراً سنسکرت کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ آر ٹی آئی کے جواب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سرودیہ کنیاودیالیہ، سلطان پوری، ایچ بلاک میں 789 مسلم بچے ہیں، تاہم ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی ہدایت کے باوجود وہاں اردو پڑھانے کے لیے کسی ٹیچر کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے قومی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اقلیتی اسکولوں میں طلبا اور ٹیچر کے تناسب میں زبردست فرق پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے اور مناسب تعداد میں ٹیچروں کی تقرری کی سفارش کی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بالعموم طلباء اور ٹیچر میں 1:40 کا تناسب ہوتا ہے، لیکن اقلیتی اسکولوں میں یہ فرق اس سے بہت زیادہ ہے۔ کمیشن نے اسی طرح لسانی اقلیتوں کے ٹیچروں کی تربیت، اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں اور اسٹڈی میٹریلس کی سپلائی کی بھی سفارش کی ہے۔ خیال رہے کہ آئین کی دفعہ 30 کے تحت ملک میں اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انھیں چلانے کا حق حاصل ہے۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ جس طرح کے اختیارات قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کو حاصل ہیں اسی طرح کے اختیارات قومی لسانی اقلیتی کمیشن کو بھی تفویض کیے جائیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 ستمبر 2014

بین الاقوامی سیمینار اور ریسرچ اسکالر

بین الاقوامی اردو اور ریسرچ اسکالر سیمینار میں پروفیسر ابن کنول اور خواجہ اکرام الدین صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے، ساتھ میں پاکستان کی ریسرچ اسکالر ارسہ کوکب اور سعدیہ سرور

نئی دهلی: سیمینار کے ذریعے ریسرچ اسکالرس کی صلاحیت میں نکھار لایا جاسکتا ہے اور سیمینار میں طلبا کو موقع دیے جانے سے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے۔ نئے دور میں ریسرچ کے طریقۂ کار میں تبدیلی آئی ہے جس کی بنا پر اس امر پر اردو ادب کے ماہرین اور متعلقہ ذمے داران کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے روزنامہ 'سیاسی تقدیر' سے ایک خصوصی گفتگو کے دوران کہیں۔ اس موقعے پر پاکستان سے تشریف لائیں ریسرچ اسکالر ارسہ کوکب اور سعدیہ سرور بھی موجود تھیں۔ خواجہ محمد اکرام الدین نے ریسرچ اسکالروں کو سیمینار میں موقع دیے جانے سے متعلق سوال کے جواب میں کہا کہ قومی کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ریسرچ اسکالرز کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں کیونکہ اب ریسرچ کے طریقۂ کار میں تبدیلی آرہی ہے اور ان تبدیلیوں سے متعلق اقدامات کرتے ہوئے طلبا کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں، جس سے انھیں اپنے تحقیقی کام میں مدد ملے اور انھیں آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم ہوں۔

پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار سے ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر طلبا کو موقع دیا جائے تو ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آجائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام منعقدہ بین الاقوامی سیمینار اپنی نوعیت کا منفرد سیمینار تھا کیونکہ اس میں سینئر اساتذہ بھی سامعین کی حیثیت سے موجود تھے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کو اس نوعیت کے ریسرچ اسکالرز سیمینار منعقد کرنے چاہئیں، جس سے طلباء کو مواقع بھی ملیں گے اور اس سے انھیں فائدہ بھی ہوگا۔ ابن کنول نے کہا کہ ہندوستان کے سیمینار میں پڑوسی ملک پاکستان سے شرکا تشریف لاتے ہیں مگر پاکستان میں اس طرح کے سیمینار کا رواج نہیں ہے، اس لیے پاکستان میں بھی سیمینار کا انعقاد وقت کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی ریسرچ اسکالرز ارسہ کوکب اور سعدیہ سرور نے ہندوستان آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ہی بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سیمینار منعقد کیا جاتا ہے، جس سے ہم سبھی کو فائدہ پہنچتا ہے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 30 ستمبر 2014

نجیب جنگ کی دہلی اردو اکادمی کی نوتشکیل شدہ گورننگ کونسل سے ملاقات

نئی دهلی: اردو اکادمی دہلی کی نوتشکیل شدہ گورننگ کونسل کے اراکین نے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود کے ہمراہ لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ سے جو فی الوقت اکادمی کے سربراہ بھی ہیں ملاقات کی۔ اس موقعے پر لیفٹیننٹ گورنر سے تمام ممبران کا تعارف کرایا گیا اور

پروفیسر خالد محمود نے لیفٹیننٹ گورنر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ گورنر نے جن ممبران پر مشتمل گورننگ کونسل بنائی ہے ان میں معروف اسکالرز، دانشور، سنجیدہ صحافی، سماجی کارکن، اساتذہ اور ایسے افراد شامل ہیں، جو اردو زبان وادب کے فروغ میں مسلسل اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ سکریٹری اکادمی انیس اعظمی نے لیفٹیننٹ گورنر کو اکادمی کی سرگرمیوں سے متعارف کرایا۔ گورنر نے اکادمی کی تمام اسکیموں پر اطمینان کا اظہار کیا۔ لیفٹیننٹ گورنر نے اپنے خطاب میں کہا کہ اکادمی کی کوششوں سے اردو زبان پھلتی پھولتی نظر آتی ہے، لیکن کسی بھی زبان کی بنیاد اس کی تعلیم ہوتی ہے، پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم اطمینان بخش نہیں ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ہمیں واقعی اپنی زبان سے محبت ہے اور ہم اس کی بقا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی سوچ بھی بدلنی ہوگی۔ باصلاحیت افراد کو ان کا

جائز مقام دلانا ہوگا نہ کہ سفارشیں کر کے بے صلاحیت افراد کو آگے لایا جائے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے وہاں موجود سکریٹری، محکمۂ فن وثقافت والسنہ ایس۔ ایس۔ یادو سے کہا کہ اکادمی کی جانب سے 'غالب ہفتہ' یا 'اردو وراثت میلہ' ایسے پیمانے پر منعقد کیا جائے جو یادگار بن جائے۔ معروف ومقبول فنکاروں خواہ وہ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں انھیں ان پروگراموں کا حصہ بنایا جائے۔ بیگم اختر کے صد سالہ یوم پیدائش پر بھی ایسے پروگرام کیے جائیں جو اس عظیم فنکارہ کے شایانِ شان ہوں۔ اس موقعے پر لیفٹیننٹ گورنر کو اکادمی کی شائع شدہ کتاب 'واقعاتِ دارالحکومت دہلی' کی تینوں جلدیں پیش کی گئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2014

مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ

نئی دہلی: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک وفد نے نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری سے ملاقات کر کے انھیں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

کے ذریعہ مرتب کردہ 'مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ' کی چوتھی جلد کی ایک کاپی پیش کی۔ اس سے قبل اس مجموعے کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی 11 مزید جلدیں شائع ہونی ہیں، جن پر انسٹی ٹیوٹ کام کر رہا ہے۔ نائب صدر محمد حامد انصاری نے مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی مرتب کردہ اس کتاب کی اشاعت پر کافی خوشی کا اظہار کیا اور ان سے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے دیگر منصوبوں، پروجیکٹ اور کام کاج کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کتاب کا باقاعدہ مطالعہ کریں گے۔ محمد حامد انصاری سے ملاقات کے بعد مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے بتایا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ ان پر کافی عرصے سے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 'مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ' کی کل 14 جلدیں مرتب کی جائیں گی، جن میں شاہ ولی اللہ کی حیات وخدمات کا مکمل احاطہ کیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 ستمبر 2014

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکادمک اسٹاف کالج میں سترہویں ریفریشر کورس کا منظر

سترہواں اردو ریفریشر کورس اختتام پذیر

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکادمک اسٹاف کالج میں اردو کے سترہویں ریفریشر کورس کا اختتام بخیر وخوبی عمل میں آیا۔ اختتامی تقریب میں ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے مہمانان اور حاضرین کا استقبال کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علمی اور غیر افسانوی نثر کی طویل روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے اراکین کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے غیر افسانوی نثر کو ریفریشر کورس کے بنیادی موضوع کے طور پر منتخب کیا۔ ریفریشر کورس کے شرکا میں سے ڈاکٹر یشپال شرما، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمان خصوصی پروفیسر قدوائی کے جامعہ سے گہرے تعلق کا ذکر کیا اور ریفریشر کورس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ کورس کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شہپر رسول نے اکیس دنوں کی تمام تر مصروفیات کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس موقعے پر بہار، دہلی، جموں و کشمیر، جارکھنڈ، مہاراشٹر اور تلنگانہ کے 21 اساتذہ کورس کے شرکا کے طور پر مسلسل موجود رہے اور ملک کے تقریباً چالیس اہم اردو اسکالرز مثلاً پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر محمد ذاکر وغیرہ نے غیر افسانوی نثر سے متعلق اصناف، نظریات، شخصیات اور مختلف اہم کتابوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر عذرا خورشید نے نظامت کی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 ستمبر 2014

اردو مشترکہ تہذیب پر توسیعی خطبہ

نئی دہلی: اردو زندہ و جاوید زبان ہے، اردو پر جمود کی کیفیت کبھی بھی طاری نہیں ہوئی۔ اردو عالمی زبانوں میں شمار کی جا رہی ہے۔ اردو اپنے تلفظ، املا وغیرہ کی کثرت کے سبب دنیا کی کئی اہم زبانوں پر فوقیت لے جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام 'اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب' کے عنوان سے توسیعی خطبہ کے دوران ابن سینا اکادمی علی گڑھ کے بانی پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن نے کیا۔ توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کسی بھی خاندان یا معاشرے میں پہلے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، تبھی ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ زندہ قومیں اپنی تہذیب اور وراثت کو محفوظ رکھتے ہوئے چلتی ہیں۔ اردو کی ہم آہنگی کا ہی نتیجہ ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے، جس میں تمام زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ اردو صحافت تاریخ آزادی کا اہم حصہ ہے، جس کے ذکر کے بغیر تحریکِ آزادی کا قصہ مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس توسیعی خطبے کی صدارت سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ جناب حسیب احمد نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ آج کا دن کئی اعتبار سے یادگار ہے کیونکہ اہم شخصیات موجود ہیں جو خاموشی سے مطالعہ کر کے اردو کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ حکیم ظل الرحمٰن محض حکیم ہی نہیں بلکہ ان کا مشاہدہ بھی کافی وسیع ہے۔ اپنے تعارفی کلمات میں سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ ظل الرحمٰن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اردو مکمل طور پر نظام طب ہے، جس میں تمام سرمایہ اردو میں ہی دستیاب ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر حسیب احمد نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ آج کا توسیعی خطبہ کافی عمیق تھا، جس میں تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 ستمبر 2014

جامعہ میں ٹیگور توسیعی خطبے کے دوران اسٹیج پر پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر محمد سلطان بھٹ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مشیر الحسن اور پروفیسر شہزاد انجم

جامعہ میں ٹیگور توسیعی خطبے کا اہتمام

نئی دھلی: ٹیگور کی کہانیوں میں بنگال کے مسلمانوں کی ثقافت موجود نہیں ہے۔ ایک تخلیق کار غریبوں اور مقامی لوگوں کے مسائل کو کیونکر نظرانداز کرسکتا ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز تاریخ داں پروفیسر مشیر الحسن سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعبۂ اردو، جامعہ کی ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیر اہتمام منعقدا اپنے خطبے میں کیا۔ انھوں نے 'گاندھی، ٹیگور اور اسلام' موضوع پر جامعہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایڈورڈ سعید نے مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی کے حوالے سے پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ گاندھی کا نظریہ اسلام کے حوالے سے مختلف تھا۔ وہ اسلام کی تعظیم کرتے تھے اور روزمرہ کی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کے شدید خواہشمند تھے۔ گاندھی جی اسلام کو امن کا مذہب قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہمالیہ کی گود میں رہتے ہیں۔ سبھی مذاہب کے لوگوں کو مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنا چاہیے۔ ٹیگور اور گاندھی کا شمار اس عہد کے عظیم اذہان میں ہوتا ہے۔ اس موقعے پر بطورِ مہمان اعزازی پروفیسر محمد سلطان بھٹ نے کہا کہ ٹیگور اور اقبال دو عظیم دانشور ہیں۔ ٹیگور نے دیہی ترقی پر خاصا زور دیا۔

توسیعی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اس وقت مشیر الحسن ہندوستانی ثقافت کے سب سے بڑے محافظ ہیں۔ انیسویں صدی ایک ایسی صدی ہے جسے یاد کرنا اور بھلانا دونوں آسان نہیں ہے۔ شمیم حنفی نے کہا کہ مشیر صاحب نے بے حد متوازن انداز میں فکرانگیز اور غیرمعمولی لیکچر پیش کیا ہے۔ ٹیگور اور گاندھی ہمارے اندر شدید ردعمل پیدا کرتے ہیں۔ ہم اس سے آنکھیں نہیں پھیر سکتے۔ ٹیگور انفرادی تشخص کے خلاف تھے مگر ان کی چند باتیں ہمیں حیران کرتی ہیں۔ اس موقعے پر مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ جامعہ کی دانشوری کی روایت قابل فخر ہے۔ اس روایت کی ایک اہم کڑی پروفیسر مشیر الحسن ہیں جو پوری دنیا میں ایک مورخ اور مفکر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ اس موقعے پر پروجیکٹ کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے توسیعی خطبے کی نظامت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 ستمبر 2014

جامعہ میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن کی تیسری قومی مشاورتی میٹنگ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علمی وادبی تاریخ نہایت شاندار رہی ہے۔ یہ ادارہ اپنے قیام کے بعد سے ہی عالموں، ادیبوں اور دانشوروں کا گہوارہ رہا ہے۔ ترجمے کے میدان میں اس ادارے کی خدمات بیش بہا رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کی تیسری قومی مشاورتی کمیٹی میٹنگ میں کیا گیا۔ اس میٹنگ کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر عبدالصمد (پٹنہ)، پروفیسر محمد ظفرالدین (حیدرآباد)، جناب شمیم طارق (ممبئی)، پروفیسر آفاق احمد (بھوپال)، پروفیسر سلیمان خورشید (کلکتہ)، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر انیس الرحمٰن، پروفیسر گووند پرشاد، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر ایس کاظم نقوی، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر مکیش رنجن، پروفیسر وہاج الدین علوی اور پروفیسر شہزاد انجم (دلی) نے شرکت کی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد نے فرمایا کہ ٹیگور پروجیکٹ کا کام قابل تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔ اجتماعی کام کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے پروجیکٹ اور شعبے کے پروگراموں میں نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ شامل کیا جائے۔ ریسرچ اسکالرز کو بھی مواقع فراہم کیے جائیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ جامعہ کے اس پروجیکٹ نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ اس پروجیکٹ میں زبان کے ماہرین اور مستند مترجمین کو مدعو کیا گیا جن کی مدد سے ان کتابوں کے تراجم کیے گئے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس پروجیکٹ میں ریسرچ اسکالرز کی جیسی تربیت ہوئی اور ان کی جیسی شمولیت ہوئی اور اسکالرز نے جو نقش مرتب کیے ہیں وہ یادگار ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شہزاد انجم نے اس پروجیکٹ کی مفصل رپورٹ پیش کی۔

پریس ریلیز، شہزاد انجم، پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 24 ستمبر 2014

عصرِ حاضر میں اردو کی صورتِ حال

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوی ایشن شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرہ 'عصر حاضر میں اردو کی صورتِ حال' پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابنِ کنول نے کہا کہ ایک صدی قبل بھی لوگ اُردو کی بقا کے لیے فکرمند تھے اور آج بھی ہیں۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ رہے گی، اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے۔ لیکن زبان کی زندگی کا انحصار زبان سے محبت کرنے والوں پر منحصر ہے۔ مہمانِ اعزازی اور انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے صدر محمد احمد شیون نے کہا کہ اردو تعلیم کا انتظام نہ صرف اترپردیش بلکہ پورے ملک میں یونیورسٹی سطح پر تو ہے لیکن پرائمری سطح پر صورت حال تشویش ناک ہے، انھوں نے کہا کہ پرائمری سطح کی اردو تعلیم کے بغیر اردو کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال صدیقی نے کہا کہ اُردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اُردو کا شاندار ماضی ہے۔ جلسہ کے کنویز پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ اردو والوں کو اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہم خود اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط کا استعمال کررہے ہیں۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ محبانِ اردو کے لیے ہمت افزا فیصلہ ہے اس فیصلے سے اردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایسوی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری اکرام وارث نے مہمانوں کا خیر مقدم

حکیم عبدالحمید کی یاد میں سیمینار کے دوران اسٹیج پر ڈاکٹر اسعد معید، ڈاکٹر شمعون، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، متین امروہوی اور ڈاکٹر خالد صدیقی

کیا اور موضوع کی مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری محمد سلمان نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 21 ستمبر 2014

حکیم عبدالحمید کی یاد میں سیمینار

نئی دہلی: ملت کا بے پناہ درد رکھنے والے ماہر تعلیم اور ماہر طب حکیم عبدالحمید کی یاد میں غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ان کی عظیم خدمات کو یاد کیا گیا۔ پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے ان کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حکیم عبدالحمید جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر قمر الحسن نے ان کی تعلیمی خدمات کے حوالے سے بھرپور روشنی ڈالی اور جامعہ ہمدرد کے قیام کی تاریخ بیان کی۔ ڈاکٹر اشہر قدیر اور ڈاکٹر محمد اکرم نے اپنی تقریر میں طبی خدمات کے حوالے سے حکیم عبدالحمید کی شخصیت کو اجاگر کیا۔ اس تقریب کے اہتمام میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے اہم رول ادا کیا۔ جلسے کی صدارت مشہور اسکالر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے کی۔ انھوں نے حکیم عبدالحمید کی شخصیت پر ایک طویل مدت تک تحقیق کی اور انتہائی قابل قدر دستاویز مرتب کی۔ اس موقعے پر ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 ستمبر 2014

اگنو بی ایڈ کورس کو اردو میں پڑھانے کا مطالبہ

نئی دہلی: اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو)

IGNOU

دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہی ٹیچر ٹریننگ کورس بی ایڈ (ڈسٹینس موڈ) کے لیے ملک بھر میں 347 اسٹڈی سینٹر چلا رہا ہے، لیکن کسی بھی سینٹر پر طلبہ کو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کا متبادل مہیا نہیں کرایا گیا ہے جبکہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ تامل میں بھی اس کورس کو پڑھایا جا رہا ہے۔ اگنو کے وائس چانسلر سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس جانب توجہ دیتے ہوئے کچھ ریاستوں کے طلبہ کو اردو کا متبادل فراہم کیا جائے۔ تعلیمی کاز کے لیے سرگرم نوائے حق ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر اسد غازی نے اگنو کے وائس چانسلر پروفیسر ایم اسلم اور قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام الدین کو مکتوب بھیج کر اس جانب ان کی توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ اگنو ملک بھر میں بی ایڈ (فاصلاتی نظام) کے 347 اسٹڈی سینٹر چلایا جا رہا ہے۔ ہر سینٹر پر 100 سیٹیں ہیں۔ اس طرح ملک بھر میں کل 34700 سیٹیں ہیں۔ ان تمام ہی سینٹروں پر ہندی اور انگریزی میں کورس پڑھایا جا رہا ہے جبکہ تامل ناڈو میں طلبا کو یہ کورس تامل میں پڑھنے کا متبادل بھی فراہم کرایا گیا ہے۔ اسد غازی کا کہنا ہے کہ 2001 کی مردم شماری کے مطابق مختلف ریاستوں کے 5 کروڑ، 15 لاکھ، 36 ہزار 111 افراد نے اردو کو اپنی مادری زبان کے طور پر اندراج کرایا تھا جبکہ دیگر ڈاٹا کے مطابق یہ تعداد 6 کروڑ 54 لاکھ 50 ہزار 86 افراد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر اگنو کو کم سے کم ان ریاستوں میں جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے، وہاں اس کورس کے طلبہ کو اردو میں بھی پڑھائی کرنے کا متبادل فراہم کرایا جانا چاہیے اور اس کے لیے ضروری اساتذہ کا کا انتظام بھی کرنا چاہیے۔ مرکزی وزارت اقلیتی امور کے تحت کمشنر فار لنگوئسٹک مائنارٹیز پروفیسر اختر الواسع نے اس تعلق سے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس مطالبہ کو جائز مانتے ہیں اور اس حق میں ہیں کہ اگنو کو بی ایڈ (فاصلاتی نظام) کورس ہی نہیں بلکہ ای ٹی ای کورس کو بھی اردو میں پڑھانا چاہیے اور یہ کام شروع کرنے میں اگنو کو کوئی تکلف بھی نہیں ہوگا کیونکہ اگنو نے کئی اردو کورس شروع کیے ہیں۔ پروفیسر واسع نے کہا کہ اس کے لیے نصاب اور نظام وضع کرنے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام نے روزنامہ راشٹریہ سہارا سے بات کرتے ہوئے اس تعلق سے کہا کہ اگنو کو چاہیے کہ جو لوگ اردو میں اس کورس کو کرنا چاہتے ہیں تو انھیں یہ سہولت فراہم کرائے اور اس کے لیے اردو میں نصاب اور اساتذہ بھی مہیا کرائے جائیں خواجہ اکرام نے کہا کہ جہاں تک قومی اردو کونسل کی بات ہے تو اگنو کو اس تعلق سے جو بھی تعاون درکار ہوگا ہم اس کے لیے تیار ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 27 ستمبر 2014

غالب کی یاد میں جلسے کا انعقاد

نئی دہلی: غالب کی شاعری میں ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تہذیبی اور ثقافتی فکر و خیال کا ذخیرہ موجود ہے، غالب نے جامہ اردو کو اپنے الفاظ کے لیے ناکافی سمجھتے

اسٹیج پر ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر ترنم ریاض، پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی اور فرحت احساس

ہوئے فارسی اور اردو کی مکس شاعری کے ذریعے اردو زبان کو ایک الگ دھارا دینے کی راہ نکالی۔ ان کی شاعری بیک وقت مثبت و منفی اور مختلف جہات پر نظر ہوتی ہے۔ جس نے غالب کو عظیم شاعر کے طور پر پیش کیا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پوئٹری سوسائٹی آف انڈیا غالب اکادمی اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے زیر اہتمام غالب کی یاد میں منعقدہ جلسے میں معروف شاعر فرحت احساس نے کیا۔ پروگرام کی صدارت کر رہی ڈاکٹر ترنم ریاض نے پروگرام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام مقررین کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے غالب کے خطوط کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر غالب کی شاعری نہ بھی ہوتی تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے خطوط ہی کافی تھے۔ اخیر میں ڈاکٹر ترنم ریاض نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2014

23ویں سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس

حیدر آباد: فارسی زبان پر ہندوستان میں جو کام ہوا وہ خود فارسی ممالک میں بھی نہیں ہوا۔ خصوصاً حیدر آباد دکن میں فارسی شعر و ادب کی کافی خدمت ہوئی۔ ہندوستان

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالرز سیمینار کا منظر

میں 1810 میں پہلا فارسی روزنامہ جاری ہوا۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں فارسی روزنامے مختلف مقامات سے جاری ہوئے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر غلام رضا انصاری، سفیر ایران، دہلی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ فارسی اور انجمن استادان فارسی، ہند (اے آئی پی ٹی اے) کے زیر اہتمام 33ویں سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ کانفرنس کا موضوع 'حیدرآباد دکن میں فارسی زبان و ادب' ہے۔ پروفیسر محمد میاں، شیخ الجامعہ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر غلام رضا انصاری نے اپنے فارسی خطاب میں کہا کہ ہندوستانی شعرا بطور خاص بیدل، امیر خسرو، علامہ اقبال نے جو معیاری کلام فارسی میں کیا ہے، اسے فارسی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ فارسی لغات بھی ایران سے زیادہ ہندوستان میں شائع ہوئیں۔ علی اکبر نیرومند، پی آر او، قونصل خانہ ایران، حیدرآباد نے ان کی تقریر کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ، وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے افتتاحی خطاب بحیثیت مہمانانِ خصوصی میں کہا کہ میری والدہ کی زبان فارسی ہے۔ جب میرے والدین فارسی میں بات کرتے تو مجھے موسیقی کا گمان ہوتا۔ اس سے فارسی زبان کی چاشنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کیمپس کی تعریف کی۔ علی فولادی، کلچرل کونسلر، ایران، دہلی نے اپنے خطاب میں ہندوستان میں فارسی کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مغلوں نے فارسی کو فروغ دیا اور اکبر کے دربار میں فارسی عالم موجود تھے۔ جہانگیر خود بھی فارسی کا عالم تھا اور اس نے فارسی میں کتابیں لکھیں۔ پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ زبانیں لوگوں کو جوڑتی ہیں۔ فارسی چونکہ دل و محبت کی زبان ہے اسی لیے یہ دلوں کو جوڑنے میں کچھ آگے ہی ہے۔ اسی طرح اردو بھی عشق و محبت کی زبان ہے۔ اردو ایک سیکولر اور انسانیت کی زبان ہے۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی، صدر اے آئی پی ٹی اے نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد ہندو-مسلم اتحاد کے خواہشمند تھے۔ غبارِ خاطر کے مختلف خطوط سے ان کی یہ خواہش نمایاں ہوجاتی ہے کہ کس طرح انھوں نے مسلسل مختلف لوگوں کو ہندو-مسلم اتحاد کے متعلق خطوط لکھے۔ انھوں نے کہا کہ دکن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو کے پہلے شاعر کا تعلق یہیں سے ہے۔ پروفیسر اختر مہدی، جوائنٹ سکریٹری اے آئی پی ٹی اے نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔

● مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ فارسی اور انجمن استادان فارسی کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا 21 ستمبر کو اختتام عمل میں آیا۔ اختتامی جلسہ کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، نائب شیخ الجامعہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں فارسی کو روزگار سے مربوط کرنے پر زور دیا۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر رحیم الدین کمال، ایڈیٹر روزنامہ انڈین ہورائزن نے کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر منتظمین کو مبارکباد دی اور اس طرح کے کانفرنسوں کو فارسی کے لیے خوش آئند قرار دیا۔ اس موقع پر جناب علی محمد موذنی، صدر شعبۂ فارسی تہران یونیورسٹی (ایران)، پروفیسر طاہر علی سرپرست انجمن استادانِ فارسی، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، صدر انجمن، پروفیسر اختر مہدی، جوائنٹ سکریٹری، انجمن، نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔ مہمان اساتذہ میں پروفیسر عارف ایوبی، لکھنؤ اور پروفیسر مظہر صدیقی، ممبئی نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ آخر میں پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مانو و آرگنائزنگ سکریٹری نے شکریہ ادا کیا۔ یہ کانفرنس 19 تا 21 ستمبر 2014 منعقد ہوئے۔ جس میں ملک طول و عرض سے آئے فارسی ادب کے دانشوروں اور اساتذہ نے اپنے پرمغز مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 20 ستمبر 2014؛ پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر مانو، 23 ستمبر 2014

دھلی :

دہلی یونیورسٹی میں محفل طنز ومزاح

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام خواجہ احمد فاروقی میموریل لائبریری میں منعقدہ محفل 'طنز ومزاح' میں عصر حاضر کے معروف طنز ومزاح گو شاعر اسرار جامعی اور راشٹریہ سہارا اردو کے سینئر صحافی اسد رضا، ڈاکٹر مظہر احمد اور ڈاکٹر احمد امتیاز نے اپنی تخلیقات سے طلبہ و طالبات کو محظوظ کیا۔ پروگرام کی صدارت شعبہ کے سینئر استاد ڈاکٹر علی جاوید نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے طنز ومزاح کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ادب اور معاشرے میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسرار جامعی اور اسد رضا کی فنکارانہ صلاحیتوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر ذاکر حسین دہلی کالج کے استاد ڈاکٹر مظہر احمد نے اپنے مقالہ 'عہد حاضر اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری' میں طنز ومزاح کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ اسد رضا کے انشائیے کا موضوع 'ای۔ شاعر' تھا جس میں انھوں نے موجودہ دور کے مشاعرے اور شاعروں کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر احمد امتیاز نے طنز ومزاح کے حوالے سے اپنا انشائیہ بعنوان 'پروفیسر صاحب' پیش کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ طنز ومزاح ادب کی مخصوص صنف ہے جو ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ اخیر میں شعبہ کے استاد اور یونیورسٹی کے ڈپٹی پراکٹر ڈاکٹر محمد کاظم نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2014

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالرز سیمینار کا انعقاد

نئی دھلی: طلبہ کا تحقیقی دور بہت حساس ہوتا ہے جس میں تمام حقائق کو صداقت کے ساتھ پرکھ کر اپنی رائے قائم کرنی ہوتی ہے۔ کامیاب ریسرچ اسکالر کی ایک اپنی رائے ہونی چاہیے، ہر باتوں میں سوال تلاش کرنا چاہیے اور اس کی تہہ تک پہنچنا چاہیے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینئر استاد پروفیسر صغیر افراہیم نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پندرہ روزہ ریسرچ اسکالر سیمینار میں کیا۔ انھوں نے اسکالرس کو تحقیقی کاموں کے دوران آنے والی رکاوٹوں اور چیلنجز سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ جس موضوع پر تحقیق کررہے ہیں اس

اردو اکادمی دہلی میں توسیعی خطبے 'اردو کی عاشقانہ ومتصوفانہ شاعری' کا منظر

کے تمام گوشے آپ کے سامنے ہونے چاہییں۔ اس موقع پر انھوں نے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں طلبہ کی تحقیقی سرگرمیوں اور دلچسپیوں پر بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے علی گڑھ میں عملی تبادلہ خیال کے لیے آنے کی بھی دعوت دی۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے شعبہ کے صدر پروفیسر ابن کنول نے ریسرچ اسکالرس سیمینار کو ضروری بتاتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار ہمارے اندر تحقیقی محرکات پیدا کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ سیمینار طلبہ کے اندر خوداعتمادی، تفحص وتلاش کا جذبہ اوران کے جھجک کو ختم کرتا ہے۔ سیمینار کی صدارت ذاکر حسین کالج کے استاد ڈاکٹر خالد علوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوبکر عباد نے انجام دیے۔ اس موقع پر شعبہ کے ریسرچ اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اخیر میں شعبہ کے استاد اور دہلی یونیورسٹی کے ڈپٹی پراکٹر ڈاکٹر محمد کاظم نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 ستمبر 2014

اردو اکادمی دہلی میں توسیعی خطبے کا انعقاد

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیراہتمام 'اردو کی عاشقانہ ومتصوفانہ شاعری' کے حوالے سے توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ توسیعی خطبہ ممبئی سے آئے ممتاز ادیب، دانشور اور کالم نگار شمیم طارق نے دیا جبکہ صدارت پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند کی نے۔ خیرمقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ دہلی میں اردو کو زندہ جاوید رکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ شمیم طارق کی تصانیف پڑھ کر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس معیار کا کام کرنے والا غالباً ہمارے عہد میں نہیں ہے۔ ٹیگور اور تصوف کے حوالے سے بھی شمیم طارق کا کام معیاری اور جامع ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ شمیم طارق کا تعلق اس خطۂ زمین سے ہے، جہاں سے اہم شخصیات کا تعلق رہا ہے۔ اقبال نے جونپور کے حوالے سے پوری نظم تک قلم بند کرڈالی ہے۔ شمیم طارق نے توسیعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو میں عاشقانہ ومتصوفانہ شاعری بہت ہی دلچسپ موضوع ہے اور حساس بھی ہے۔ شاعری کی درجہ بندی مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس قدر عالمانہ، دانش ورانہ، فکرانگیز، خطبہ سماعت کیا گیا۔ شمیم طارق کا توسیعی خطبہ بہت ہی پرمغز تھا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 ستمبر 2014

پرہلاد سنگھ پنجابی پرموشن کونسل کے سرپرست نامزد

نئی دھلی: اردو زبان کی ادائیگی اور سننے میں جو لطف آتا ہے، وہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ یہ بات پنجابی پرموشن کونسل کا سرپرست بنائے جانے کے بعد دہلی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے سابق چیئرمین پرہلاد سنگھ چنڈوک نے پریس کانفرنس میں کہی۔ انھوں نے بتایا کہ جوسکون اردو زبان بول کر اور سن کر ملتا ہے، وہ دیگر کسی زبان میں نہیں ملتا۔ اردو زبان کے فروغ میں مشاعرہ کا اہم رول ہوتا ہے لیکن اب یہ مشاعرے بھی کم ہوتے جارہے ہیں۔ اس موقع پر پنجابی پرموشن کونسل کے صدر جسونت سنگھ بابی نے بتایا کہ ان کی تنظیم کافی لمبے عرصے سے پنجابی کے فروغ میں لگی ہے اور اب اردو کے بھی فروغ کے لیے کام کرے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 ستمبر 2014

جامعہ میں نئے طلباء کا استقبال

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز کے وسیع میدان میں شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اساتذہ وقدیم طلبا کی جانب سے نئے طلبا کا استقبال کیا گیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر علی فولادی، کلچرل کاؤنسلر سفارت جمہوریہ اسلامیہ ایران نے شرکت کی۔ مہمانان خصوصی ڈاکٹر علی فولادی نے اپنے خطاب میں کہا کہ مجھے آج شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آکر بہت مسرت ہوئی اور طلبا کی فعالیت کا اندازہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان ہندوستان کے لیے کوئی نئی زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان ہندوستانی تہذیب وتمدن کا حصہ ہے۔ صدر شعبہ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے طلبا کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ جب آپ اپنا وطن چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آئے ہیں تو آپ کو یہاں سے علم کی دولت سے سرفراز ہوکر جانا چاہیے۔ بزم دانش جویان کے مشیر ڈاکٹر عبدالحلیم نے بزم کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آخر میں نئے طلبا کو یادگاری مومنٹو دے کر ان کا استقبال کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 ستمبر 2014

آندھرا پردیش:

محفل اقبال شناسی کا اہتمام

حیدرآباد: شہر حیدرآباد اردو شاعری، علم وفن اور تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ شہر ایک شاعر کی چاہت کا خوبصورت روپ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر یوسف

اعظمی نے کانفرنس ہال، جامع مسجد عالیہ میں محفل اقبال شناسی کی (767) ویں نشست کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ جناب سید رؤف الدین حسین نے مقرر اور عنوان سے متعلق تعارفی کلمات کہے۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی نے اپنے شعری مجموعے 'شہر صبا' سے ایک نظم 'چراغوں کا نگر' پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ شہر ایک شاعر کی چاہت کا سنسار ہے۔ اس میں حسنِ یوسف فروزاں ہے۔ یہ علم فن اور آگہی کا اک جہان ہے۔ انھوں نے نظام ہفتم کے انتقال پر بی بی سی لندن کے تجزیہ کا حوالہ دیا کہ یہ مغل سلطنت اور تہذیب کا آخری سرا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد سے اقبال کے مراسم رہے ہیں۔ کشن پرشاد فقیر منش وزیراعظم سے خط وکتابت اس حقیقت کا ثبوت ہے۔ اقبال نے میر عثمان علی خاں آصف سابع سے

ملاقات کی۔ شاعر مشرق کی خواہش پر انھیں ایک ہیرا بتایا گیا۔ اقبال ہیرے میں خدا کے نور کا جلوہ اور عکس محسوس کرتے تھے۔ دکن میں اقبال نے دو انگریزی خطبات بھی دیے جو ان کی غیر معمولی اہم کتاب Reconstruction Religious Thoughts in Islam کا حصہ ہیں۔ کنوینر محفل جناب غلام یزدانی نے پروفیسر یوسف اعظمی کی محفل اقبال شناسی سے دیرینہ وابستگی اور نت نئے عنوان کے خطابات سے گرمانے کو سراہا۔ مقرر کی دعا پر محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن'، حیدرآباد، 16 ستمبر 2014

اتر پردیش:

جگر مرادآبادی حیات وخدمات

لکھنؤ: جگر مرادآبادی اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ غالب و مومن کے بعد شروع ہونے والے دور میں اردو شاعری میں روایتی غزل گوئی جس کی بنیاد

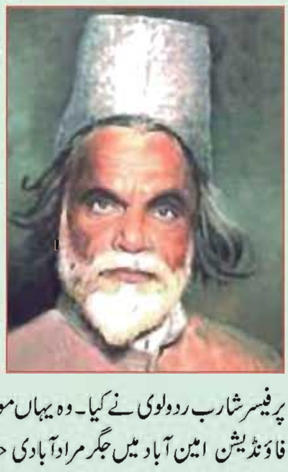

فارسی تغزل، نزاکت خیال اور معاملہ بندی پر تھی جگر اور حسرت پر ختم ہو گئی۔ ان خیالات کا اظہار اردو تنقید کے اہم ستون پرفیسر شارب ردولوی نے کیا۔ وہ یہاں مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن امین آباد میں جگر مرادآبادی حیات و خدمات موضوع پر ہونے والے سیمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرر ہے تھے۔ پرفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ جگر کے بارے میں میرے استاذ مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے خیالات بہت پرامید نہیں تھے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ جگر جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو سامعین کی طرف سے داد و تحسین کا غلغلہ بلند ہوتا تھا۔ لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جگر حکایت روزگار کو بھی حکایت حسن کے پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ جوہر فاؤنڈیشن کے بانی جنرل سکریٹری محمد وصی صدیقی کی سر پرستی میں ہونے والے پروگرام کا آغاز تلاوت کلام ربانی سے ناظم سیمینار ڈاکٹر ہارون رشید نے کیا۔ پروگرام کے کنوینر قمر گونڈوی نے جگر مرادآبادی سے اپنے تعلقات کا ذکر

انعامات سے نوازے جانے کی تصویر

کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ان سے ایک روحانی تعلق ہے۔ پروگرام کے دوسرے دور میں ڈاکٹر معراج ساحل کی صدارت اور ڈاکٹر ہارون رشید کی نظامت میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مدعو شعرا نے جگر کے مصرعوں پر اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ہارون رشید، لکھنؤ، 6 ستمبر 2014

205 طلبہ کو لیپ ٹاپ اور انعامات

لکھنؤ: یوپی بورڈ کے ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ امتحان 2014 میں ضلعی سطح پر اردو مضمون میں ٹاپ کرنے والے طلبہ طالبات کو یوپی اردو اکادمی کی تقریب میں وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے لیپ ٹاپ نقد انعام، کتابیں اور توصیفی سند دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ ریاست میں پہلی بار ہونے والی اس طرح کی تقریب میں مختلف اضلاع سے کثیر تعداد میں طلبہ اور ان کے اساتذہ شریک ہوئے۔ کل ملا کر 205 طلبہ کو لیپ ٹاپ اور انعامات دیے گئے۔ ہائی اسکول کے طلبہ کو چار ہزار روپے کا چیک، انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کو پانچ ہزار روپے کا چیک، اعزازی سند اور ایک ہزار روپے کی کتابیں پیش کی گئیں۔ وزیر اعلیٰ نے اس کے علاوہ اردو اکادمی کی امداد کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے میں سے 75 لاکھ روپے کی قسط جاری کی۔ تقریب کی صدارت اقلیتی بہبود کے وزیر محمد اعظم خاں نے کی۔ وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے اپنے خطاب میں کہا کہ سماجوادی حکومت ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ جو بھی ضرورتیں ہوں گی انھیں پورا کیا جائے گا اور کہیں بھی سوتیلا برتاؤ نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ سنسکرت، ہندی اور اردو لوگ پڑھیں گے تو آپس میں جڑیں گے، اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 ستمبر 2014

الٰہ آباد میں بیادگار میرا اعزازی پروگرام کا انعقاد

الہ آباد: 'میرا فاؤنڈیشن ساہتیہ بھنڈار' کی جانب سے سول لائن میں واقع این سی زیڈ سی سی میں بیادگار میرا اعزازی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ''ہندی اردو سروکار میں ادبی ساجھے داری کے موضوع پر پروفیسر راجیند رکمار نے کہا کہ اردو اور ہندی کے اٹوٹ رشتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بھلا زبان کے نام پر بٹ جانے کا فائدہ کس کو ہوسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہاں الہ آباد بھی ہے اور پریاگ بھی یہ گنگا اور جمنی تہذیب کے آپسی میل جول کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا ہندی اردو کی ساجھے داری صدیوں سے ملی جلی مشترکہ تہذیب رہی ہے۔ اردو کے بیشتر شاعروں نے اپنے کلام کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے آتش، میر، یگانہ، جاں نثار اختر کے علاوہ متعدد شعرا کے اشعار سنائے اور ہندی اردو کے کمپوزٹ کلچر کی بات کی۔ پروفیسر ارون کمار نے کہا کہ ہندی اور اردو کی ساجھے داری سے جمہوریت کا آغاز ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ملک کی جمہوریت کی بنیاد کو مضبوط کرنا ہے تو ہندی اور اردو کو ساتھ لے کر ہی چلنا ہوگا۔ خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک پروفیسر دودھ ناتھ سنگھ نے کہا کہ ہم سب کی ملی جلی قومیت ہے اردو جو آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زبان ہوتی جارہی ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ ہندی اردو میں تضاد کی دیوار کھڑی ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں اس دیوار کو الگ کرنا ہوگا۔ اس پروگرام میں 'پریتی پرون کھرے کی 'یہ بھارت رتن' ششا نک کی 'کمند' جگن ناتھ پاٹھک کی 'پتر لیکھا کے پتر' ڈاکٹر آشا گپتا کی 'اپنے سے بولتی' ڈاکٹر راسٹر بندھو کی اسی نووے پورے سو' گیان پرکاش کی کہانیاں کے علاوہ متعدد کتابوں کا رسم اجرا کیا گیا اور مصنّفین کو اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2014

علی گڑھ میں اسپیشل سمر کورس کا اہتمام

علی گڑھ: حکومتِ ہند کے نیشنل کمشنر فار لنگوسٹک ماینارٹیز پروفیسر اختر الواسع علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یو.جی.سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیر اہتمام منعقدہ اسپیشل

'خواجہ احمد عباس ایک عظیم فنکار' سیمینار کا منظر

سمر اسکول (کمپیوٹر ایپلیکیشن)، عربی، فارسی و اردو اور اینوائرمینٹل اسٹڈیز کے سبجیکٹ ریفریشر کورس کی اختتامی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ انھوں نے شرکا سے اپیل کی کہ وہ ماحولیاتی تحفظ میں اپنا تعاون پیش کریں تاکہ ہم ماحولیاتی آلودگیوں سے پاک مستقبل کی تشکیل کرسکیں۔ پروگرام کے اعزازی مہمان زیڈ ایچ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی کے سابق پرنسپل پروفیسر رضاء اللہ خان نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کو سماجی، ادبی اور تعلیمی میدان میں اپنی ذمے داریوں کو مثبت طریقے سے انجام دینا چاہیے۔ اس موقعے پر اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس یونیورسٹی نے ہمیشہ سیکولر اقدار کے فروغ کو اہمیت دی گئی ہے۔ مذکورہ پروگرام میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر شاہدہ فاروق اور ڈاکٹر ارشد حسین نے کورس کورڈینیٹر کی حیثیت سے اپنا تعاون پیش کیا۔ کورس کے شرکا آگرہ کے ڈاکٹر سندیپ پال، مالیگاؤں کی ڈاکٹر انصاری فہمیدہ اور رامپور کی ڈاکٹر سیما تیوتیا نے اسے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر اکیڈمک اسٹاف کالج کی ڈاکٹر ایس ریشما جمال نے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے جبکہ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 ستمبر 2014

لکھنؤ میں یوم جوہر کا انعقاد

لکھنؤ: یوم جوہر کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبائے قدیم اترپردیش کی جانب سے لکھنؤ کے اندرا گاندھی پرتشٹھان میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس

پروگرام کے مہمان خصوصی اترپردیش کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے اس موقعے پر قدیم طلبائے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر نے ملک کے لیے وہ خدمات انجام دی ہیں جنھیں فراموش کرنا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ پروگرام کے منتظم اور یوپی حکومت میں پنچایتی راج کے وزیر مملکت کمال اختر نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہمیں یہ تربیت ملی ہے کہ انتہا پسندی کو ختم کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنا ہمارا اولین فریضہ ہے۔ پروگرام کی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہوئے جامعہ برادری اترپردیش کے صدر انجم اصغر نے جامعہ کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کے منصوبوں کے بارے میں بتایا۔ طلبا یونین کے سابق صدر بدرالدین قریشی نے کہا کہ جامعہ وہ ادارہ ہے جہاں قرآن اور گیتا دونوں پڑھائی جاتی ہیں۔ طلبا یونین کے سابق صدر نے جامعہ کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کی روایت رہی کہ اس نے ہندو مسلم اتحاد کا ہمیشہ درس دیا ہے۔ اس موقعے پر ریڈیو مرچی کے نوید، آئی ایس محمد شاہد، اور کئی آئی پی ایس سمیت 20 افراد کو ستارۂ جامعہ سے نوازا گیا، اور وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں ایک ویب سائٹ بھی لانچ کی گئی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 3 اکتوبر 2014

صولت پبلک لائبریری کا 80 واں یوم تاسیس

رام پور: صولت پبلک لائبریری کے 80 ویں یوم تاسیس کے موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد سمبا گسس پبلک اسکول میں کیا گیا، جس کی صدارت رامپور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ ساجد (علیگ) ماہر قانون و آئین ہند موجود تھیں۔ تقریب کا آغاز قاری فہیم الدین نے تلاوت کلام الٰہی سے کیا اور نعت پاک کا نذرانہ سید افتخار طاہر نے پیش کیا۔ اس پروقار تقریب میں اردو زبان و ادب وعلوم وفنون کے مختلف شعبوں میں دانشوروں کی گراں قدر نمایاں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے استقبالیہ دیا گیا۔ صولت پبلک لائبریری کے صدر س ش عالم نے کہا کہ میرے لیے یہ خوشی کا موقع ہے کہ جب شہر کی معروف ہستیاں لائبریری کی دعوت پر تشریف فرما ہیں۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں مہمان خصوصی ڈاکٹر رخشندہ ساجد نے کہا کہ علم سیکھنے اور سکھانے کا ذکر اللہ رب العزت نے کلام پاک میں متعدد جگہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے کہا کہ رامپور میں موجود یہ دونوں لائبریریاں مسلمانوں کی زندگی کا حصہ ہیں۔ ہمیں ان کی قدر کرتے ہوئے لائبریریوں کی خدمات کے لیے آگے آنا چاہیے۔ اس موقعے پر مولانا محمد سلیمان خاں قاسمی، ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار، ڈاکٹر حسن احمد نظامی، ڈاکٹر شوق اثری، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ماسٹر امتیاز علی خاں، اظہر عنایتی اور محترمہ رافعہ شمسی کو ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزازات پیش کیے گئے۔ بعد ازاں مہمان خصوصی اور صدر محترم کے دست مبارک سے معروف شاعر لئیق خاں کوثر کا نثری مجموعہ عکس حنا اور مرحوم استاد زادے اظہر نعمانی کے مجموعہ کلام جیسے شاعر اداس بیٹھا ہے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 ستمبر 2014

بہار:

خواجہ احمد عباس ایک عظیم فنکار

پٹنہ: مورخہ 11 اکتوبر 2014 اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ، اشوک راج پتھ، نارتھ ویسٹ، گاندھی میدان، پٹنہ میں وزارت ثقافت حکومت ہند کے اشتراک سے 'خواجہ احمد عباس — ایک عظیم فنکار' کے عنوان سے ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا آغاز سہیوگ سوشل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ارشد ظفر خاں کے خیرمقدمی کلمات سے ہوا۔ پروفیسر عبدالصمد نے افتتاحی نشست کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اردو ادب کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مہمان ذی وقار شموئل احمد نے فعال سماجی تنظیم سہیوگ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اتنے کم عرصے میں اس تنظیم کی کارکردگی اردو ادب کے تئیں قابل ستائش ہے۔ سیمینار میں دوسرے مہمان ذی وقار پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے خیالات سامعین کے گوش گزار کیے جبکہ ڈاکٹر زویا زیدی نے کلیدی خطبہ پڑھا۔ انھوں نے اپنے

خطبے میں کہا کہ آج کے بحرانی دور میں خواجہ احمد عباس کو از سر نو یاد کرنا نہایت معنی خیز بات ہے۔

افتتاحی سیشن کے بعد پروگرام کا آغاز ہوا، پہلی نشست کی صدارت مشہور فکشن نگار شوکت حیات نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر سید رضا، ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین، محمد فیروز انصاری، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر مشتاق صدف نے مقالے پیش کیے۔ دوسری نشست میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر ساجد حسین نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر شاہد جمیل نے اس سیشن کی صدارت کی۔ سیمینار کے تیسرے اور آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر سید احمد قادری نے کی۔ آخری سیشن میں مقالہ نگاروں کی حیثیت سے ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر کلیم الرحمٰن، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر شمیم قاسمی، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے شرکت کی۔ اس نشست میں پڑھے گئے مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد قادری نے کہا کہ سبھی مقالوں میں خواجہ احمد عباس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے خواجہ احمد عباس کو دور اندیش اور اپنے وقت کی سماجی برائیوں کے خلاف سب سے بڑا مجاہد بتایا۔ اظہار تشکر مہناز پروین نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، سہیوگ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، پٹنہ، 13 اکتوبر 2014

تلنگانہ:

مانو میں یومِ اساتذہ لکچر کا اہتمام

حیدر آباد: اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کی زبان ہے۔ میرے دادا نے اردو اور فارسی میں وکالت کی اور جج کے اہم عہدے کی ذمہ داری نبھائی۔ میرے والد بھی بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار کونڈا ویشویشور ریڈی، رکن پارلیمان، چیوڑلہ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یومِ اساتذہ کے موقعے پر لکچر دیتے ہوئے کیا۔ پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ ویشویشور ریڈی نے اپنا سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ اردو اور حیدر آباد کے کلچر کو لے کر کافی سنجیدہ ہیں اور اس سلسلے میں کئی منصوبوں پر بہت جلد عمل کیا جائے گا۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ نئی ریاست میں اردو کو اس کا مستحق مقام ضرور ملے گا۔ پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مسلسل بدلتے حالات کا اور نئی معلومات کا علم اساتذہ کو ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے طلبہ کو حالات کے مطابق تعلیم دے سکیں۔ انھوں نے بطور خاص e-learning صلاحیتوں پر زور دیا اور کہا کہ آج کے دور میں کسی معاملے کو جاننے کے لیے لائبریری جانے کی ضرورت نہیں بلکہ انٹرنیٹ پر بیٹھ کر اسے بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو یونیورسٹی دوسری اور آخری یونیورسٹی ہے جس کا دائرہ عمل پورا ملک ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، پرووائس چانسلر نے خیر مقدم کیا اور مہمان کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سروپلی رادھا کرشنن نے جو ہندوستانی فلسفہ ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اسے سنہری حروف میں لکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار نے شکریہ ادا کیا۔ عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 ستمبر 2014

مانو میں ڈاکٹر اشرف جائسی کا خطاب

حیدر آباد: ''قوموں کے عروج و ترقی کی اصل بنیاد علمی تحقیق و جستجو ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے اس حقیقت کے ادراک کے ساتھ اپنی پوری قوت اس میں لگادی۔'' یہ بات ڈاکٹر علیم اشرف جائسی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہی۔ ''علمی تحقیق :اہمیت اور تاریخی ارتقا: اسلامیات کے حوالے سے'' کے موضوع پر ڈاکٹر جائسی نے اپنے خطاب میں مزید کہا کہ ''تحقیق علمی کے محض فکر و خیال پر مبنی استنباطی منہج کے بجائے مشاہدہ اور تجربے پر مبنی استقرائی منہج سے دنیا کو روشناس کرانے والے مسلمان ہیں۔ سائنسی تحقیقات و ایجادات اسی کی رہین منت ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے آگے چل کر اس منہج کو ترک کردیا۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اس کھوئے ہوئے ورثہ کے دوبارہ حصول کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ بھی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں آسکیں۔'' پروگرام کے اخیر میں شعبہ کے صدر ڈاکٹر فہیم اختر ندوی نے مہمان کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر مانو، 23 ستمبر 2014

راجستھان:

اردو اساتذہ کا پانچ روزہ تربیتی کورس

ادے پور: کسی زبان کے اساتذہ اس زبان کے سفیر ہوتے ہیں۔ وہ زبان کی جملہ خصوصیات کو اپنے شاگردوں تک پہنچاتے ہیں اور یہ شاگرد آنے والے بہتر کل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اردو کے اساتذہ کو بھی یہ فریضہ انجام دینا ہوگا۔ ہماری ذمے داری اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اردو اتحاد یکجہتی اور محبتوں کے اظہار کی زبان ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ملکی اتحاد کی ضامن اس زبان کو تابندہ رکھنے کے لیے سرگرم رہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی ادے پور میں صدر شعبہ اردو پروفیسر فاروق بخشی نے کیا۔ پروفیسر موصوف اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اور ٹریننگ کی جانب سے منعقدہ اردو اساتذہ کے پانچ روزہ تربیتی کورس کے شرکا سے خطاب کررہے تھے۔ اجلاس کے آغاز میں کورس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر شیرانی نے اس پانچ روزہ تربیتی کورس کی اہمیت و افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس ادارے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر گوئل نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم سبھی راجستھان میں اردو زبان کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کریں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 ستمبر 2014

کرناٹک:

بیدر میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد

بیدر: ہمہ لسانی قومی یکجہتی کل ہند مشاعرے کا انعقاد شاہین ادارہ جات بیدر، کنڑا ساہتیہ پریشد اور شوبھا کلے، رقص اور ثقافت ٹرسٹ والدوڈی کے زیر اہتمام رنگ مندر بیدر میں ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر این دھرم سنگھ سابق وزیر اعلیٰ کرناٹک کی تقریر سے عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس کل ہند مشاعرے میں ہندوستان کے جانے مانے شاعر منور رانا کے علاوہ مراٹھی اور کنڑا و ہندی کے جتنے شاعر ہیں ان تمام کا استقبال کرتا ہوں۔ بیدر سرحدی پسماندہ علاقہ ہے۔ پھر بھی یہاں اردو کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے کیونکہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ میں جب وزیر اعلیٰ تھا تب میں

نے اردو کی ترقی کے لیے کافی کوشش کی تھی۔ قدیر صاحب جو شاہین اسکول کے ذریعے قابل ستائش کام کر رہے ہیں اور عبدالمنان سیٹھ جو اس ادارہ کے صدر ہیں میں ان تمام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج انھوں نے یہاں ہمہ لسانی قومی یکجہتی مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے میں اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کے اہم شعرا نے شرکت کر اپنے کلام سے ملک کے طول وعرض سے آئے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس ہمہ لسانی مشاعرے کی نظامت کے فرائض حیدرآباد کے معروف شاعر اور پھلواری کے ایڈیٹر جناب سردار سلیم نے انجام دیے۔ مشاعرے کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت خوانی سے ہوا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر لاری آزاد، اور ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر پی سی جعفر تھے۔

روزنامہ ’سیاسی تقدیر‘ دہلی، 9 ستمبر 2014

بندہ نواز کی تعلیمات اور تصنیفات

گلبرگہ: حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے 610ویں عرس شریف کے موقعے پر سماع خانہ درگاہ حضرت بندہ نواز میں 14 ستمبر بروز اتوار بوقت دوپہر بندہ نواز کی تعلیمات اور تصنیفات اور موضوعات تصوف پر ایک کل ہند سیمینار کا بصدارت سید شاہ گیسو دراز حسینی خسرو سجادہ نشین بارگاہ بندہ نواز انعقاد عمل میں لایا گیا۔ ڈاکٹر سید شاہ گیسو دراز خسرو حسینی نے ابتدا میں مہمانان، مشائخین عظام، علماء کرام اور شرکا سیمینار کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ حضرت خواجہ بندنواز 80 برس کی عمر میں گلبرگہ تشریف لائے اور آپ یہاں 22 برس تک اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے رشد وہدایت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ نے 105 کتابیں لکھی ہیں۔ ممتاز دانشور ونقاد اور کرناٹک اردو اکادمی کے سابق صدر نشین وہاب عندلیب نے بعنوان ’حضرت خواجہ بندہ نواز کا دکنی کلام‘ مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹر مصطفیٰ شریف صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے بعنوان ’اصطلاح ملفوظ جمع ملفوظات کی تعریف اور افادیت و اہمیت‘ اپنا تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر مظفر شہ میری صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے بعنوان ’خلیق احمد نظامی کی تصنیف تاریخ مشائخ چشت کا تجزیہ حالات حاضرہ کی روشنی میں‘ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی نے حضرت بندہ نواز کی تصانیف خاتمہ شریف، جوامع الکلم اور آداب المریدین کی رسم اجرائی انجام دی۔ درگاہ حضرت بندہ نواز سے شائع ہونے والے رسالہ شہباز کے تازہ شمارہ کی رسم اجرائی بھی انجام دی گئی۔ فضل المتین چشتی گدی نشین درگاہ اجمیر شریف نے بھی اس موقعے پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے حضرت بندہ نواز کی تصوف سے متعلق تصنیفات وتعلیمات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ ’منصف‘ حیدرآباد، 16 ستمبر 2014

حضرت میر محمد شاہ لائبریری تقریب کے دوران مائک پر محترمہ صغریٰ بخاری، مزمل ولی اللہ، محمد شفیع مینہار، ڈاکٹر احسان شیخ، ڈاکٹر سدرشن آئینگر، صدر پروگرام جناب ڈاکٹر محمد حبیب کا کی والا، پروفیسر محی الدین بومبے والا، ڈاکٹر نثار احمد انصاری

گجرات:

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی تقریب

اردو زبان و ادب کے تعلق سے اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ بتاریخ 24 اگست 2014 بروز اتوار زیرصدارت ڈاکٹر محمد حبیب کا کی والا صاحب اور گجرات اردو اکادمی اور حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر کی جانب سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی کتابیں بیس سے زائد اداروں کو اردو کی قیمتی وادبی، تحقیقی، علمی اور مذہبی کتابیں تقسیم کی گئیں۔ اجلاس حضرت پیر محمدؒ شاہ کے وسیع کیمپس پر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سدرشن آئنگر صاحب وائس چانسلر گجرات ودیھاپیٹھ اور ڈاکٹر احسان شیخ سابق ڈائرکٹر گجرات لائبریری بورڈ نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ اس موقعے پر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی سابق ڈائرکٹر نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کی تصنیف Triumphalsun اور دیگر چھ کتابوں کی رونمائی ہوئی۔

لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد محی الدین والا صاحب نے سب کا خیر مقدم کیا اور بدلتے ہوئے میڈیا زمانے میں بھی پرنٹ میڈیا اور کتابوں کی مقبولیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر سورت، بڑودہ اور مقامی پروفیسروں کے علاوہ مدرسین و معلمین اور عمائدین شہر نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔

بذریعہ ڈاک، قادری عابد علی، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد، 2 اکتوبر 2014

مہاراشٹر:

’اردو کو مہاراشٹر کی دوسری سرکاری زبان بنانے پر زور‘

ممبئی: ریاست مہاراشٹر ملک کی واحد ریاست ہے جہاں سب سے زیادہ اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول ہیں۔ سب سے زیادہ شعرا وادبا اور اردو بولے والے بھی اسی ریاست میں موجود ہیں، اسی لیے ہماری کوشش ہوگی کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس نیک خواہش کا اظہار اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خان نے ممبئی میں کیا۔ ممبئی کے انجمن اسلام میں منعقدہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے سال 2013 کے جلسہ تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے نسیم خان نے مزید کہا کہ ریاست کی اردو اکادمی ملک کی سب سے فعال اکادمی بن چکی ہے نیز جب یہ قلمدان وزارت اقلیتی بہبود کے ماتحت آیا تو اس کا سالانہ بجٹ محض بیس لاکھ روپیہ تھا لیکن ان کی کوششوں اور وزیر اعلیٰ پرتھوی راج چوہان کی ذاتی دلچسپیوں کے نتیجے میں اردو اکادمی کا بجٹ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ ہو چکا ہے۔ ریاستی سرکاری زبان مراٹھی اور اردو کے تعلق سے بولتے ہوئے نسیم خان نے کہا کہ اردو اکادمی کی سرگرمیاں بہت ہیں اور اس زبان کے ذریعے مراٹھی زبان کو بھی قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان پیار ومحبت کی اور یکجہتی کی زبان ہے اور یہ نفرت کو مٹاتی ہے۔ اکادمی کے جوئنٹ سکریٹری فاروق انصاری نے کہا کہ مہاراشٹر اردو زبان و ادب کا گہوارہ ہے اور اردو اکادمی کے ذریعے اس زبان کو فروغ دیے جانے کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ فاروق انصاری نے مزید کہا کہ انعامات کی رقم کم ہے لہٰذا اسے دوگنا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اکادمی کے کارگزار صدر محمد خورشید صدیقی نے کہا کہ اردو اکادمی اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ کام کر رہی ہے اور پورے مہاراشٹر میں اردو اکادمی کی سرگرمیاں ہو رہی ہیں۔ تقریب کے آخر میں وزیر نسیم خان کے ہاتھوں صحافیوں، ادبا وشعرا کو ایوارڈ تقسیم کیا گیا۔ رسم شکریہ اکادمی کے رکن انوار اعظمی نے ادا کیے جب کہ پروگرام کو کامیاب بنانے میں اکادمی کے اراکین مقصود پٹیل، ایڈوکیٹ شاہد ندیم انصاری، عبدالرشید نشاط، افتخار احمد، ابوالحسن عاصی اور دیگر

نے نمایاں کردار ادا کیا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 ستمبر 2014

شولاپور میں تہنیتی جلسہ

شولاپور: شولاپور کے معروف قلم کار جواں سال ڈراما نگار ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار، شولاپور سوشل ایسوسی ایشن آرٹس اینڈ کامرس کالج شولاپور کے صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر

فائز ہونے کی خوشی میں اور آپ کی تعلیمی، سماجی، ادبی خدمات کے اعتراف میں سابق طلبہ کی جانب سے 5 ستمبر یوم اساتذہ کے موقعے پر بزمِ غالب میں شاندار تہنیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت شولاپور سوشل ایسوسی ایشن آرٹس اینڈ کامرس کالج کے پرنسپل، ڈاکٹر ایم۔ اے۔ دلال نے کی۔ بطور مہمانِ خصوصی یعقوب برکت اللہ (مالیگاؤں)، مہر فاؤنڈیشن دھولیہ کے صدر ڈاکٹر شبیر اقبال، سوشل اردو ہائی اسکول اور جونیر کالج آف سائنس کے پرنسپل، شیخ عبدالجبار، سوشل اردو پرائمری اسکول کے صدر مدرس معروف شاعر جناب آصف اقبال، عبدالرزاق رند، شریک تھے۔ جلسے میں شریک عمائدین شہر نے ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار کی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی اور کہا کہ ان کے دیکھ ریکھ میں شعبہ اردو کامیابی کی راہ طے کرے گی۔ اس تقریب کی نظامت پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید شیخ نے بحسن وخوبی کی اور مہمانوں کا تعارف طلبہ نے کیا۔ شکریہ سلطان اختر نے ادا کیا۔

بذریعہ ڈاک، سلطان اختر، شولاپور، مہاراشٹر، 15 ستمبر 2014

کانکی نارہ میں کنیا شری دیوس

کانکی نارہ: 14 اگست 2014 مضافات کلکتہ مانک پیر، کانکی نارہ میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیرنگرانی بہ اشتراک مانک پیر ویلفیئر سوسائٹی کوچنگ سنٹر (درجہ ہشتم تا دہم) میں کنیا شری دیوس (یوم دختران قوم) کا انعقاد کیا گیا۔ بچیوں نے تعلیم نسواں پر اردو اور انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ موجودہ تعلیمی نظام کی روشنی میں طلبہ نے ایک ڈرامہ پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ ڈرامے کا عنوان تھا ''میرا فیس واپس کریں۔''

ڈاکٹر معصوم شرقی کی صدارت میں مختلف مکتبۂ فکر

حمیدیہ کالج بھوپال میں دوروزہ سیمینار کا منظر

کے مقررین نے تعلیمی موضوعات اور سرگرمیوں کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کیے۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ذہین طالبات شفقت الماس، مہہ جبیں بانو اور نور جہاں پروین جنھوں نے بی ٹیک اور انجینئرنگ میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان بچیوں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو اکادمی کوچنگ سنٹر کے کوآرڈینیٹر جناب جلیل اقبال نے اپنی رپورٹ میں بچیوں کی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اکادمی کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔

آخر میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر معصوم شرقی نے بچیوں کو نصیحت کی کہ اس کے حوصلے بلند ہیں تبھی تو ناسا عد حالات میں بھی کامیابی کی طرف گامزن ہیں۔ حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اب کوئی بچہ علم حاصل کرنے میں مالی دشواریوں کا گلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے صرف عزم و عمل کی ضرورت ہے۔ نقابت کے فرائض جناب سمیع الفت نے انجام دیا۔

پریس ریلیز، عرفان انصاری، 13 ستمبر 2014

مدھیہ پردیش :

حمیدیہ کالج بھوپال میں دوروزہ سیمینار کا انعقاد

بھوپال: علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ پر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے مالی تعاون سے حمیدیہ کالج کے اردو وعربی شعبہ کے اشتراک سے کالج کے کانفرنس ہال میں دوروزہ نیشنل ریسرچ سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کی صدارت یوسی جین (ایڈیشنل ڈائریکٹر، ہائرایجوکیشن حکومت مدھیہ پردیش، بھوپال) نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر خالد محمود (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، پروفیسر محمد نعمان خان، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر محمد نعمان خان، ڈاکٹر سدھا سنگھ، ڈاکٹر افتخار مسعود، ڈاکٹر فرزانہ غزال، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں پروگرام میں موجود تھے۔ سیمینار کا افتتاح محکمۂ اعلیٰ تعلیم کے ایڈیشنل ڈائریکٹر ڈاکٹر یوسی جین نے کیا۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اقبال اردو کے شاعر تھے اور اردو ساری دنیا میں بولی اور پڑھی جاتی ہے اس لیے اقبال پوری دنیا کے شاعر تھے۔ سیمینار کے عنوان پر کلیدی خطبہ دیتے ہوئے این سی ای آر ٹی نئی دہلی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر محمد نعمان خان نے اقبال کی شاعری اور فکر وفلسفہ کو کئی مثالوں سے واضح کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ ہندوستان میں عالمگیر پیمانہ کی دو شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ اقبال دونوں ہی شخصیتوں پر ہندوستانیوں کو فخر ہونا چاہیے۔ دہلی یونیورسٹی میں عربی زبان وادب کے پروفیسر ڈاکٹر محمد نعمان خان نے اقبال اور عالمِ عرب کے گہرے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اقبال پر عالم عرب میں کافی کام ہورہا ہے۔ برکت اللہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد حسان خان نے کہا کہ اقبال کی شاعری میں غور وفکر کیا جائے تو انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سب موجود ہیں۔ سیمینار کی نظامت شعبۂ اردو کی پروفیسر ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے کی اور شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر ڈاکٹر فرزانہ غزال نے افتتاحی اجلاس میں آئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2014

مغربی بنگال :

محبِ اردو محمد دانش کو استقبالیہ

ہوڑہ ہاٹ ہائی اسکول کے ہال میں سنیچر 13 ستمبر 2014 کو اسکول کے سینئر استاد محمد دانش کو اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ایک جلسۂ استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی صدارت اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد نسیم نے کی۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے نقابت کے فرائض انجام دیے۔ محمد دانش صاحب تقریباً 32 سال سے ہوڑہ ہاٹ ہائی اسکول (ایچ ایس) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور آئندہ دسمبر میں یہاں سے سبکدوش بھی ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقبول

زبان کی خدمات کے اعتراف انھیں سنٹرل ہوڑہ کے ایک مقبول این جی او سنٹرل ہوڑہ انسٹی ٹیوٹ آف لائف ڈیولپمنٹ (CHILD) کی جانب سے میمنٹو، شال اور گلدستہ کا تحفہ دیا گیا۔ اس این جی او کے روح رواں محمد غلام جیلانی نے محمد دانش کی بے لوث خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ایک بے ضرر انسان بھی بتایا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتہ، 15 ستمبر 2014

تہذیب و ثقافت:

امانت لکھنوی کا اوپیرا اندر سبھا

نئی دھلی: 27 اور 28 ستمبر 2014 کی شام سات بجے منڈی ہاؤس کے تروینی کلاسنگم کے آڈیٹوریم میں امانت لکھنوی کا تحریر کردہ اوپیرا ڈرامہ 'اندر سبھا' اسٹیج کیا گیا۔ اِس پیشکش کا انعقاد آنجہانی موہن اُپریتی کو خراجِ عقیدت کے طور پر کیا گیا تھا جنھوں نے اَسّی کی دہائی میں اِس اوپیرے کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس اوپیرا میں موسیقی، مرکزی خیال اور اڈپٹیشن بھی اُنہیں کی تھی۔

آنجہانی موہن اُپریتی صاحب تھیٹر کے ایک مشہور مصنّف و ہدایت کار تھے۔ انھیں ہندستانی تھیٹر کی موجودہ موسیقی کا اہم معمار مانا جاتا ہے۔ وہ 1928 میں الموڑہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے کماؤں علاقے کے روائتی لوک سنگیت، تھیٹر اور ثقافت کے تحفظ کے لیے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ کچھ عرصہ وہ دہلی کے نیشنل اسکول آف ڈرامہ میں اُستاد بھی رہے جہاں انھوں نے چند ڈراموں کے لیے ہدایت کار کے فرائض انجام دیے۔ NSD میں اُن کا سب سے مشہور ڈرامہ ایک اوپیرا کی شکل میں 'داستانِ اندر سبھا' تھا۔

اوپیرا 'اِندر سبھا' کے ہدایت کار امِت سکسینہ تھے۔ اوپیرا کے انعقاد کے موقع پر موہن اُپریتی کی اہلیہ نعیمہ خاں بھی سامعین کی صف میں موجود تھیں۔ موہن اُپریتی کی دو جُڑواں صاحب زادیاں دیکشا اُپریتی اور دِویا اُپریتی کتھک رقص کی مشّاق ڈانسر ہیں۔ اِن دونوں نے 'اندر سبھا' اوپیرا میں بالترتیب پکھراج پری اور لعل پری کے رول کیے تھے اور موہن صاحب کے برادر خورد بھاگوت اُپریتی نے شعبہ موسیقی میں طبلے کی ذمّے داری سنبھال رکھی تھی۔

'اِندر سبھا' ڈرامے کو اِس سے قبل بھی 25 مارچ 2012 کی شام سات بجے شری رام سنٹر آڈیٹورم واقع منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں کھیلا جا چکا ہے۔ اِس پیشکش کا اِنعقاد دہلی کلیان سمیتی، دہلی سرکار کی وزارتِ ثقافت، بھارتیہ سنگیت سدن اور ہندستانی کونسل برائے ثقافتی تعلقات کے مُشترکہ تعاون سے عمل میں آیا تھا۔ اس میں مرکزی خیال معروف کتھک رقاصہ اوما شرما کا تھا جنھوں نے اِس ڈرامے کا تانا بانا مُجرا، نوٹنکی، کتھک کے اسٹائل میں تیار کیا تھا۔ اِس میں موسیقی ایک فلمی موسیقار پنڈت جوالہ پرساد نے ترتیب دی تھی اور اِسے دہلی کی نامور موسیقار آنجہانی نینا دیوی کی یاد کو وقف تھا۔ اُوما شرما والی 'اِندر سبھا' میں 'کالا دیو' کو 'کال دیو' کہا گیا تھا اور پمفلٹ میں اِس کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ 'کال دیو' خلا کی وسعتوں میں وقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُوما شرما والی پیشکش میں موہن اُپریتی والے ڈرامے کے مُقابلے میں کئی اِضافی کردار موجود ہیں مثلاً سات باندیاں، چھ کتھک رقاص، نٹ اور نٹنی وغیرہ۔

پریس ریلیز، جاوید حمید، نئی دہلی، 14 اکتوبر 2014

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام مشاعرے کا انعقاد

نئی دھلی: یوم اساتذہ کے موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام دہلی میں درس و تدریس سے وابستہ شعرا کا ایک مشاعرہ اکادمی کے قمر رئیس سلور جوبلی ہال میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی شمع پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر خالد

محمود، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر جی آر کنول نے روشن کی۔ مشاعرے کی صدارت مشہور و معروف نقاد و شاعر پروفیسر شمیم حنفی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مشاعرے ہماری روایت کا ایک اہم حصہ ہے، آج ہم اس کے ذریعے نہ صرف اپنی روایت کو زندہ کر رہے ہیں بلکہ یوم اساتذہ کی عظمت کا بھی احترام کر رہے ہیں۔ اساتذہ فرد ہی نہیں بلکہ انسانیت اور معاشرہ ساز ہوتے ہیں۔ اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر خالد محمود نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ یوم اساتذہ کے موقعے پر تمام اساتذہ شاعروں کا بے حد استقبال ہے۔ جب کہ مشاعرے کے آغاز میں اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے مشاعرے کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ تقریباً 30 اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2014

انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں غزل سرائی کا اہتمام

دھلی: دہلی کے لودی روڈ پر واقع انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر کے ایمفی تھیٹر میں غزل کے عنوان پر خصوصی بزم کا اہتمام احساس فاؤنڈیشن کی جانب سے کیا گیا جس کا افتتاح سینٹر کے ڈائریکٹر راکیش ککر نے شمع روشن کر کے کیا، اس خصوصی ثقافتی تقریب میں ملک کے ممتاز شاعر سندیپ سالٹ کی شاعری پر مختلف طرح کی ثقافتی تقریبات پیش کی۔ شاعری اور موسیقی کے خصوصی تال میل میں سارنگی پر کمال فاروقی نے شرکا کا دل جیت لیا۔ اس دوران البیرہ اور مرکہ نے موسیقی کے ساتھ جگل بندی سے لوگوں کے دلوں میں محبتوں کو پیدا کرنے کی کوشش کی اور سماج کو پیار اور محبت کا پیغام دیا۔ افتتاحی تقریر میں بی پی سنگھ نے کہا کہ سندیپ سالٹ کی شاعری امن کا راستہ دکھاتے ہوئے لوگوں کو درس دیتی ہے کہ آج کے سماج میں محبت کے دیے جلائے جائیں اور سماج میں لگ رہی تشدد کی آگ کو ٹھنڈا کیا جائے۔ ناظم محفل سلیم امروہی نے اس موقعے پر کئی غزلیں پیش کیں۔ مشہور شاعر سندیپ سالٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری کو پیار و محبت کے مقصد سے پروان چڑھایا ہے، اس موقعے پر کمال امروہی، بیرسٹر سمنت بھاردواج، علی عابدی کے ساتھ سینٹ اسٹیفن سوسائٹی اگرہ و سورنگ سوسائٹی کے اراکین بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 14 ستمبر 2014

بزمِ ادب کے زیر اہتمام غالب کی زندگی پر ڈرامہ

نئی دھلی: سینٹ اسٹیفنز کالج کی بزم ادب کے زیر اہتمام 'غالب کی زندگی اور تخلیقات' کے موضوع پر ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ پروفیسر محمد حسن کے ڈرامے 'تماشہ اور تماشائی' پر مبنی تھا۔ شاعر غالب اور فرد غالب کے

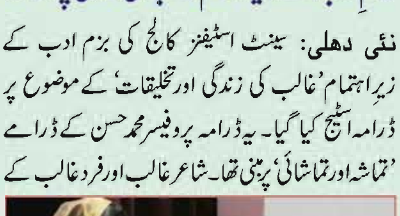

مابین کشمکش پر مشتمل اس ڈرامے میں غالب کی زندگی کے مختلف درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ شاعر غالب کا کردار سدھارتھ نے، فرد غالب کا کردار فیضان نے اور نوجوان غالب کا کردار عدنان نے ادا کیا جبکہ غالب کے لڑکپن کے زمانے کا کردار توحید نے نبھایا۔ رقص و موسیقی

اور غالب کی مترنم غزلوں سے بھرپور اس ڈرامے کے ہدایت کار سیف رشید تھے۔ اس موقعے پر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ ہر سال انگریزی اور ہندی ڈرامے تو کالج میں کھیلے جاتے ہیں لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ اردو سوسائٹی کی جانب سے اردو کے معروف شاعر کو موضوع بنا کر اردو ڈرامہ پیش کیا گیا جس کی اسٹیج پیش کش کے ہر شعبے میں غیر اردو داں طلبہ کا تعاون شامل رہا۔ یہ اردو کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 ستمبر 2014

صوفی دربار

نئی دهلی: حسن آرا ٹرسٹ و انڈیا ہیریٹیج سینٹر کی جانب سے 13ویں صوفی فیسٹول کا اہتمام دہلی کے لودھی روڈ واقع انڈیا اسلامک سینٹر میں دیر رات صوفی دربار عنوان سے کیا گیا جس میں ملک کی ممتاز شخصیات، گورنر صاحبان، کئی ممالک کے ایمبیسڈر، سینئر صحافی و دیگر ڈپلومیٹس بیروکیٹس حضرات نے شرکت کی اور روایتی اور کلاسیکل صوفی کلام کا لطف لیا۔ پروگرام کا افتتاح ٹرسٹ کے سرپرست پدم شری ڈاکٹر محسن ولی کے ذریعے خطبہ استقبالیہ سے ہوا جس کے بعد سینئر آئی اے ایس شری سندیپ سالٹ، بیگم فرخ ناز، حیدر کمال، ظہیر زیدی، علی عابدی امروہی، رئیس ادریسی نے مہمانان کا خیر مقدم کیا، مہمانان میں سی بی آئی کے ڈائرکٹر اشونی کمار، دہلی کے سابق گورنر تجیند رکھنہ، برٹین کے سابق ہائی کمشنر اور ممتاز صحافی شری کلدیپ نیر نے صوفی دربار کی شمع روشن کی۔ اس موقعے پر اسپینی زبان سے تعلق رکھنے والی ممتاز شاعرہ پروفیسر مینوبخشی کی کتاب 'تشنگی' و پروفیسر عباس رضا نیر کی کتاب 'الہام' کی رونمائی مہمانان کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔ اس دوران مہمانان کے ہاتھوں ڈائی لیبس کے ماہر طب حکیم سید حسین کو فخر ہند اعزاز اور پروفیسر مینوبخشی کو حضرت امیر خسرو اعزاز سے سرفراز کیا گیا، دونوں گورنر حضرات نے پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری کی شال پوشی اور ان کو مومنٹو بھی پیش کیا۔ مہمانان نے اپنی تقریر میں محبت کے پیغام کو عام کرنے اور آج کے ہندوستانی سماج میں دلوں کو جوڑنے میں اس طرح کی تقریبات کے اہتمام پر زور دیا جہاں تمام مذاہب کے لوگ ایک ساتھ جمع ہوکر آپسی اتحاد کو فروغ دینے کی بات کرتے ہیں۔ صوفی دربار کے پہلے سیشن میں رامپور گھرانے کے ممتاز صوفی قوال جاوید حسین خاں وان کے رفقا نے خوبصورت کلام اپنے روایتی انداز میں پیش کیا۔ جبکہ دوسرے سیشن میں فلمی دنیا میں بہت مقبول صوفی سنگر استاد چاند نظامی، سہراب فریدی و شاداب فریدی نے صوفی کلام پیش کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری و سلیم امروہی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 ستمبر 2014

اعزاز و اکرام

اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ کا اعلان

نئی دهلی: اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ (2013 کے لیے) کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اعلان کے مطابق کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ممتاز دانشور عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) کی سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر سیدہ جعفر کو جبکہ دتاتریہ کیفی ایوارڈ معروف ادیب پروفیسر شمیم حنفی کو دیا جائے گا۔

سیدہ جعفر　شمیم حنفی　خاور ہاشمی　فرحت احساس

یہ دونوں ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ ان دونوں ایوارڈوں کے علاوہ دہلی والوں کے لیے مخصوص 6 ایوارڈ کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ تحقیق و تنقید کا ایوارڈ ز خاور ہاشمی کو، تخلیقی نثر کا ایوارڈ افسانہ نگار اقبال مہدی کو، شاعری کا ایوارڈ ممتاز شاعر فرحت احساس کو، اردو صحافت کا ایوارڈ معروف صحافی و مصنف سہیل انجم کو، اردو ترجمہ کا ایوارڈ ڈاکٹر ارجمند آرا (دہلی یونیورسٹی) کو جبکہ اردو ڈرامہ کا ایوارڈ معروف ڈرامہ نگار شاہد انور کو دیا جائے گا۔ متذکرہ 6 ایوارڈز 50 ہزار روپے نقد، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہے۔

غور طلب ہے کہ اردو اکادمی دہلی کے سربراہ لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود کی زیر صدارت منعقدہ ایوارڈ ایکزیکٹو کمیٹی کی نشست میں لیے گئے فیصلے کی توثیق کی تھی جس کے بعد اعلان کیا گیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 ستمبر 2014

انجمن فکر رفعت سروش کی جانب سے طلبہ کو ایوارڈ دیے جانے کا منظر

انجمن فکر 'رفعت سروش' کی جانب سے 324 طلبہ وطالبات کو ایوارڈ سے نوازا گیا

نئی دهلی: دہلی کے سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم میں 85 فیصد سے زائد نمبر سے کامیابی حاصل کرنے والوں کو انجمن فکر رفعت سروش کے زیر اہتمام منعقدہ 'تقسیم ایوارڈ تقریب' میں 32 طلبہ و طالبات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بطور انعام ایوارڈ نقد 1500، ایک سرٹیفکیٹ اور ٹرافی دی گئی۔ اس کے علاوہ نشان رفعت سروش اسپیشل ایوارڈ دیا جاتا ہے جو بارہویں جماعت میں پوری دہلی میں اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کو ملتا ہے۔ اس بار یہ انعام چشمہ بلڈنگ کی طلبہ منیبہ کے حصے میں آیا ہے۔ اس اسپیشل ایوارڈ میں 5100 روپے نقد، بڑی ٹرافی اور سرٹیفکیٹ منیبہ کو دیا گیا۔ اس موقعے پر 'انجمن فکر رفعت سروش' کی مینیجنگ ڈائریکٹر ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ یہ پروگرام پچھلے 6 برسوں سے مستقل ہو رہا ہے، جس میں اردو کی ترقی اور اردو پڑھنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ہم ایوارڈ تقسیم کا جلسہ کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین قمر احمد نے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ میں ڈاکٹر ایس فاروق ڈائریکٹر ہمالین ڈرگس نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے علاوہ مہمانِ ذی وقار میں پروفیسر خالد محمود وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی، نفیس اے صدیقی سبکدوش پرنسپل بھگت سنگھ کالج دہلی یونیورسٹی، ایم این عباسی نے بھی شرکت کی۔ اخیر میں ڈاکٹر شبانہ نذیر نے سامعین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2014

ڈاکٹر وضاحت رضوی کو خمار میموریل ایوارڈ

لکھنؤ: خمار بارہ بنکوی نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں جب تقریباً غزل کو طاق نسیاں کی زینت بنانے کا عمل شروع ہو گیا تھا، کلاسکی غزل کو اپنے خون جگر کی آبیاری سے زندہ اور توانا بنائے رکھنے کی بھرپور کوشش کی

اور غزل کو انتہائی بلندی تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا۔

یہ باتیں ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے خمار میموریل اکادمی بارہ بنکی کے زیر اہتمام نیا دور کے خمار نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں منعقد استقبالیہ تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہیں۔ نیا دور کے خمار نمبر کی اشاعت کے لیے ان کا کلام یکجا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ انھوں نے کہا کہ خمار میموریل اکادمی میں ایک لائبریری قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ اردو قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ادھر ادھر نہ بھٹکنا پڑے۔ تقریب کے صدر ریاستی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین اور صدر خمار میموریل اکادمی غیاث الدین قدوائی نے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کی جانب سے شائع ہونے والے ادبی جریدے نیا دور کے مدیر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ خمار نمبر کی اشاعت سے خمار شناسی کے باب میں اضافہ ہوگا اور خمار بارہ بنکوی پر تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی میں اس سے خاصی مدد حاصل ہوگی۔ روایتی غزل کے ترجمان خمار بارہ بنکوی کو جذباتی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شعری محاسن پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو خمار میموریل ایوارڈ پیش کیا گیا، جبکہ خمار میموریل اکادمی کے بانی نائب صدر خالد جیلانی مرحوم کی یاد میں شروع کیے گئے ایوارڈ میں پہلا خالد جیلانی انعام مشہور شاعر نہال رضوی کو ان کی ادبی خدمات کے طور پر پیش کیا گیا اور بطورِ خراج عقیدت خمار بارہ بنکوی کے نام سے منسوب ایوارڈ خمار بارہ بنکوی کے پوتے فیض خمار کو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 ستمبر 2017

افسر آغا لکھنوی کو میر تقی میر ایوارڈ

رامپور: رامپور کے کہنہ مشق استاد شاعر افسر آغا لکھنوی کو میر تقی میر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اطلاع کے مطابق مظفر نگر کی پاشا اردو لائبریری ایسوسی ایشن رجسٹرڈ ہر سال ہندوستان کے

کسی بڑے شاعر کو میر تقی میر ایوارڈ دیتی ہے۔ سال برائے 14-2013 کے لیے ملک بھر سے مجموعات آئے لیکن پینل نے افسر آغا لکھنوی کو ان کے مجموعہ کلام 'شہرِ فن' کو اعلیٰ اور معیاری مجموعہ قرار دیا۔ انھیں 11 ہزار روپے نقد اور توصیفی سند دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ مظفر نگر کی پاشا اردو لائبریری ایسوسی ایشن اپنے طرز کی ہندوستان میں واحد لائبریری ہے جو کہنہ مشق شعرا کی ہمت افزائی اور معاونت کرتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 ستمبر 2014

ڈاکٹر بانو سرتاج کو انعام

مرکزی حکومت کا بھارتیندو ہریش چند ایوارڈ 9 ستمبر 2014 کو ڈاکٹر بانو سرتاج کو عطا کیا گیا۔ بچوں کے لیے لکھے گئے

ان کے ناول 'کپیا اور پری چھم' کے لیے یہ ایوارڈ کھیل گرام، دلّی کے شاندار آڈیٹوریم میں منعقدہ پروگرام میں شری پرکاش جاوڈیکر کے ہاتھوں دیا گیا۔ مرکزی وزیر اطلاعات ونشر واشاعت شری پرکاش جاوڈیکر نے انعام یافتہ ادیبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے خصوصاً خواتین سے خواتین کے مسائل پر لکھنے کی درخواست کی۔ انعام میں 40,000 (چالیس ہزار) نقد کے علاوہ سند، شال اور مومنٹو شامل ہیں۔

پریس ریلیز، قاضی اے اے سول لائنس، چندر پور، 20 ستمبر 2014

انجمن ہماری تہذیب کے زیر اہتمام اسناد تقسیم

آگرہ: انجمن ہماری تہذیب تنظیم کی جانب سے یوتھ ہاسٹل میں اردو کے طلبہ و طالبات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت شوبیا انٹر کالج کے سابق پرنسپل حاجی جمیل الدین قریشی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آگرہ کبھی اردو کا دارالحکومت تھا۔ یہ فکر کا موضوع ہے کہ اب اس کے پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد نے کہا کہ اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کے لیے آگے بڑھنے کے بہت سے مواقع موجود ہیں۔ اس موقعے پر بطورِ مہمان چودھری واجد نثار بھی موجود تھے۔ ہائی اسکول کی ٹاپر شاہین اور انٹر کی اردو ٹاپر رخسار کو ایک ہزار روپے کا چیک اور ٹرافی دی گئی وہیں ہائی اسکول کے طالب علم ریحان کو اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر انعام سے نوازا گیا۔ تقریب میں ہائی اسکول کے 81 اور انٹر کے 36 طلبہ و طالبات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر تنظیم کی جانب سے سماجی کارکن حاجی اقبال احمد کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب میں لئیق اکبرآبادی، سید اختیار جعفری، ڈاکٹر جہانگیر علوی، وسیم الدین، محمد اسلم قریشی اور داؤد اقبال وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2014

سماجی تنظیم سنگم کے تحت اودھ رتن ایوارڈ

لکھنؤ: ادبی و سماجی تنظیم 'سنگم' کے تحت جے شنکر پرساد آڈیٹوریم قیصر باغ میں اودھ رتن اعزازی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کہا کہ علم و ادب کا سمندر جب اخلاق و ادب کے سمندر سے ملتا ہے تو ایک سنگم تیار ہوتا ہے جو ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جن حضرات کو اودھ رتن اعزاز سے نوازا گیا وہ کوئی فرد واحد نہیں بلکہ اپنی ذات سے انجمن ہیں اور انسانیت کی خدمت کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دلوں کو جوڑنا، بھائی بھائی کی طرح رہنا یہی علم و ادب کا اصل مقصد ہے۔ ملک زادہ منظور احمد، شکیل صدیقی اور سراج مہدی نے اپنے اپنے شعبوں میں جو خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ انور جلال پوری نے اس موقعے پر ملک زادہ منظور احمد: اردو کا ایک تہذیبی ستون عنوان سے اپنا پرمغز مقالہ بھی پیش کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر خان مسعود احمد نے اپنے خیالات پیش کیے۔ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے امتیاز احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ برائے ادب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو پیش کیا۔ ملک محمد جائسی اودھ رتن ایوارڈ برائے ہندی ادب ندیم اشرف جائسی نے ہندی کے معروف ادیب شکیل صدیقی کو پیش کیا۔ مولانا سید نعیم اشرف اودھ رتن ایوارڈ برائے سماجی خدمات سراج مہدی کو سعید الرحمٰن اعظمی نے پیش کیا، جبکہ پروفیسر خان مسعود نے شال پیش کی۔ معروف صحافی وکرم راؤ نے مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، پروفیسر شارب ردولوی نے پروفیسر خان مسعود احمد، پروفیسر انیس اشفاق نے ندیم اشرف جائسی اور لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر پروفیسر روپ ریکھا ورما نے نعیم صدیقی کو مومنٹو پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت مہتمم ندوہ العلما مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کی۔ نظامت اردو عربی فارسی

یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر فخر عالم نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر انیس اشفاق، شاہنواز قریشی، عابد سہیل، قمر گونڈوی، ڈاکٹر معراج ساحل، وسیم حیدر، اسرار حسین، سید مسعود اشرف جائسی، مسیح الدین خاں مسیح وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 ستمبر 2014

منگلور میں تقسیم اسناد کی تقریب

منگلور: انجمن فروغ انسانیت کی جانب سے معروف ادیب وصحافی اور جامعہ اصلاح البنات منگلور کے بانی و مہتمم قاری نسیم منگلوری کی ادبی، صحافتی خدمات کا

اعتراف کرتے ہوئے مشہور مجاہد آزادی و ماہر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ عطا کیا گیا۔ وہیں منگلور کی ایک اور ادبی شخصیت فصیح الزماں فاروقی کو 'جگر مرادابادی ایوارڈ' دیا گیا۔ انجمن فروغ انسانیت کی جانب سے منعقد مشاعرہ میں دونوں شخصیتوں کو یہ ایوارڈ عطا کیے گئے۔ ان کے علاوہ بزرگ شاعر شمیم قریشی، نوجوان شاعر مونس کاظمی کو سند توصیف عطا کی گئی۔ انجمن فروغ انسانیت کی جانب سے قاری نسیم منگلوری کو مشہور مجاہد آزادی و ماہر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ دیے جانے پر ادبی، علمی، مذہبی شخصیتوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 16 ستمبر 2014

امجد اسلام امجد کے اعزاز میں نشست

نئی دہلی: سو سالوں میں 300 ہزار سے زائد زبانیں ختم ہو چکی ہیں اور اب جو زبانیں اس قطار میں ہیں ان میں اردو زبان بھی شامل ہے جس زبان کا اسکرپٹ باقی نہیں رہتا اس زبان کا وجود ختم ہو جاتا ہے، محبان اردو کو ان اسباب کو اور خامیوں کو دور کرنا ہوگا تبھی ہم آنے والی نسلوں تک اردو زبان کو پہنچا سکیں گے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کے معروف شاعر امجد اسلام امجد نے غالب اکیڈمی دہلی میں اپنے اعزاز میں منعقد ادبی نشست میں کیا۔ انھوں نے کولمبس کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا اس کو ایجاد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ہمارے اندر بھی بہت ساری خصوصیات موجود ہیں ہمیں انھیں دریافت کرنا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ

اردو بولنے والے دنیا کی کسی بھی زبان کو چالیس فیصد جلدی سیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ اردو زبان سے ہم 52 طرح کی آوازیں نکال سکتے ہیں چاہے آپ کسی ملک کی زبان سیکھیں اگر آپ اردو زبان جانتے ہیں تو آپ غیر اردو داں اشخاص سے چالیس فیصد تیزی کے ساتھ دنیا کی کسی بھی زبان کو سیکھ سکتے ہیں۔ اس موقعے پر شہپر رسول نے کہا کہ امجد اسلام متنوع شخصیت کے مالک ہیں، نظم اور شاعری پر وہ غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ دیگر مقررین میں جی آر کنول، زبیر فاروقی، ڈاکٹر عقیل احمد، ترنم ریاض، متین امروہوی وغیرہ نے بھی پاکستان اور ہندوستان کے ادب کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر امجد اسلام امجد نے بہترین غزلیں اور نظمیں سنا کر لوگوں کا دل جیت لیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 اکتوبر 2014

نواز دیوبندی کا استقبالیہ

امروہہ: ''زبان ہی کسی قوم کا وقار اور روشن مستقبل کی ضامن ہوتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنی زبان کو چھوڑ دیا، وہ قومیں بھی صف ہستی سے نیست و نابود ہوگئیں۔ اردو اکادمی اترپردیش کا مقصد اردو کو ریاست کے ہر اسکول تک پہنچانا ہے، اردو اسکولوں تک پہنچ جائے گی تو تہذیب و تمدن آنے والی نسلوں میں خود بخود پہنچ جائے گا۔'' مذکورہ خیالات کا اظہار اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین و معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے نجی دورے کے تحت امروہہ میں منعقد ایک استقبالیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ چیئرمین اردو اکادمی قاضی زادہ واقع ہاشمی ہاؤس پر پرتپاک استقبال شہر کی متعدد ادبی تنظیموں کے نمائندگان کے ذریعہ کیا گیا۔ معروف ادبی شخصیت شمیم ہادی کی زیر صدارت ہاشمی ہاؤس پر منعقد اس استقبالیہ جلسے کا آغاز امروہہ کے معروف نعت گو شاعر حافظ شمیم امروہوی و سعد امروہوی کے ذریعے پیش کی گئی نعت پاکؐ سے ہوا جس کے بعد ڈاکٹر جمشید کمال کے ذریعے اعزازیہ کلام چیئرمین اردو اکادمی کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ماسٹر اسلم عثمانی نے چیئرمین اردو اکادمی نواز دیوبندی کے ذریعے صوبے میں جاری اردو کے لیے فلاحی کاموں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انجمن ترقی اردو اترپردیش کے جنرل سکریٹری شوق امروہوی نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے وزیراعلیٰ اترپردیش اکھلیش یادو کا شکریہ ادا کیا۔ یوپی اردو ادب سوسائٹی کے سکریٹری اقبال خاں و سماجی رکن خالد صدیقی نے بھی نواز دیوبندی کا استقبال کرتے ہوئے ان کے ذریعے اردو کے لیے جاری فلاحی کاموں کی پذیرائی کی۔ صدارت کر رہے پاکستان سے خیرسگالی دورے پر آبائی وطن امروہہ پہنچے شمیم ہادی نے اپنے انداز میں کہا کہ امروہہ کی محبت، میرے ملک کی مٹی کی خوشبو مجھے یہاں ہر سال کھینچ لاتی ہے۔ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی وطن عزیز اور شہر عزیز کی یادیں ہمیشہ میرے ساتھ جڑی رہتی ہیں۔ اس موقعے پر چیئرمین اردو اکادمی نواز دیوبندی نے اپنے خطاب کے دوران مزید کہا کہ مجھے امروہہ پر ناز ہے کیونکہ یہاں ہر انسان کے دل میں اردو بسی ہوئی ہے۔ حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو اترپردیش کے نائب صدر ڈاکٹر سراج ہاشمی نے کہا کہ نواز دیوبندی کی امروہہ آمد پر وقت کی کمی کے باعث ان کے مقام و عہدے کے مطابق استقبال نہیں ہو پایا، جس کا ہمیں افسوس ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، یکم اکتوبر 2014

رسم اجرا:

کالی داس کی تخلیق 'میگھ دوت' کا اجرا

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی شعبۂ سنسکرت اور رضا لائبریری رامپور کے اشتراک سے دہلی یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس میں معروف شاعر کالی داس کی سنسکرت تخلیق 'میگھ دوت' کے ہندی ترجمہ کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ رضا لائبریری میں موجود سنسکرت کے اس مین اسکرپٹ کا ہندی ترجمہ

ڈاکٹر شردا اروڑا نے کیا۔ اس موقعے پر اندرا گاندھی قومی مرکز برائے آرٹس (آئی جی این سی اے) کی جنرل سکریٹری دیپالی کھنہ، رضا لائبریری رامپور کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین ہمدانی، فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی کے ڈین پروفیسر منی ساہتی، شعبہ سنسکرت کے صدر پروفیسر رمیش بھاردواج، شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ابن کنول اور ڈاکٹر شاردا اروڑا کے علاوہ بڑی

تعداد میں اساتذہ اور طلبہ موجود تھے۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہ کہ فیکلٹی آف آرٹس رامپور کی رضا لائبریری میں 5000 ہزار سے زیادہ سنسکرت کے مین اسکرپٹ موجود ہیں جن پر کام ہونے کی ضرورت ہے۔ 'میگھدوت' کی رسم اجرا پر ہم ڈاکٹر شردا اور پروفیسر سید عزیز الدین ہمدانی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے طلبہ سے رامپور رضا لائبریری آکر یہاں کے ذخیروں سے فیض یاب ہونے کی درخواست کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر منی ساہنی نے اس تحقیقی کام کو سراہا اور اس کے لیے شعبہ سنسکرت سے وابستہ افراد کو مبارک باد پیش کی۔ نظامت کے دوران شعبہ سنسکرت کے صدر پروفیسر رمیش بھاردواج نے دہلی یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس کے تمام شعبوں کے درمیان باہمی ربط پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کے تمام شعبوں کے ریسرچ اسکالرس کی ٹیم کو ہر مہینے آئی این جی سی اے بھیجنے کی بات کہی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں شعبۂ سنسکرت کے علاوہ مختلف شعبوں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 12 ستمبر 2014

اقبال کا حرف شیریں

نئی دھلی: پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق کی کتاب 'اقبال کا حرفِ شیریں' کے اجرا کے موقعے پر نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے علامہ اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک سچے محبِّ وطن اور شاعر تھے۔ آج بھی ان کا فلسفہ اور شاعری معنویت رکھتی ہے، لیکن افسوس اس بات

کا ہے کہ سیاست کی وجہ سے وہ نظرانداز کردیے گئے۔ حامد انصاری نے مزید کہا کہ ہمیں نہ صرف اقبال کے تئیں محبت اور احترام ہونا چاہیے بلکہ ان سے سیکھنا بھی چاہیے۔ آگے انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہ کتاب 'اقبال کا حرف شیریں' اردو کے علاوہ ہندی، انگلش اور دیگر زبانوں میں بھی شائع ہونی چاہیے۔ اس کتاب کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر عبدالحق نے کہا کہ اقبال کو ہمارے ملک میں وہ مقام نہیں ملا جو انھیں ملنا چاہیے۔ پروفیسر عبدالحق 1965 سے ہی اقبال پر کام کررہے ہیں۔ اب تک انھوں نے اقبال پر 37 کتابیں لکھی ہیں۔ اقبال اکادمی انڈیا کے چیئرمین ڈاکٹر ظفر محمود نے کہا کہ اقبال کے فلسفے کا کینوس کافی بڑا ہے، انھوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر دنیش سنگھ، دہلی اردو اکادمی کے چیئرمین پروفیسر خالد محمود، پروفیسر عتیق اللہ، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے نائب صدر ڈاکٹر سید احمد خان، اور دیگر شخصیات کی موجودگی میں اس کتاب کا اجرا ہوا۔ روزنامہ'خبریں' دہلی، 18 ستمبر 2014

'کالی پری' اور 'ریشم کا جال' کا اجرا

مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا کی لٹریری سب کمیٹی کی جانب سے 21 ستمبر کو انسٹی ٹیوٹ کے قادر نواز ہال میں بنگلہ دیش سے تشریف لائے افسانہ نگار ارمان شمسی کی دو کتابوں کا 'کالی پری' اور 'ریشم کا جال' کا اجرا بدست بالترتیب معروف افسانہ نگار انیس رفیع اور شہیرہ مسرور کے ذریعہ عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر عبدالمنان، سابق صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نعیم انیس نے انجام دیے۔ صاحبِ کتاب ارمان شمسی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر نعیم انیس نے کہا کہ موصوف ماحول، معاشرہ، تہذیب اور ثقافت کے سچے اور کھرے امین ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ کا نچوڑ ان کی تحریریں ہیں۔ مصطفیٰ اکبر (مدیر پندرہ روزہ 'مغربی بنگال') نے ان کے افسانوں کی تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ارمان شمسی کے افسانوں میں زندگی کی حرارت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ شہیرہ مسرور (شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج) نے کہا یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ اردو کے ایک ایسے افسانہ نگار کی کتاب کا اجرا کررہی ہوں جس نے ایک ایسی سنگلاخ سرزمین پر اردو زبان وادب کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی جہاں کی فضا اردو کے لیے انتہائی ناسازگار رہی ہے اور ایسے ماحول میں ارمان شمسی کی حیثیت مجاہدِ اردو کی ہے۔ ممتاز افسانہ نگار انیس رفیع نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔ صاحبِ کتب ارمان شمسی نے ڈاکٹر نعیم انیس اور انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری سب کمیٹی کے وابستگان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بنگلہ دیش میں اردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے قیامِ بنگلہ دیش اور اس کے بعد وہاں پر موجود بہاریوں یا اردو داں طبقے پر ہونے والے روح فرسا مظالم کا تذکرہ بھی کیا اور کہا کہ اردو اور اردو والوں سے نفرت کا جو ماحول وہاں پیدا ہوا تھا، اس نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اظہارِ تشکر ساجد خان نے کیا۔ پریس ریلیز، انیس نعیم، کولکاتا، 21 ستمبر 2014

اردو غزل پر تصوف کے اثرات

اودے پور: اردو غزل کا بنیادی آہنگ تصوف سے عبارت ہے کیونکہ اردو کی تعمیر وتشکیل میں اولیاء کرام اور صوفیا نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پھر اردو غزل کے تعمیری دور میں معاشرہ جس طرح کے تہذیبی انحطاط اور سیاسی افراتفری کا شکار تھا۔ اس میں تصوف ایک بڑا وسیلہ

تھا زندگی کو صبر وشکر کے ساتھ گزارنے کا۔ اسی لیے اردو غزل اور تصوف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تصوف کے وسیلے سے اردو غزل میں بڑی شاعری ہوئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور اودے پور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو پروفیسر فاروق بخشی نے ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی کی تصنیف اردو غزل پر تصوف کے اثرات کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی نے بڑی دقت نظر اور جاں سوزی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ اس کام کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ راجستھان تصوف کا گہوارہ ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف بھی پیش کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے، ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر گوئل اور ڈاکٹر ضیاء الحق قادری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2014

اکادمی کی نئی مطبوعات کی رسم رونمائی

لکھنؤ: موتی محل لکھنؤ میں جاری کتاب میلے میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے اسٹال نمبر 181 پر ڈائریکٹر سنسکرت سنستھان، برجیش چندر اور سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی ڈاکٹر شمیم احمد کے دست مبارک سے اکادمی کی نئی مطبوعات کی رسم رونمائی کی گئی۔ جن کتابوں کی رونمائی کی گئی اس میں اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر (پروفیسر سید محمد الحسن)، ابر احسنی گنوری حیات اور کارنامے (ڈاکٹر یلیسین علی عثمانی (عصمت چغتائی کی ناول نگاری، (شبنم رضوی)، افکار ومسائل (پروفیسر سید احتشام حسین)، ڈاکٹر شمیم نکہت (پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار) اور پریم چند نئے تناظر میں (پروفیسر علی احمد فاطمی)، اس کے علاوہ ذوق

ادب اور شعور (سید احتشام حسین) کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ برجیش چندر نے کہا کہ یہ کتابیں اردو کے ادبی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہیں اور ان سے یقیناً ادب کو فائدہ ہوگا۔اس موقعے پر ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر فخر عالم سبط حسن نقوی، مولانا عمر بن عبدالعزیز ندوی کے علاوہ اسٹال کے انچارج ذبیح اللہ، عرفان حیدر، نثار احمد وغیرہ بھی موجود تھے۔ یہ اطلاع سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے دی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 24 ستمبر 2014

نعمت خانہ

نئی دهلی: کناٹ پلیس آکسفورڈ بک اسٹور کے ہال میں ڈاکٹر خالد جاوید کی کتاب 'نعمت خانہ' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ خالد جاوید کی کتاب نعمت خانہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرحت احساس نے کہا کہ خالد جاوید کا نام افسانے کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے افسانے نے ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک میں بھی کافی شہرت حاصل کی ہے۔ متعدد ناولیں انھوں نے تصنیف کی ہیں جس کا ایک الگ ہی انداز ہے جس میں کسی اور کی جھلک نہیں ملتی ان کا خود ایک الگ انداز ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر خالد جاوید ادب کا سنجیدہ ذوق رکھتے ہیں اور فکشن نگاری کے فن سے کماحقہ واقفیت ان کی نگارشات کو معیاری اور معتبر بناتی ہے۔اس موقعے پر ڈاکٹر مولا بخش دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر کوثر مظہری جامعہ ملیہ اسلامیہ، خورشید اکرم نے مذکورہ ناول پر اپنا اظہار خیال کیا۔ اس پروگرام میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر خالد مبشر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، سراج احمد، ثاقب فریدی، فیصل اقبال، نثار احمد، ابوالاعلیٰ، شعبۂ اردو طلبا و دیگر شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کے اخیر میں ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 25 ستمبر 2014

مثال

لکھنؤ: کمرشیل ٹیکس ریٹائرڈ افیسرز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں کارکردگی انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور جامعہ ملیہ کے سابق پروفیسر اور سابق کمرشیل ٹیکس اسسٹنٹ کمشنر کے انجینئر رئیس اعظم خاں رئیس مظفر نگری کے شعری مجموعے 'مثال' کا اجرا عمل میں آیا۔ علاوہ ازیں ایسوسی ایشن کے سالانہ مجلّے 'انو بھو' کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔ اس پروگرام کا انعقاد اوماناتھ کانفرنس حال میں کیا گیا جس میں چیف سکریٹری برائے انکم و تفریحی ٹیکس و باریش کمار آئی اے ایس مہمان خصوصی تھے۔ مہمانان خصوصی نے مثال کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ رئیس اعظم خاں کی شاعری سماج میں بے ہنگم ہوتی روایتوں کا نہ صرف نوحہ ہے بلکہ ہماری پامال ہوتی قدروں کو بازیافت کرنے کی ایک کوشش بھی ہے۔ پروگرام میں انو بھو کا بھی اجرا کیا گیا جس میں ایسوسی ایشن کی سالانہ سرگرمیاں اور آئندہ کے پروگرام کی تفصیل ہوتی ہے۔ ایسوسی ایشن کے سرپرست کیوائے نقوی، صدر، کے سی گپتا، نائب صدر گھنشیام شری واستو ایڈوکیٹ نے بھی تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 ستمبر 2014

امتیاز عالم کی کتاب 'امداد امام اثر: شخصیت اور تنقیدی تصورات' کے اجرا کا منظر

امداد امام اثر: شخصیت اور تنقیدی تصورات

نئی دهلی: اپنے دور میں اردو زبان و ادب کے انسائیکلوپیڈیا کہے جانے والے امداد امام اثر کی حیات و خدمات پر مشتمل جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر امتیاز عالم کی تازہ کتاب 'امداد امام اثر: شخصیت اور تنقیدی تصورات' کی رسم اجرا غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سیمینار' کے موقعے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر، این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور شاہد ماہلی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کتاب میں ان تمام مضامین کو جمع کیا گیا ہے جو امداد امام اثر کی حیات و خدمات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اس کے علاوہ امداد امام اثر کے غیر مطبوعہ مضامین بھی اس میں شامل ہیں۔ مشمولات میں اہل علم و دانش کے 18 مضامین کے علاوہ امداد امام اثر کے 4 اردو غیر مطبوعہ مضامین اور 2 انگریزی مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔ امتیاز عالم پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی زیر نگرانی امداد امام اثر کی خدمات کی ادبی و علمی جہات کا تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کر چکے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ امداد امام اثر کی مشہور کتاب کاشف الحقائق جدید تنقید کی پہلی کتاب ہے جو شعوری طور پر لکھی گئی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ شمس العلماء امداد امام اثر کی حیثیت ایک دانشورانہ حوالہ کی ہے۔ وکالت کی تعلیم کے بعد انھوں نے خود کو علمی کاز کے لیے وقف کر دیا اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے۔ امداد امام اثر نے پہلی بار اردو شاعری کو عالمی شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2014

لفظ لفظ خوشبو

رانچی: رانچی کی فعال انجمن بقائے ادب کے زیر اہتمام شاعر اختر رانچوی کے شعری مجموعہ 'لفظ لفظ خوشبو' کی رسم اجرا امین روڈ رانچی واقع تسلیم محل میں انجام پذیر ہوئی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی جھارکھنڈ اسمبلی کے سابق اسپیکر جناب عالمگیر عالم، مہمانان اعزازی جھارکھنڈ ہائی کورٹ کے سابق ایڈوکیٹ جنرل جناب محمد سہیل انور و رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر انوار احمد خان تھے۔ جب کہ صدارت رانچی دوردرشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر شیلیش پنڈت نے کی۔ تقریب رسم اجرا اور مشاعرے کی نظامت انجمن بقاء ادب رانچی کے جنرل سکریٹری جناب نصیر افسر نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

روزنامہ پریس ریلیز نصیر افسر، جنرل سکریٹری، انجمن بقائے ادب، رانچی، 8 ستمبر 2014

مٹی کا چراغ

شاملی: آل انڈیا وفاق المساجد کے صدر مولانا ریاست ندوی نے کہا ہے کہ کتابیں کسی بھی انسان کو اُس کے ماضی سے جوڑتی ہیں۔ پند و موعظت پر مشتمل کتابیں تطہیر قلب کے لیے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ کتابوں کے ذریعے ہی انسان اپنے پیش رووں سے عبرت حاصل کرتا ہے۔ کتابیں راہِ ہدایت کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ کتاب کا نہ کوئی بدل پہلے تھا اور نہ آج ہے۔ مولانا ریاست مولانا کبیرالدین فاران مظاہری کی تالیف کردہ کتاب ،مٹی کا چراغ، کے رسم اجرا کے موقعے پر منعقد تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔ واضح ہو کہ مولانا فاران ایک متحرک شخصیت کا نام ہے جو جدید مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 6 ستمبر 2014

نقوش پرواز

بھیونڈی: ڈاکٹر محمد مقیم کی تصنیف 'نقوش پرواز' کی تقریب رونمائی 23 اگست 2014 بمقام مینا تائی ٹھاکرے ہال بھیونڈی عزت مآب پدم شری محمود الرحمٰن صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور سیکریٹری حکومت ہند) کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوئی اس موقع پر موصوف نے صاحب تصنیف ڈاکٹر مقیم جامعی کی مساعی جمیلہ کو سراہا اور کہا کہ آپ نے مولانا عبدالرحمٰن پرواز کے تمام نقوش کو احسن طریقہ سے اجاگر کیا ہے۔ مجھے اس بامقصد اور شاندار تقریب میں مدعو کرنے پر میں ڈاکٹر ابوالبرکات، ڈاکٹر مقیم جامعی، خالد گڈو اور اہلیان بھیونڈی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس تقریب رونمائی کے موقع پر ایک کل ہند مشاعرہ خالد گڈو کی صدارت میں منعقد ہوا مشاعرہ کا آغاز ڈاکٹر نیاز احمد کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، افتتاح عبدالحسیب جامعی نے فرمایا، نظامت کے فرائض غیبی جونپوری نے ادا کیے۔ اس مشاعرے میں ملک کے مشہور شعراء کرام نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: مقیم اعظمی، 11 ستمبر 2014

'افسانہ اور افسانہ نگار' اور 'رسالہ شاہراہ: تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ'

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر اور نئی نسل کے متحرک وفعال ادیب نوشاد منظر کی کتاب 'افسانہ اور افسانہ نگار' اور 'رسالہ شاہراہ: تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ' کی رسم رونمائی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چیئرمین پروفیسر طلعت احمد اور قومی کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ نوشاد منظر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی ڈاکٹر سرور الہدیٰ کی نگرانی میں کررہے ہیں۔ نوشاد منظر کے پی ایچ ڈی کا موضوع 'افسانے کی تنقید: ترقی پسند تحریک تا حال' ہے۔ نوشاد منظر مختلف رسائل و جرائد اور سیمیناروں میں مقالات پیش کرتے رہتے ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 ستمبر 2014

دھنک

فرید آباد: این سی آر فرید آباد میں ادبی تنظیم محفل غزل کی جانب سے معمار قوم موہن داس کرم چند گاندھی عرف مہاتما گاندھی (باپو) کے یوم پیدائش پر سیکٹر 15 میں پروفیسر بلونت سنگھ اہلو والیہ ہال میں تقریب دھنک رسم

نوشاد منظر کی کتابوں 'افسانہ اور افسانہ نگار' اور 'رسالہ شاہراہ: تجزیاتی مطالعہ اور اشاریہ' کا اجرا

اجرا، دستار بندی اور مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت جے بھگوان گپتا راکیش نے کی اور نظامت وریندر قمر واجے عکس نے مشترکہ طور پر کی۔ خصوصی مہمانوں میں ڈاکٹر اشوک مدھت، اوم پرکاش ساگر، ڈاکٹر نشتر امروہوی، جے بھگوان گپتا راکیش، اور مصنف دھنک مجاز امروہوی شامل تھے جن کا پہلے استقبال کیا گیا اور ان کے ذریعے 'دھنک' کی رسم رونمائی ہوئی۔ مجاز امروہوی کے شعری مجموعے دھنک پر ادیب وصحافی اور تجزیہ نگار حبیب سیفی نے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجاز کی شاعری کا مطالعہ شعور کی روشنیوں میں اضافے کا سبب بنے گا، دھنک کے شاعر نے سادہ شگفتہ زبان میں موسیقی ریز، تغزل آفریں اور بامعنی شعر کہنا پسند کیا ہے۔ اس موقعے پر محمد شاہد خان کے ذریعے استاد شاعر عبدالرحمٰن منصور کی دستار بندی کی گئی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اکتوبر 2014

کم ظرف

جموں: ریاست جموں و کشمیر کے کہنہ مشق افسانہ نگار جسونت منہاس کے چوتھے افسانوی مجموعہ 'کم ظرف' کی رسم رونمائی کے لیے ایک سادہ لیکن پروقار تقریب کا انعقاد جموں میں عمل میں آیا جس کا اہتمام جموں و کشمیر اردو گلڈ نے ریاست کی سرگرم ادبی انجمنوں، پروفیسر جگن ناتھ آزاد فاؤنڈیشن، میکش کاشمیری لٹریری سوسائٹی جموں، لٹریری سیل ٹیچرس گلڈ جموں و کشمیر اور جموں و کشمیر اردو فورم کے اشتراک سے کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف ادیب، محقق، ناقد اور ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، جموں یونی ورسٹی کے ڈائریکٹر پروفیسر وجے دیو سنگھ نے فرمائی جبکہ اردو، کشمیری اور انگریزی کے نامور ادیب، شاعر، مبصر اور تاریخ داں والی محمد اسیر کشتواڑی بطور مہمانِ خصوصی تقریب ہذا میں شریک ہوئے۔ اس یادگار موقعے پر ممتاز افسانہ نگار اور جموں و کشمیر اردو گلڈ کے صدر امین بنجارا، قدآور ادیب، شاعر، محقق اور لٹریری سیل ٹیچرس گلڈ کے چیف آرگنائزر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، اردو گلڈ کے پریس انچارج محمد فاروق فراز قریشی اور افسانوی مجموعہ 'کم ظرف' کے خالق جسونت منہاس بھی ایوان صدارت میں موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 اکتوبر 2014

وفیات

نافع قدوائی

لکھنؤ: سینئر صحافی اور کالم نویس نافع قدوائی کا طویل علالت کے بعد 14 اکتوبر کی شام انتقال ہوگیا۔ وہ 57 برس کے تھے۔

نافع قدوائی سینئر صحافی تھے اور ایک طویل عرصے تک قومی آواز کے شعبہ ادارت میں شاندار خدمات دینے کے بعد وہ اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ سہارا سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد انھوں نے فری لانس صحافت کی حیثیت سے روزنامہ سیاست حیدرآباد، انقلاب (ممبئی، لکھنؤ) روزنامہ قومی خبریں، روزنامہ صحافت میں ملکی اور غیر ملکی مسائل پر بڑے وقیع اور تاثراتی مضامین لکھے جن کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ وہ ہائی کورٹ میں بحیثیت ایڈوکیٹ رجسٹرڈ تھے۔ انھوں نے 1997 میں محکمہ اطلاعات ونشریات کی طرف سے منعقدہ کمپیوٹر ٹریننگ کے پندرہ روزہ کورس میں بھی شرکت کی تھی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 15 اکتوبر 2014

شاعر موج الدین باورا کا انتقال

مظفر پور: مشہور مصور اور شاعر موج الدین باورا کا 75 سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور اس کے 2 بچے ہیں۔ موصوف قصبہ کیرانہ میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور وثیقہ نویس منشی خلیق احمد کے فرزند تھے۔ باورا ایک اچھے مصور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ حضرت صغیر احسنی سے اصلاح سخن لیتے تھے اس طرح ان کا شجرہ شاعری حضرت سیماب بابر آبادی سے جا ملتا ہے۔ ان کے انتقال پر محمد رضوان، وجے پینٹر، ندیم پینٹر، اظہر، توفیق، مظفر، موہن، انیس، جگاری، سنجے دھیمن، راجو، صفدر، سلیم جانسٹھ، رانا پینٹر وغیرہ نے اظہارِ تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 ستمبر 2014

شاعر سرشار صدیقی کا انتقال

کراچی: پاکستان کے ممتاز شاعر وادیب 88 سالہ سرشار صدیقی کو کراچی کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں سرطان کے سبب انتقال کرگئے۔ سرشار صدیقی کے والد اولاد حسین کا تعلق معظم آباد ضلع اناؤ سے تھا۔ سرشار صدیقی 25 دسمبر 1926 کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کانپور ہی کے ایک مشہور درس گاہ حلیم مسلم انٹر کالج سے 1944 میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ سرشار صدیقی 1949 میں پاکستان ہجرت کرگئے اور نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ ان کی اوّلین تخلیق اُس وقت کے ممتاز جریدے نیاز فتح پوری کے پرچے 'نگار' میں شائع ہوئی تھی اس کے چند برس بعد اُن کی پہلی کتاب 'ارتقا' کے نام سے طبع ہوئی جبکہ ان کی دیگر تصانیف کے نام اس طرح ہیں 'پتھر کی لکیر' (1962)، 'ابجد' (1983) اور تیسری کتاب 'بے نام' بھی 1983 میں منظر عام پر آئی جبکہ ان کی آخری کتاب 'خزاں کی آخری شام' 1988 میں چھپی تھی۔ 1984 میں سرشار صدیقی نے عمرہ کیا اور اس کے بعد ان کی شاعری میں مذہبی رنگ واضح طور پر محسوس کیا گیا۔ سرشار صدیقی کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ ایک بیٹا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2014

عادل اسیر دہلوی کا انتقال

نئی دھلی: ادب اطفال کے حوالے سے دہلی سمیت ملک بھر میں اہم مقام بنانے والے بچوں کے معروف شاعر عادل اسیر دہلوی کا 20 ستمبر 2014 کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ ان کی عمر تقریباً 55 سال تھی۔ مرحوم مخلص اور شریف انسان تھے۔

ان کے انتقال سے دہلی میں ادب اطفال کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی نماز جنازہ مسجد فیض الٰہی ترکمان گیٹ پر پڑھی گئی اور تدفین دہلی گیٹ قبرستان پر شام 6 بجے عمل میں آئی۔ ان کی تدفین میں سہیل انجم، شہباز ندیم ضیائی، رحمت اللہ فاروقی اور فیروز مظفر کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم و دانش شریک تھے۔ اس موقعے پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے علاوہ دوسری ادبی تحریکوں نے ان کے انتقال کو بچوں کے ادب کا عظیم خسارہ قرار دیا۔ صحافی سہیل انجم نے ان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں دو تین دہائیوں میں ان کے علاوہ بچوں کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ذات میں ایک تحریک اور بزم تھے۔ ان کے ادبی خدمات کے اعزاز میں دہلی اردو اکادمی، اتر پردیش، بنگال، مہاراشٹر کی اردو اکادمیاں اور ساہتیہ اکادمی سے ان کے ادبی خدمات کے اعزاز میں ایوارڈ بھی دیا جاچکا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2014

خراج عقیدت

شمیم اکبرآبادی کے انتقال پر تعزیتی نشست

دیوبند: دیوبند کے مشہور اردو ٹیچر وشاعر شمیم اکبرآبادی کے انتقال سے تعلیمی وادبی حلقہ میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، شمیم اکبرآبادی گزشتہ چند ماہ سے سخت علیل تھے، ان کی نماز جنازہ احاطہ مولسری میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی نماز جنازہ جمعیۃ علماء ہند کے قومی صدر مولانا سید ارشد مدنی نے ادا کرائی جس میں بڑی تعداد میں اساتذ وشاعروں نے شرکت کی، ان کی تدفین قبرستان قاسمی میں عمل میں آئی۔ ان کے انتقال پر تعلیمی وادبی تنظیموں نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے، نامور قلم کار ودارالعلوم وقف کے استاذ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ موصوف نے تاحیات علم وادب کی بے لوث خدمت کی۔ انجمن تعلیم و ادب کے صوبائی صدر سید وجاہت شاہ نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم نے علم و ادب کے میدان کی بیش قیمت خدمت کی ان کا انتقال علمی وادبی حلقہ کا بڑا نقصان ہے۔ بزمِ سخن دیوبند کے صدر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے بھی شمیم اکبرآبادی کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ شمیم اکبرآبادی نے تاحیات اردو کی خدمت کی وہ نہ صرف ادبی محفلوں کی رونق تھے بلکہ انھوں نے ہزاروں شاعروں کے کلام کی نوک پلک سنوارنے کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ شمیم اکبرآبادی کے انتقال پر عبداللہ راہ، عبداللہ عثمانی، شمس دیوبندی، ہارون حسرت انصاری، محمد سرور عثمانی، ماسٹر شمیم کرتپوری، ندیم شاد، حاجی محمد صابر صدیقی، تنویر اجمل، گل بیگ جگر نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مغفرت کاملہ کی دعا کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 ستمبر 2014

حامد اللہ قمر لکھنوی کے انتقال پر تعزیتی نشست

8 ستمبر 2014 ادارہ دعوت القرآن کے دفتر واقع کلن کی لاٹ، امین آباد میں حامد اللہ قمر لکھنوی کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد ہوا جس میں ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سکندر اصلاحی نے اظہار تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم مختلف اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ راہ چلتے دعا دینا اور اردو کی بازیابی کی فکر کرنا ان کا وطیرہ تھا۔ گفتگو اور چال میں نرمی کے ساتھ آہستگی اور انکساری سے آپ مکمل لکھنوی تہذیب کا نمونہ تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسرار الحق قریشی، ڈاکٹر محمد انور اور کمال اختر نے بھی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیے۔

پریس ریلیز، جاوید صدیقی لکھنؤ، 12 ستمبر 2014

جگر کا 54واں یومِ وصال

مرادآباد: اپنی شاعری کا دنیا بھر میں لوہا منوانے والے مشہور ومعروف شاعر جگر مرادآبادی کو ان کے 54 یومِ وصال پر خراجِ عقیدت پیش کی گئی۔ جگر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام نگر نگم میں منعقدہ سیمینار میں جگر مرادآبادی کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔ ساتھ ہی مرکزی وصوبائی سرکار سے مرادآباد میں جگر کے نام سے ایک آڈیٹوریم بنائے جانے، ان کے نام سے مرادآباد، ممبئی کے درمیان ریل چلائے جانے ان کی تصویر کا ڈاک ٹکٹ جاری کرائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت مشہور شاعر منصور عثمانی نے کی و نظامت کے فرائض محمد عارف حسین انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے مہیش تیواری نے کہا کہ حضرت جگر نے غزل کو نئی بلندیاں عطا کیں، ان کی شاعری کا مرکز حسن وعشق رہا۔ اس پروگرام میں صوفی عظیم عرشی، اسعد مولائی، شکیل احمد خاں، ضیا ضمیر، سید محمد ہاشم، ڈاکٹر عزیز الحسن، تنویر عثمانی، فرحان راشد وغیرہ خاص طور سے موجود رہے۔ پروگرام میں سید یوسف علی کا خاص تعاون رہا۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 ستمبر 2014

خونی دروازہ (دہلی) پر یومِ شہادت کا اہتمام

نئی دھلی: تحریک مزاحمت (ریزسٹینس موومنٹ) نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے تین جاں باز شہزادوں مرزا مغل، شہزادہ مرزا سلطان اور شہزادہ مرزا ابوابکر کی یوم شہادت 1857 کو یاد کرتے ہوئے ان کی قتل گاہ خونی دروازہ (دہلی) پر یومِ شہادت منا کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، اس موقعے پر تحریک مزاحمت کے کنوینر ڈاکٹر سید مسعود علی نے کہا کہ آج کے دن آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے تین شہزادوں کو ظالم انگریزوں کے ایک فوجی جنرل ہڈسن نے اسی دروازے پر قتل کر کے شہید کردیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہندوستان کی آزادی کے لیے دی گئی قربانیوں کو اور تاریخی واقعات کو فراموش کیا جارہا ہے، جو افسوس ناک ہے۔ انھوں نے مرکزی حکومت اور دہلی سرکار سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ 22 ستمبر 1857 کے دی گئی اس عظیم قربانی کو یوم شہادت کے طور پر منایا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 ستمبر 2014

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)
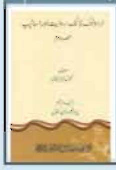
مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد
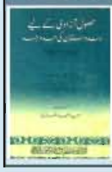
مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

جسم و جاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

جسم بے جان

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 198
قیمت: -/90 روپے

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)
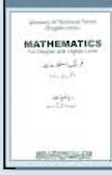
ادارہ
صفحات: 411
قیمت: -/120 روپے

میر تقی میر

مصنف: نثار احمد فاروقی
صفحات: 191
قیمت: -/43 روپے

زبان اور قواعد

مصنف: رشید حسن خاں
صفحات: 496
قیمت: -/166 روپے

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)

ادارہ
صفحات: 210
قیمت: -/69 روپے

صحیفۂ خوشنویساں

مصنف: مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی
صفحات: 290
قیمت: 141 روپے

سائنس کی باتیں

مصنف: اندر جیت لال
صفحات: 111
قیمت: 25 روپے

بے زبان ساتھی
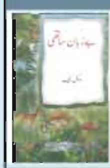
مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 64
قیمت: -/19 روپے

گلستاں کی کہانیاں

مصنف: امیر حسن نورانی
صفحات: 68
قیمت: -/20 روپے

اقتصادیات برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی
صفحات: 142
قیمت: -/70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in